

2012

www.paksociety.com

مئی

بہنوں کا ایک سماج

شعاع

پاک سوسائٹی

ڈاکٹ کام

www.paksociety.com

www.Paksociety.com



www.Paksociety.com
011-72632298
011-72632298

زیر نگرانی
کتاب کی قیمت
600
5000
6000

مستقل سلسلے

268	خالہ جیلانی	کھٹا کسی پتہ	270	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پکوان	260	سارہ غلام نبی	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	281	تبصیر نشاط	ایٹنیہ خاتون
			264	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لائے
			286	امت الصبور	تاریخ کے جھروکے
			277	آمنہ زین	سیر و جہاں

مئی 2012
جلد 26
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلوئین حسن پر تنگ پرس سے چھپوا کر شائع کیا - مقابلاً 20/3/2012ء
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: ahuaamonthly@yahoo.com, info@khawateandigest.com

ناولٹ

118	سونیا لوید	سچی ریزہ وفا
214	ام مسیم	وہ مختلہ ہے

افسانے

60	آمنہ مفتی	مسافر
66	صباحت یمن	تھیل تماشیا
108	سینہ زابد	تلافی
234	بشری احمد	کھی سی ہے
245	غزالہ خالد	از خود لوس
156	ایلیا یقین	بلا عنوان

نقصین غزلین

259	جمال احسانی	غزل
258	سعود عثمانی	غزل
259	عینی زاسید	نظم
258	رشید اثر	غزل

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	روحی کنجاہی	حمد
11	حفیظ تائب	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں

بیاد محمود ریاض

18	نازیہ کنول	اپنا کھو گیا کوئی
----	------------	-------------------

انٹرویو

27	کاشف خان	بندھن
32	شامین رشید	دستک
22	سائرہ رضا	شادی

ناول

34	عالیہ بخاری	دلوار شرب
160	آمنہ ریاض	سارہ شام

مکمل ناول

174	نمرہ احمد	جنت کے تپتے
78	سائرہ رضا	تیسری محبت

انتباہ: ماہنامہ شعاع اور مجسم کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کاپی نہیں لہائی۔
ناول: سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ ڈرامائی شکل میں۔ اور اس کے
طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جائے گی۔

شعاع کا مٹی کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کا دھارا بہتا جا رہا ہے۔ ایک موسم کی رشتہ دوسرے موسم کی آمد آمد ہے۔ بدلے موسم وقت کے تغیر و تبدل کا استعارہ ہیں۔ فانی دنیا میں کسی شے کو بھی دو مقام حاصل نہیں۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اس کا واپس جانا مقدر ہے۔ ایک ایسی اہل حقیقت جو کسی کے بھی چاہنے سے نہیں بدلی سکتی۔ دنیا کے کام اسی طرح چلتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ ایسی زندگی گزار کر جاتے ہیں کہ ان کی مٹی کو ایک زمانہ محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے تاریک مٹی کا مہیہ آج سے نو ذہن میں برقرار رکھا ہے۔ یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو بھی جائیں تو ان کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔ محمود ریاض بظاہر ایک شخصیت لیکن درحقیقت ایک ادارہ تھے۔

خواتین ڈائجسٹ کا اجراء کرتے ہوئے ان کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا۔ ایک ایسے پرچے کا اجراء جو خواتین کو علم آگاہی اور شعور دینے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے صاف ستھری تفریح کا ذریعہ بھی ہو۔ وہ ساری زندگی اسی مقصد پر کاربند رہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے بعد کرن اور شعاع کا اجراء اسی سلسلے کی ایک کردی تھی مگر بے شمار قارئین اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی ذہنی تربیت میں ان پر حوصلہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انسان فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کے اعمال، ان کے کئے کام باقی رہتے ہیں۔ محمود ریاض صاحب نے جو چراغ روشن کیے ہیں، ان کی روشنی سے ایک جہاں منور ہے۔ ان کے لگائے ہوئے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ جولا کھول لوگوں کو سایہ ہٹا کر رہے ہیں۔

10 مئی کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دُعاؤں مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

ایک نئی سندریلا

فائزہ افتخار کا شمار قارئین کی پسندیدہ ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ زندگی کی تلخ اور تنگ حقیقتیں ہوں یا مزاح کی شگفتہ بیانیات، فائزہ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، پورا انصاف کیا۔ انتہائی حساس قلم کار جن کے ہاں زندگی کا ہر رنگ پوری دلکشی اور خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ سنجیدہ موضوعات پر لکھتی ہیں تو بڑھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں پڑھیں تو ہنسی دینے لگتی ہیں۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی جو انہیں دیگر مصنفین سے منفرد کرتی ہے، اسے سادگی، سادگی اور سادگی کے ساتھ موضوعات کا تون ہے۔ اس بار فائزہ نے ایک مختلف اور منفرد موضوع پر لکھا ہے۔ ان کا ناول ایک نئی سندریلا موصول ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ جون کے شمارے میں شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

غزہ احمد کا ناول - جنت کے پتے ، سائرہ رضا کا ناول - تیسری محبت ، سونیا نوید کے ناول - جدید وفا کی آخری قسط ، آرم مریم کا ناول - وہ محبت ہے ، آمنہ مفتی، مصباحت یاسین، بشری احمد، عز الدخالد، منیرہ زاہر حسین اور ایلینا یقین کے افسانے ، عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول ، فائق خان اور ثانیہ فائق خان کا بہت صدمہ ، معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ - دستک ، پیارے نبی کی پیاری باتیں - احادیث نبوی کا سلسلہ ، خطا آپ کے، شادی مبارک ہو اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیا لگا، اپنی رائے سے نوازے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

ہر اک امکان کا عنوان ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو
بڑے تخلیق سماں ہیں تیرے رنگ اور تری خوشبو

ہر اک صورت سے ظاہر ہو رہی ہیں صورتیں کیا کیا
عجب صورت پریشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

کہاں ہے راز ہر اک آنکھ روشن کیسے ہوتی ہے
بہر سو نور افشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

مسلسل پھوٹی رہتی ہیں شاخیں زندگانی کی
فروع باغ امکان ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

وگرنہ کچھ ثبوت اپنے بھی ہونے کا نہیں ملتا
جو اصل ایماں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

زمین و آسماں میں ہے ہر اک حسن موسیقی
ازل سے زمزمہ خواں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

روحی کنجاہی

نعت حضرت مری پہچان ہے سبحان اللہ
یہی دنیا، یہی ایمان ہے سبحان اللہ

جس سے پہلے کسی تخلیق کا عنوان بھی نہ تھا
وہ مرے شعر کا عنوان ہے سبحان اللہ

میں گناہ گار نہ ملا کار مگر اُن کی یاد
مہرباں مجھ پہ ہر آن ہے سبحان اللہ

جس پہ مرکوز ہیں سب نکتہ وروں کی نظریں
ایک اُمّی کا دبستان ہے سبحان اللہ

جو بنو سعد کے ریلوڈ کا محاذ تھا کبھی
وہ دو عالم کا نگہبان ہے سبحان اللہ

جو چٹائی پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھا ہے
دین و دنیا کا وہ سلطان ہے سبحان اللہ

یاد ہے بات مجھے حضرت صدیقہ کی
آپ کا خلق بھی قرآن ہے سبحان اللہ

حفظ قاتب

توبہ

حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا اس نے ننانوے قتل کیے۔ پھر اس نے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم کے بارے میں لوگوں سے پوچھا تو اسے ایک راہب (پادری) کا پتا بتلایا گیا۔ اس نے اس سے جا کر پوچھا: ”میں نے ننانوے قتل کیے ہیں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟“

اس نے کہا: ”نہیں۔“ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر کے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس نے پھر پوچھا کہ ”مجھے سب سے بڑا عالم بتاؤ۔“ اسے ایک عالم کی نشان دہی کی گئی۔ اس نے اس سے جا کر پوچھا کہ اس نے سو آدمی قتل کیے ہیں کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

اس عالم نے کہا: ”ہاں کون ہے جو اس کے اور اس کی توبہ کے درمیان حائل ہو؟ جا فلاں زمین (علاقے) میں چلا جا! بلاشبہ وہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تو بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کر اور اپنی زمین کی طرف واپس نہ آنا یہ برائی کی زمین ہے۔“

چنانچہ اس نے نیکیوں کی اس بستی کی طرف سفر شروع کر دیا ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آگئی۔ (اس کی روح کو لینے کے لیے) رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے (دونوں ہی) آگئے اور ان کے مابین جھگڑا شروع ہو گیا۔

ملانکہ رحمت نے کہا: ”وہ تائب ہو کر اور دل کی پوری توجہ اللہ طرف کر کے آ رہا تھا۔“

عذاب کے فرشتے بولے: ”اس نے کبھی بھلائی کا کام نہیں کیا۔“

(اس لیے وہ عذاب کا مستحق ہے) ان فرشتوں کے مابین یہ جھگڑا جاری ہی تھا۔

کہ ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں آیا اسے انہوں نے اپنا حکم بتلایا۔ اس نے فیصلہ دیا۔

”دونوں زمینوں کے مابین مسافت کو ناپو۔ (یعنی جس علاقے سے وہ آیا تھا وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ

اور یہاں سے نیکیوں کے علاقے کا فاصلہ) دونوں کی پیمائش کرو۔) ان دونوں میں سے وہ جس کے قریب ہو وہی اس کا حکم ہو گا۔“

چنانچہ انہوں نے پیمائش کی تو انہوں نے اس زمین کو زیادہ قریب پایا جس کی طرف وہ ارادہ کیے جا رہا تھا

چنانچہ اسے رحمت کے فرشتوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔“

صحیح (مسلم) کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے

”پیمائش میں وہ نیکیوں کی بستی کی طرف ایک باشت زیادہ قریب نکلا چنانچہ اسے اس بستی کے نیک

لوگوں میں سے کر دیا گیا۔“

نیز صحیح (بخاری) کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔

”اللہ نے اس زمین کو (جہاں سے وہ آ رہا تھا) حکم دیا کہ تو دور ہو جا۔ اور ارض صالحین کو (جس کی طرف

جا رہا تھا) حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔ اور فرمایا۔ ان دونوں کے مابین فاصلہ ناپو۔ جب انہوں نے پتا تو ارض

صالحین کی طرف اسے ایک باشت زیادہ قریب پایا۔ چنانچہ اسے بخش دیا گیا۔“

اور ایک روایت میں ہے: ”وہ اپنے سینے کے سہارے (بطور کراست) سر کر پہلی زمین سے دور

ہو کر (تھوڑا سا) دوسری طرف ہو گیا۔“

فوائد و مسائل

1- اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار ترین شخص کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کی توبہ قبول فرماتا ہے بشرطیکہ توبہ خالص ہو۔

2- علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسئلہ بتلاتے وقت مسائل کی انصاف اور اس کی مشکلات کو سامنے رکھیں اور ایسی حکمت عملی اختیار کریں جس سے نہ تو اللہ کے عفو میں تبدیلی آئے اور نہ مسائل اللہ کی رحمت سے

مالوس ہو کر گناہوں پر مزید دلیر ہو۔

3- نیک لوگوں کے ساتھ رہنا بہتر اور بدوں کے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔

4- بوقت ضرورت فرشتے اللہ کے حکم سے انسانی صورت میں آتے ہیں۔

5- کسی آدمی کے جتنی یا جنسی ہونے کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس لیے کسی مسلمان پر جنسی یا جنسی ہونے کا حکم نہیں لگانا چاہیے البتہ اپنے خیالات کا اظہار ظاہر کے مطابق کرنا چاہیے۔

6- ماحول کی تبدیلی عادات بدلنے میں ممدو معاون ثابت ہوتی ہے۔ بسا اوقات ماحول اور محفل تبدیل نہ ہو تو انسان توبہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور دوبارہ گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اس لیے توبہ کرنے کے بعد صحبت بھی تبدیل کرنی چاہیے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان الخدریؓ ان کی کنیت ابو سعید سے اور یہ اپنی کنیت ہی سے معروف ہیں۔ خزرج کے ایک چھوٹے قبیلے خدرہ کی طرف نسبت کی وجہ سے خدری کہلائے مشہور اور فضلاء صحابہ کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں

12 غزوات میں حصہ لیا۔ کثیر الروایہ ہیں۔ ان سے صحابہ کرام جن میں جابر زید بن ثابت ابن عباس انس ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں نے روایت کی ہے۔

مدینہ منورہ میں 64 ہجری کو فوت ہوئے جبکہ صاحب اسد الغابہ نے ان کا سن وفات 74 ہجری لکھا ہے۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ کتب احادیث میں ان سے 1170 احادیث مروی ہیں۔

توبہ حضرت ابو نجید (نون) پر پیش اور جیم پر زبر) عمران بن حصین خزاعی سے روایت ہے کہ جہنم پہلے کی ایک ممرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ اس کا پتا پتا سے مانا۔ اس نے (اگر) کہا۔

”اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے حد والے گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر حد قائم فرمادیتے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ولی (وارث) قریبی رشتے دار کو بلایا اور فرمایا۔

”اس کو اچھے طریقے سے اپنے پاس رکھو اور جب یہ بچہ جن لے تو اس کے بعد اس کو لے آنا۔“

”چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اللہ کے پیغمبر نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اس کے کپڑے اس پر مضبوطی سے باندھ دیے گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اسے رجم کر دیا گیا پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔“

”اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس بدکاری کرنے والی عورت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ پڑھتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”عمرو! تمہیں نہیں معلوم اس عورت نے ایسی (خالص) توبہ کی ہے کہ اگر اسے اہل مدینہ کے ستر آدمیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان کو کافی ہو جائے۔“

کیا اس سے بھی افضل کوئی بات ہے کہ اللہ عزوجل کی رضا کے لیے اس نے اپنی جان تک قربان کر دی؟

مال و دولت

حضرت ابن عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر انسان کے پاس ایک داوی سونے کی ہو تو وہ (اس پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ) چاہے گا کہ اس کے پاس دو داویاں ہوں اس کا منہ تو (قبر کی) مٹی ہی بھرے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر رجوع فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے (یعنی توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرماتا ہے)۔“

فوائد و مسائل

1- اس میں انسان کی حرص اور مال سے اس کی شدید محبت کا ذکر ہے جس سے صرف وہی بچ سکتا ہے جو ایمان میں کامل ہو۔
2- دنیا کی رنگینیاں نہایت برفریب ہیں اور انسان کی تمنائیں زندگی کی حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ انسان کے پاس مال و زر کتنا بھی زیادہ ہو اس کی حرص بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور طلب کثرت کی یہ بیماری انسان کو حیات جاودانی سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو انسان اس فتنے سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔ جب دنیا کی ہوس شدید ہو جائے تو انسان غیر دانستہ طور پر بھی اللہ کی نافرمانی کر بیٹھتا ہے اس لیے اللہ کی طرف رجوع اور توبہ کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔
دنیا کے تمام فسادات کی بنیاد پیٹ اور شرمگاہ ہے انسان کا پیٹ دنیا میں بھرنامشکل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ”آوی کے پیٹ سے بڑا کوئی برتن نہیں بھرتا۔ آوی کو تو چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر سیدھی رہے۔ اور اگر لالچال زیادہ کھانا ہی چاہے تو ایک تہائی کھانے کے لیے ایک تہائی پیئے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے (رکھ لے)۔“

توبہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے وہ دونوں جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ قتل ہونے والا اللہ کے راستے میں لڑتا لڑتا قتل (شہید) کیا جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کافر قاتل کو بھی توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور وہ مسلمان ہو کر اللہ کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے۔“

فوائد و مسائل

1- توبہ سے بڑے سے بڑا گناہ اور قبول اسلام سے سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔
2- ہنستا بھی اللہ کی صفت ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے گو اس کی کیفیت سے ہم آگاہ ہیں نہ آگاہ ہو سکتے ہیں۔

کسی کو امان دے کر قتل کرنے والے کا بیان

حضرت رفاعہ بن شداد ثقفیؓ رحمۃ اللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا:

”اگر میں نے حضرت عمرو بن حق خزاعی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نہ سنی ہوتی تو مختار ثقفی کے سر اور دھڑ کے درمیان چلتا (اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیتا) میں نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص سے کوئی اپنا خون محفوظ سمجھتا ہو اور وہ اسے قتل کر ڈالے تو قیامت کے دن وہ (قاتل) عہد شکنی کا جعذ اٹھائے ہوئے ہوگا۔“

فوائد و مسائل

1- کسی کو امان دے کر قتل کر دینا بہت بڑا گناہ ہے۔
2- عہد شکنی اتنا بڑا جرم ہے کہ قیامت کے دن ایسے مجرم کے جسم پر جعذ انصب ہوگا جس سے ہر

شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں شخص عہد شکن ہے۔ اس طرح اس کی سخت بدنامی ہوگی۔

3- مختار بن عبید ثقفی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے انتقام کا نعرو بلند کیا اور اس طرح عوام کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے انتقام لینے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے عوام کی محبت اور ہمدردی حاصل ہو گئی ہے تو نبوت کا دعوا کر دیا اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر کے اس فتنے کا خاتمہ کیا۔

حضرت رفاعہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا:

”میں مختار ثقفی کے پاس اس کے محل میں گیا۔ اس نے کہا: ”جبرائیل (علیہ السلام) ابھی ابھی میرے پاس آئے کہ گئے ہیں۔“

میں صرف اس لیے اسے قتل نہ کر سکا کہ میں نے حضرت سلیمان بن صرور رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب کوئی شخص تجھ سے اپنے خون کے بارے میں مطمئن ہو (اسے یقین ہو کہ اس کے ہاتھ سے میری جان محفوظ ہے) تو اسے قتل نہ کر۔“ اسی (فرمان) نے مجھے اس (کو قتل کرنے) سے روک دیا۔

قاتل کو معاف کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک شخص نے قتل کر دیا۔ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مقتول کے وارث کے سپرد کر دیا۔ قاتل نے کہا:

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قسم ہے اللہ کی میرا سے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے وارث سے فرمایا:

”مسنو! اگر وہ سچا ہوا پھر بھی تمہارے قتل کر دیا تو تم جہنم میں جاؤ گے۔“

اس نے اسے آڑ لو کر دیا۔ راوی نے بیان کیا اس کے بازو چڑے کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ (اس کے چھوڑ دینے پر) وہ رسی کھینچتا ہوا نکلا (اس لیے) اسے زون سعد (کے والد) کہا جانے لگا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

”ایک شخص اپنے والدی (قریبی رشتہ دار) کے قاتل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”معاف کر دو۔“ اس نے انکار کر دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”خون بہا لے لو۔“ اس نے انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جاؤ! اسے قتل کر دو تم بھی اس جیسے ہو۔“

ایک آدمی اس کے پیچھے جا کر اسے ملا اور اسے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”اسے قتل کر دو تم بھی اس جیسے ہو۔“ اس نے (خوفاً) اسے چھوڑ دیا۔

راوی کہتے ہیں نہ کھا گیا کہ وہ شخص تسمہ (چڑے کی رسی) کھینچتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ (راوی کے اس لفظ سے) معلوم ہوتا ہے کہ مقتول کے وارث نے اسے باندھا ہوا تھا۔

حضرت عبدالرحمن بن قاسم رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں اسے قتل کر دو تم بھی اس جیسا

مشورے کو تسلیم کرے۔

معاف کرنا افضل ہے

حضرت ابو ورواء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
انہوں نے فرمایا۔ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔
”جس کو جسم میں کوئی تکلیف پہنچے، پھر وہ اس
(تکلیف پہنچانے والے) کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ
اس کی وجہ سے اس کا ورجہ بلند کرتا ہے اور اس کا گناہ
معاف کر دیتا ہے۔“

مشروب کا بیان

مشروب پینے سے پہلے بسم اللہ اور پینے کے بعد
الحمد للہ پڑھنا چاہیے۔
جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا، ان کا دودھ
پینا بھی حرام ہے۔
ایسا جو س یا نمید جس میں نشے کے اثرات پیدا
ہو چکے ہوں، پینا حرام ہے۔
مشروب کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے، البتہ بوقت
ضرورت کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔ مثلاً ”بیٹھنے کی
مناسب جگہ نہ ہو یا بارش وغیرہ کی وجہ سے لیکن بیٹھ کر
مشروب پینا افضل ہے۔
مشروب کو تین سانسوں میں پینا سنت ہے۔ سانس
لینے کے لیے برتن کو منہ سے ہٹا لیتا چاہیے۔
اگر مشروب میں کوئی تنکا وغیرہ نظر آئے تو پھونک
مارنا منع ہے، البتہ مشروب بہا کر اسے نکالا جاسکتا ہے۔
اگر پینے والے کچھ افراد ہوں تو دائیں جانب سے
شروع کرنا چاہیے۔
مشروب پلانے والا خود سب سے آخر میں پے۔
ہمیشہ دائیں ہاتھ سے مشروب پینا چاہیے کیونکہ
بائیں ہاتھ سے شیطان پیتا ہے۔

فوائد و مسائل :

- 1- مقتول کے وارث کو حق حاصل ہے کہ قاتل
سے قصاص لے یا معاف کر دے۔
- 2- قتل خطا کی صورت میں قصاص لینا درست
نہیں، پستلی جاسکتی ہے یا معاف کیا جاسکتا ہے۔
- 3- قتل خطا کی صورت میں قصاص لینا خود قتل
کرنے کے برابر گناہ ہے۔
- 4- مقتول کے وارث نے پہلے یہ لفظ نہیں سنا تھا ”تو
بھی اسی کی طرح ہے“ اس لیے وہ قصاص کی نیت سے
لے کر چلا۔ جب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم
ہوا تو فوراً ”چھوڑ دیا۔“
- 5- نسعتہ سے مراد چڑے کا پتلا اور لمبا ٹکڑا ہے جو
رسی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں اسے
تسمہ بھی کہتے ہیں۔
- 6- حضرت عبدالرحمن بن قاسم رحمۃ اللہ کے
فرمان کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے قاتل کا عذر تسلیم کر لیا تھا، اس لیے قصاص کے
طور پر قتل کرنے سے منع فرمایا۔ ہم ظاہر و عمل کے
مسکلف ہیں۔ اگر ایسے قرائن و دلائل موجود نہ ہوں
مگر اس کا قتل خطا ثابت ہو تو محض مجرم کے کہنے
سے قتل خطا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

قصاص معاف کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے، انہوں نے فرمایا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے جب بھی کوئی ایسا مقدمہ پیش کیا گیا جس
میں قصاص ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
معاف کرنے کا حکم دیا۔“

فوائد و مسائل :

- 1- قصاص لینا جائز ہے، لیکن معاف کرنا افضل
ہے۔
- 2- حاکم فریقین کو معافی یا صلح کا مشورہ دے سکتا ہے
لیکن متعلقہ فریق کے لیے ضروری نہیں کہ اس



رتج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے
کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے



اس کے باوجود ان کی رحلت پر میری آنکھیں برس رہی تھیں۔ اس وقت بھی مجھے اپنی ذات ریاض صاحب کی فیملی سے جڑی محسوس ہوئی تھی۔
دل میں دھڑکن کا احساس بن کر دھڑکتے باہر بھیا کو کھودینے کے بعد دوبارہ سے سلجھے ہوئے خاور بھیا کی موت پر وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ ہر زخم صبر سے برداشت کرنے والی یہ عظیم شخصیت ایک باپ کی حیثیت سے اپنے دو پیارے بیٹوں کی جداگی پر اندر سے ختم ہو گئی۔ زندگی کے ہر دکھ، ہر مصیبت کا بہادری سے سامنا کرنے والے محمود ریاض صاحب زیست کے اس موڑ پر بالا تر ہار گئے۔

نہیں! بلکہ باہر بھیا اور خاور بھیا کی وفات کے المناک مددے کے بعد محض وہ ختم نہیں ہوئے ایک تاریخ ختم ہو گئی۔ ادب کی دنیا کا ایک روشن باب، ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ نہ زمین پہ بھونچال آیا، نہ آسمان کا

کبھی میری سماعتوں کی نہنت ہی نہیں بن سکی تھی۔ جنہیں میں نے قریب سے دیکھا اور جانا ہی نہیں تھا۔ بھلا اس عظیم شخصیت کے لیے کچھ بھی لکھنا اتنا آسان کہاں تھا؟

مگر زندگی میں ہم ہمیشہ ان ہی لوگوں کے لیے تو نہیں روتے کہ جن سے صرف خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ کچھ رشتے دل سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا تعلق ہوتا ہے۔ کچھ خوشیوں کی شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن سے خون کا یا تعلق کا کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو، دل ان کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور ان کے دکھ پر خون کے آنسو روتا ہے یہی دل کا رشتہ ہوتا ہے۔

نہیں بھیا کے بعد خاور بھیا کی رحلت میرا دل درد سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں تو ان سے بھی نہیں ملی تھی۔ انہیں بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ بس فون پر ایک دوبارہ بڑی شائستہ سی گفتگو ہوئی تھی مگر

اپنا کھو گیا کوئی

نازیہ کنول نازی

کبھی دل شدت سے بھل کر یہ ضد کر بیٹھتا ہے۔
”میں آواز دو“ انہیں واپس بلاؤ“ انہیں کہو کہ ان کے بغیر ہمارا زندگی میں دل نہیں لگ رہا۔“

مگر شہر خوشیاں میں جانے والوں نے بھلا کب پیچھے پلٹ کر دیکھا ہے؟ کب بلکتی صداؤں پر کان دھرے ہیں؟ خوشیوں کی مانند فضاؤں میں بکھر جانے والے لوگ بھلا کب لوٹ کر واپس آیا کرتے ہیں؟ آنکھیں برستی

رہ جاتی ہیں، احساسات بھلتے رہ جاتے ہیں، دل تڑپتا رہ جاتا ہے، مگر جانے والے واپس پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ ایسی ہی شخصیات کے لیے شاید یہ کہا جاتا ہے کہ۔

بس اٹھ کے چل دیے چپ چاپ کچھ کمانہ سنا کوئی طریقہ ہے یہ اس طرح چھڑتے ہیں میں نے ریاض صاحب کے لیے کچھ لکھنے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر جب لکھنے بیٹھی تو بے اختیار میرا ذہن مختلف سوچوں کے گھیراؤ میں آ گیا۔ ریاض صاحب جیسی ”معد ساز شخصیت“ کے لیے کچھ بھی لکھنا مجھے بہت دشوار لگا۔ بھلا مجھ جیسی ادنیٰ راسخ کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس قابل کہاں کہ میں پیکر محبت و شفقت، ہمت و حوصلے کی روشن مثال جناب ریاض صاحب کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ مگر پھر بھی میں نے کوشش کی۔ حوصلہ بنا اور بکھرتا رہا۔ جانے کیا کیا لکھتی رہی اور لکھ کر پھاڑتی رہی۔

وہ پاری ہستی کہ جن سے کبھی میرا رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ ادب کی دنیا میں وارد ہونے کے فقط ایک سال بعد ہی جن کی وفات کی خبر پڑھ کر میں دلی طور پر از حد رنجور ہو گئی تھی۔ وہ جن کی یہ شفقت میٹھی آواز

کیوں خاک اوڑھ کے چپ چاپ سو گیا کوئی
دلوں پہ چوٹ لگی اپنا کھو گیا کوئی
جلتی سلکتی دہریوں کی سوغات لیے عسلی کا مہینہ پھر
سے پرانی یادوں کے رستے زخم تازہ کرنے آپہنچا ہے۔
سب ہی جانتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ہر صورت واپس لوٹنا ہے۔ زندگی کے اس پلیٹ فارم پر انسان کی مثال ایسے مسافر کی مانند ہے جو یہاں آتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے اور پھر اپنے نام کی پکار پر خاموشی سے اٹھ کر اپنے اعمال کا سالانہ سمیٹتے ہوئے موت کی چلتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے۔

اپنی باتیں اپنی یادیں پیچھے رہ جانے والوں کے لیے چھوڑ جانا ہے مگر خود پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ موت برحق ہے۔ نظام قدرت میں یہ ایک ایسی اعلیٰ حقیقت ہے کہ جسے چاہیں بھی تو جھٹلا نہیں سکتے۔ جان سے پیاروں کی رخصتی پر بلکتے ہوئے قدرت کے اس تکلیف دہ نظام کو بدلنا بھی چاہیں تو نہیں بدل سکتے۔ کوئی کتنا ہی عزیز ہو، ہستی مسکرائی زندگی کے لیے کتنا ہی ضروری ہو، ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے اس پاری، عزیز، ہستی کو خاک کے سپرد کرتے ہوئے صبر کے کڑے گھونٹ پینا ہی پڑتے ہیں۔

مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا، لیکن کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن سے پھر کر ہم سانس لیتے ہوئے بھی زندہ نہیں ہوتے۔ آنسو بہاتی آنکھوں میں ان ہستیوں کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ جیسے ٹھہر سا جاتا ہے۔ اندر کہیں ان کے نہ ہونے سے زندگی کا احساس ٹھکنے لگتا ہے۔ ان کے لیے کبھی

مئی 2012 کے شمارے کی ایک جھلک



خواتین اور روزانہ کیلئے اپنی طرف کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مئی 2012

کا شمارہ
شائع ہو گیا ہے

❖ ٹی وی فنکار ”نقی احمد“ سے باتیں،

❖ ٹی وی کی معروف فنکارہ ”تحریم زبیری“

سے ملاقات،

❖ کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

اور دیگر دلچسپیاں،

❖ ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“

فرحت اشتیاق کا مکمل ناول،

❖ ”اسی راستے پر“ رمضہ خالد خان کا مکمل ناول،

❖ نزہت شبانہ حیدر اور راحت جنیں کے ناول،

❖ فارحہ ارشد، عائشہ فیاض، احمل عزیز شہزاد اور

سعدیہ غزل کے افسانے،

خواتین ڈائجسٹ مئی 2012 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

شخصیت کے لیے ہمارا درد، ہمارے آنسو، ہمارے
تعریفی کلمات ایک طرف۔ مگر تاہم اگر ہم سب ہر روز
کچھ نہ کچھ بڑھ کر ان کی روح کے لیے نذرانہ خلوص
بھیجتے رہیں تو شاید ان کے ساتھ ہماری بے لوث محبتوں
کا تھوڑا سا حق ضرور ادا ہو جائے گا۔

جناب ریاض صاحب کے لیے اس وقت ذہن میں
ایک نظم گردش کر رہی ہے کہ۔

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں
وہ جدا ایسے موسموں میں ہوا

جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود

ایسا بے مثل آئینہ گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا

ایسا انمول، ہم سفر تھا وہ
اپنے دل میں سنبھل کر اس کو

اپنے ہاتھوں سے کھورے ہیں اسے
ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی

آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے
اس کو کس روشنی میں دفنائیں

اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں
وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں۔

اپنی تحریر کے اختتام پر مجھے بشری رحمان آپا کے چند
خوب صورت لفظ یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے شاید
ریاض انکل کی رحلت پر ہی لکھے تھے کہ۔ ”شہر
خوشاں میں جانے والے وہاں جا کر اتنے بے پروا
کیوں ہو جاتے ہیں۔ جا کر کوئی خیر خیریت کی خبر کیوں
نہیں بھیجتے۔ خوابوں میں آتے ہیں تو کھل کر بات کیوں
نہیں کرتے؟ سارے سلسلے مٹی کے ایک ڈھیر سے
کیوں وابستہ ہو جاتے ہیں؟“

ہماری دعا ہے کہ اللہ کی پاک دے نیاز ذات اخروی
زندگی میں ریاض صاحب کو راحتوں سے ہمکنار
کرے۔ جنت الفردوس میں آپ کے درجات بلند
کرے۔ (آمین)

جو ہمت و شجاع کا پیکر تھے، آخر کیوں ٹوٹ گئے وہ
ہم ان سے محبت کرتے تھے، کیوں ہم سے روٹھ گئے وہ

دل کلپا، وہ چپ چاپ شہر خوشاں میں جاسوئے۔
ریاض صاحب جیسی عظیم اور گراں قدر پیاری
شخصیت کے بارے میں اگر اختصار کے ساتھ کچھ کہا
جائے تو قلم اس کے سوا اور کیا لکھے کہ دنیائے ادب کے
آسمان پر ہزاروں روشن ستاروں کے مابین دیکھتے ہی
دیکھتے ایک روشن چاند ظلوع ہوا، جس نے اپنی روشنی
سے اس دنیا کو منور کیا اور ایک روز چپ چاپ جانے
کن بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

ریاض صاحب جیسی ناقابل فراموش شخصیت کی
وفات کے بعد صرف ان کے بچے ہی سلیہ پداری سے
محروم نہیں ہوئے، بلکہ ”چاند مگر گروپ آف
سلیکیشنز“ سے وابستہ وہ تمام مصنفین بھی اپنا
”حسن، تمکسار، مشفق دوست گنوا بیٹھیں کہ جن کے
قدرتی فن کو نکھار بخش کر دنیا کے سامنے لانے والی
پیاری ذات خود ریاض صاحب کی تھی۔

مٹی کی جلتی سلگتی دوپہروں نے کھن ایک بشر کو
نہیں، بلکہ ایک ایسی شخصیت کو ہم سے چھین لیا کہ
جن کے ہونے سے بہت سی زندگیوں کا بھرم قائم تھا۔
جو اپنی رائے کے لیے کبھی بھی ایک مدیر ثابت نہیں
ہوئے تھے، بلکہ ایک مشفق باپ، ایک حوصلہ بردھانے
والے بھائی ثابت ہوئے تھے۔

شاید ایسی ہی شخصیات کے لیے کہا جاتا ہے کہ
”جانے والے مجھے روئے گا زمانہ برسوں۔“

ادب کی دنیا میں جو خلا ان کے جانے سے پیدا ہوا، وہ
شاید اب کبھی نہ بھر سکے گا جو نقصان ان کی دوا کی جدائی
سے ان کے چاہنے والوں کو اٹھانا پڑا ہے۔ اس کی تلافی
شاید اب کبھی نہیں ہو سکے گی۔ شاید اب کبھی ادب کی
دنیا کو کوئی دوسرا محمود ریاض نصیب نہیں ہو گا۔ مٹی کا
مہینہ ہر سال یوں ہی آتا رہے گا۔ یوں ہی دلوں کے
زخم اوھر میں گئے۔ یوں ہی آنکھیں خون کے آنسو
لٹائی رہیں گی۔ ان کی عظیم شخصیت کے لیے یوں ہی ہر
سال مختلف قلم اپنی اپنی سوچ کے مطابق لفظ بکھیرتے
رہیں گے۔ مگر۔

ان کے اچانک دنیا سے چلے جانے پر ہونے والے
نقصان کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس پیاری



شادی مبارک ہو

محمد احمد رضا گھوگلان سلیمان سائبرہ رضا

شہلوار، سرپر کو خیا کی ٹوپی اور طالبان جیسی واڑھی۔ ایسے لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اندر بند کر کے مارتے ہیں۔ تنگ نظر قدامت پرست وغیرہ۔

ابھی حق رہ گئیں۔ ہم نے تسلی دی۔

”ارے! میرے بیٹے کا ایچ خراب ہو گیا ہے۔ اتنا نرم دل، روشن خیال پینٹ شرٹ پہن کر آفس جاتا ہے۔ نماز پڑھنے جائے گا تو ٹوپی بھی ہوگی اور شہلوار اوپن بھی۔ لمحہ عورت۔“

ابھی جے پیر کی ملی بن گئیں۔ ان کی چھٹی حس درست کہہ رہی تھی۔ آغاز اچھا نہیں ہوا تھا اور پھر

امی کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ انہیں پہلے پھیرے ہی میں لڑکی بے حد پسند آچکی تھی اور آج لڑکی کی اماں ان کے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف جوش و خروش دیدنی تھا۔ درمیان میں تباکی پر شام کی چائے جی تھی۔ بیٹا عصر کی نماز پڑھنے گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ انتظار کوفت میں بدلتا، موصوف حاضر ہو گئے۔ اماں سموسہ کھا رہی تھیں۔ ہاتھ جہاں کا تھیں وہ گیا اور جو منہ میں تھا، حلق میں پھنس گیا۔ بمشکل جھٹکے سے جیسے سنبھل کر سموسہ نگلا۔ ہاتھ والا واپس رکھ دیا اور رخصت کو تیار۔

اگلے روز ان کا جواب حاضر تھا۔ ٹخنوں سے اوپن

پورے تین سال لگ گئے ہمیں بھابھی کی تلاش میں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں ان کی اماں پہلے منع کر دیتیں۔ حد تو یہ واڑھی والے والد بزرگوار منہ نہ دیتے۔

”حمہ! میری اماں نے استرا پھیر لے۔ شادی کے بعد رکھ لیتا۔“ امی رو پڑیں۔

”توبہ استغفار کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”تو گول کی جوتیاں تھکتی ہیں، میرے پیر کھس گئے ہیں۔“ امی کا غصہ مزید برہما۔

”دیکھیے اگر واڑھی کی وجہ سے میرا رشتہ نہیں ہو رہا یا کبھی ہو گا نہیں، تو کوئی بات نہیں۔ اگر واڑھی رکاوٹ ہے تو میں ساری زندگی کنوارہ رہ لوں گا، مجھے منظور، مگر کنوارے کا حوالہ دلا استغفار۔“

احمد رضا قطبیت سے کہہ کر واک آؤٹ کر گئے۔ بڑے بھائی تیمور کلین شیو، گورے چٹے، ہری آنکھیں۔ (میری جیسی) اکثر ایسا ہوا۔ آنے والوں نے کہا۔

”وہ خود سرائے کا تھا اس سے کروادیں۔“

میں نے کہا۔ ”بھئی! بہنوں کو تو چھپا دینے کا سنا ہے، اب ہم تیمور کو چھپائیں گے۔“

ایسے ایسے قصے سنے کہ ان پر باقاعدہ ایک افسانہ لکھا جائے گا۔ (انتظار کریں)

اور پھر آزمائش ختم ہوئی۔ گناہ کے بھائی کامران، بہن مناز اور بعد میں والدین نے واڑھی دیکھنے کے بعد بھی احمد کو پسند کر لیا۔

ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہمارے معیار استبداد کے ہیں، ہمیں اس کا خوب تجربہ ہوا۔

دوسرے احمد کی واحد شرط ”پڑھی لکھی لڑکی“ بھی پوری ہو گئی۔ گناہ کی میسٹری میں ایم ایس سی ہے۔ احمد کو ماں (اسکول ٹیچر) اور بہنوں جیسی پڑھی لکھی لڑکی درکار تھی۔ (آہم)

بہر حال ایہ بیس فروری بروز جمعہ ہے۔ میں صبح چار بجے اٹھ کر بری کا ہکسہ بنا رہی ہوں۔ امی اپنا کمر ڈنٹ کر چکی ہیں۔ (دراصل امی کا اپنا کمر چھوٹا ہے اور

اسے ان شاء اللہ بنانے کا ارادہ ہے، سو ابھی نے چھ ماہ پہلے ہی شفٹنگ کر لی کہ بار بار کی اٹھاؤ سے ساز و سامان ٹوٹے گا۔)

ہمارے ماں بری دکھانے کا رواج نہیں اور کچھ امی نے آج سے کم از کم بیس برس پہلے عہد کیا تھا کہ وہ نہ دیکھیں گی نہ دکھائیں گی۔ (اس کی وجہ پر بھی افسانہ لکھا جائے گا۔)

مگر دوسری طرف بھابھی کے گھر والوں کا امر و تھا۔ جس پر امی بہت خفا تھیں۔ (امی! بخاناہ ہوں یونین میں جینز دکھایا جاتا ہے۔ دعوت دے کر بلاتے ہیں اور افریقہ میں ساری بری دکھاتے ہیں۔ خاندان کے مو زیور ہاتھوں میں تولتے ہیں۔)

امی کے نئے گھر کو کوئی نہیں جانتا اس لیے مہندی اپنے گھر سے لے کر جانی تھی۔ میں خالی مکان میں مہندی کے تھال سجا کر اپنی بیٹیوں کے ہمراہ اکیلی بیٹھی ہوں اور دل بہت خراب ہو رہا ہے، تا آنکہ میری دوست رانی اور شہناز گاڑی بھر کے آگئیں۔ ان کے بچے اور گلی محلے کی لڑکیاں۔ یکدم رونق ہو گئی۔

ہم سب گاڑی میں سوار ہوئے اور نئے گھر سے امی، حمیرا، بھائی و دیگر کو لے کر روانہ ہوئے۔ یہاں خوب رونق ہے۔ دو بہنوں کی شادی ہے اور شدید سردی بھی۔ ٹھنڈی بج ہو امیں نہ جلنے کہاں سے کھس آئیں۔ سب بازو بغلوں میں دیے سو سو می سی کر رہے ہیں۔

رانی کے بچے ابو بکر، ابوذر، ارجم سفید سوٹ پر پیلے دوپٹے، ماہا، رافہ، حرمت سبز و پیلے سوٹ، اقرا، آہکین، اعتاب، تزکی، سرخ و پیلے کپڑوں میں مہندی کے تھال اٹھائے بے حد پیارنے لگ رہے ہیں۔ سب سے بڑا تھال حمیرا کے ہاتھ میں ہے جو گلابی نیٹ کی لائنگ شرٹ اور ٹراؤزر میں اچھی مگر پریشان لگ رہی ہے۔ حرمت کو بخار اور موشن ہیں۔

میں نے آتش گلابی چیلے شہلوار قمیص پر پورسلک کانیوی بلودہٹا جس پر گلابی و سنہارا ریشم و تلے کا کام ہے، پہن رکھا ہے۔ مگر مگر میں بالکل اچھی نہیں لگ

رہی ایک دم بکواس آخر کیوں۔ ذرا سوچئے!۔
میں رانی کی مدد سے بری دکھا رہی ہوں۔ تب
میرے کانوں میں جملہ پڑا۔
”بہت تیز ہیں۔ کہانیاں لکھتی ہیں۔“ کوئی بتلاؤ
کہ ہم بتلائیں کیا؟ میری پیاری لکھاری بہنو! ہماری
ہیروئن تو ایک کی دس سنانے کے بعد آخر میں جو تا بھی
اتار لیا کرتی ہیں جبکہ ہم۔ ہم۔ آہ! حسرت ان
غنجوں پر۔

گلناز ہماری طرف کے پہلے ہرے بناری شرارے
پر لمبی قمیص کے ساتھ لمبا گھونگھٹ نکالے چلی آرہی
ہے۔ اس کا چہرہ چھپا ہوا ہے۔ مگر مجھے اس پر ٹوٹ کے
پیار آ رہا ہے۔ (میرے بھائی کی دلن ماشا اللہ) وہ کپکپا
رہی ہے۔ شرم سے سرودی سے یا پھولوں کے زیور
سے؟

ہماری رسم کے بعد چھوٹی بہن سمیرا کورس کے لیے
بلا لیا گیا۔ وہ خالہ زاد عمار سے بیاہی جا رہی ہے۔ کامران
بھائی اور عمران نے جب رسم کے بعد دونوں بہنوں کو
بازوؤں میں بھر کے ان کی پیشانی کے بوسے لیے تو ہر
آنکھ اشکیار ہو گئی۔ شدید سردی میں باری کی کیو کی خوشبو
مست تھی مگر گولا کباب میرے حلق میں گولے کی
طرح اٹک گیا۔ حمیرا کا لقمہ بنا تا ہاتھ رک گیا۔ احمد فون
پر چیخ رہا ہے۔

”تم لوگوں نے مجھے چابی نہیں دی۔ میں دروازے
پر بیٹھا ہوں۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔ سردی سے
مٹھ رہا ہوں اور میں نے صبح کا ناشتہ ہی کیا ہوا ہے۔“
(ہائے! میرا بھائی! میرا بھو کا بھائی بچ چچ۔)

گلناز کی امی نے حسب عادت احمد کے لیے کھانا
باندھ کر دیا۔ اب مجھے گھر جا کر اس کے ساتھ سکون
سے بیٹھ کر کھانا ہے مگر ترکی کا ہاتھ ہائیک کے
سانس پر لگ گیا چھالے بن گئے۔ اوپر سے اس کی
فریادیں۔

”مما! اس درد کو کھم (ختم) کرویں۔ ماما میلا ہاتھ
چھسی (صحیح) کرویں۔“
وہ ساری رات جسمانی طور پر ہم سب ذہنی طور پر

ترپتے رہے۔

21 فروری بروز ہفتہ

بیک تھا اور صبح صبح ماموں گل نواز، ممانی شگفتہ،
معزہ گل اور اشعر گل صادق آباد سے آگئے۔ وہ اگلے
دن متوقع تھے۔ معزہ آتے ہی خفا ہو کر رونے بیٹھ گئی۔
”میرے بغیر مہندی کر لی، ہونہ، ہونہ، ہونہ!“
بمشکل منایا۔

(احمد لڑکے کو اینٹ مہندی لگانے، دوپٹا پہن کر
بٹھانے کو انتہائی احتیاط سے مضحکہ خیز مروا گئی کی توہین
سمجھتے ہیں۔)

22 فروری بروز اتوار۔

میں نے پہلے کی جانے والی تیاریوں کے بعد بھی آج
کادان بازار کے چکر سے شروع ہوا۔ بے حد مصروفیت
اور ہڑونگ میں امی کے پرانے گھر آچکی ہوں اور یہ
بوجھ میرے کندھوں پر ہی ہے کہ مجھے بارات نکالنی
ہے۔ آج خالی گھر میں میرے ساتھ احمد ہے۔ وہ تیار
ہو کر عشاء کے لیے چلا گیا۔

تب مہمان آنا شروع ہوئے۔ امی، حمیرا، شمس
رضا، تیمور اور ماموں جان نئے گھر سے یہاں آگئے۔
ڈھول کی تھاپ امی کے چہرے پر رنگ بن کر چمک رہی
ہے۔ یہاں میں نے اور اشتیاق نے ہر چیز مکمل کر
رہی ہے۔

ماموں جان نے جب خود ہی آگے بڑھ کر احمد کو
میروں شیروانی پسنائی، بٹن بند کیے، پگڑیٹ کیا، ممانی
جان نے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر پیسے دارے تو
اس منظر کی خوب صورتی میرے فہم سے تحریر نہیں
ہو سکے گی۔ امی کی، میری، حمیرا کی آنکھیں بھر آئیں۔
بارات نکلنے کو تیار اور شمس ناراض۔

”تم میرا دوپٹا نہیں لائیں، اب میں بھگڑا کیسے
ڈالوں۔“

”آپ میرا دوپٹا لے لیں۔ مگر اب میں آپ کو دوپٹا
لا کر نہیں دے سکتی۔“

حمیرا جل کر کہہ رہی ہے۔
وہ مہجنا اور اورنج کلر کے شیفون کرٹل سوٹ

میں بہت بچ رہی ہے اور ہاں! اجانسی غیورزی چنری
سوٹ اور جوڑی دار پاجامہ میں آج میں بھی بہت اچھی
لگ رہی ہوں۔

شمس کے ساتھ میں ڈبل رشتے کے مزے لوٹتی
ہوں اور وہ بھی۔ میرا بھائی وہ رشتے میں اور عمر میں مجھ
سے چھوٹا ہے۔ پیارے چچا کا پیارا بیٹا اور پیاری بہن
کاشوہر۔

”میں لاتی ہوں دوپٹا۔“ ہائیک پر اسی کے ساتھ
اپنے گھر آئی اور گولڈن دوپٹا برآمد کیا جسے بعد میں شمس
نے دونوں پلو ہاتھوں میں پکڑے ایک ٹانگ اٹھا کر
بھگڑا کرتے ہوئے اپنے اندر کے فنکار کو باہر نکال دیا۔
حرمات! اب کے پیروں میں لڑھک رہی ہے۔ (میرے پیپا
کو یہ ہو کیا گیا ہے) بعد میں وہ ماں کو دیکھ کر حیران رہ
گئی جسے بمشکل ہاتھ پکڑ پکڑ کر منت ترلے اور ڈرا
دھمکا کر سیٹ پر نکایا۔

”بیچھے مرد بیٹھے ہیں، شرم کر۔“ مگر وہ باز آتے آتے
بھی کام ہو گھاگئی۔

معزہ سس سوٹ میں نو دمیدہ گلاب لگ رہی ہے۔
”وہ تو آپ منع کر رہی ہیں ورنہ میرے اندر کافی کار۔“
اف! ہاتھ پیر اس نے بھی چلا لیے تھے۔

”ہم بس میں لگنے لگتے گئے، چاچو نسیم فاروق“

عرشہ سید کے باہر موجود ہیں۔ شکریہ الہی اور حضری کو
دیکھ کر خوشی مکمل ہو گئی۔ آہٹھن اعصاب گرین فراک
اور ترکی اور بج میں بہت کیوٹ دکھ رہی ہیں۔ ہال پہنچ کر
ایک بار پھر ڈھول کی تھاپ پر بھگڑے کا سلسلہ شروع
ہو گیا۔ اس بار اشعر گل اور شمس رضا کی جوڑی ہے۔
احمد کے دوستوں نے تیمور کو بھی تھپیٹ کر خوب
نچوایا۔ یہاں قہقہے ہیں۔ خوشی ہے۔ رنگ ہے۔
خوشبو اور محبت۔ رستہ رو کے مہناز، جمائیر اور مہ
جبین کھڑی ہیں۔ نکاح کے بعد گلناز کو لایا گیا۔ وہ میروں
لہنگے میں بے حد پیاری لگ رہی ہے۔ (آپ تصویر دیکھ
ہی رہے ہیں۔)

احمد کے چہرے پر بے پناہ روپ ہے۔ ممانی جان
نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

ماہنامہ روشن

مئی 2012 کے شمارہ "ناولٹ فہر" کی ایک جھلک

"بیاد محمود ریاض"

اداکار "عروسہ صدیقی" سے شاہین رشیدی ملاقات

اداکار "نوروت گیلانی" کے پڑاوت کے ساتھ

"آواز کی دنیا سے" FM-98 کی آرٹ "بینظیر ناصر خان"

کی باتیں

"مجدد سے ملنے" "نفسیہ سعید" اپنے ہاٹ میں کیا کرتی ہیں

"کردل" خیلہ مرزا کا سلسلہ وار ناول

"دست کوڑہ گر" فوزیہ یاسین کا سلسلہ وار ناول

ساقی امین جہا کا طویل مکمل ناول

"وہی نور" علی نقوی کا مکمل ناول

نارایان فرخ بخاری، عمر ماجد، رفیق حبیب، نرگس بھڑواری، المجدد فیض، میراگل

اور امیرم کے دلچسپ ناولٹ

خدیجہ عظمیٰ، نظیر طاق، نادر زاق اور عائشہ باغی خان کے انساے اور

دلچسپ مشعل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ قرون کتاب

قرون کتاب "موسم گرما اور آب"

قرون کے شمارے کے ساتھ قرون کے قریب لکھتے ہیں۔



بندھن

فائق خان چیمہ ثانیہ فائق خان

کاشف خان

ادب و احترام کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اسی لیے مجھے اسی سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔
”شادی مبارک ہو۔ میری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے۔“
”جی، بہت شکریہ۔“
”کسے ہو۔ اور آج کل کیا ہو رہا ہے؟“
”بالکل ٹھیک ٹھاک اور آج کل کام ہو رہا ہے۔“
”مکس سگما کارپوریشن کر رہا ہوں ایوری ریڈی کا ایک شو کر رہا ہوں۔ لی وی ون پہ ڈرامہ سیریل ”کیلی“ چل رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ کافی کام ہو رہا ہے۔“
”صابن کے کمرشل میں آپ ڈاکٹر کے روپ میں آتے ہیں اس میں تو آپ سچ سچ ڈاکٹر لگتے ہیں۔“
”جی شکریہ اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں لائف

شادی ایک ایسا بندھن ہے جو دو اجنبیوں کو ایک کر دیتا ہے اور پھر دلوں میں ایسی محبت ڈال دیتا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا مشکل ہو جاتا ہے۔ محبتیں قائم رہیں وہ ہنسی ہم آہنگی ہو جائے تو پھر یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ شادی کو کامیاب بنانے یا ناکام بنانے میں ان ہی دونوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو اس بندھن میں بندھتے ہیں۔
آج آپ کی ملاقات ایک نئے جوڑے سے کروا رہے ہیں۔ فائق خان۔ جنہیں آپ نہ صرف اداروں میں دیکھتے ہیں بلکہ کمرشلز میں بھی دیکھتے ہیں۔ لائق نے وعدہ کیا تھا ہم سے کہ جب پرنٹ میڈیا کو الٹا دلوں کا تو پہلے آپ کو دیوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ فائق ہمارے میں کہنا چاہوں گی کہ یہ نوجوان بہت ہی

ہے۔
”ممائی جان نے سال بھر پہلے دونوں گھنٹوں کا آپریشن کر لیا ہے۔ سفر اور بے آرامی نے آج انہیں بخار میں مبتلا کر دیا۔ وہ پرائیڈل روم میں نیم دراز ہیں۔
ماموں جان معززہ اور اشعر پریشان ہیں۔ بہر حال سب کچھ بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچا۔ آپ سب سے نقطہ دعا کی استدعا ہے۔
خدا میری امی کو اولاد کی خوشیاں اور سکھ دکھائے۔
(آمین)

شادی میں میری ہڑونگ نے مسٹرین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ دوست رانی نے حالت دیکھی۔ پارو کو ایک پلیٹ دے کر بھیجا۔ اس میں چار مختلف کریمیں تھیں۔

”بیٹا! اس کا کیا کرتا ہے؟“

”ممانے کہا ہے، انہیں منہ پر مل لیں۔“

ہندی تک نہ لگائی۔ نیا پرس اپنے گھر میں بھول گئی اور ہاں! شکریہ ادا کروں گی اپنی دوستوں کا رانی شاکر، شہناز اکبر اور صائمہ جنہیں میں تریائیاں نکالیاں دے کر آئی تھی اور وہ خوشی خوشی سب گیا کرتی تھیں۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ بے حد تکان بھرے دنوں میں یہ میری ہمت تھیں۔

اور کیا آپ کو پتا لگ گیا کہ میں باپوں کے روزا چھی کیوں نہیں لگ رہی تھی؟ میرے کپڑوں میں چمک اور گر لیں کیوں نہیں تھی؟

اب دماغ پر زور نہ ڈالیں۔

وہ التاسلا ہوا تھا۔ (میں نے خود سیا تھا۔ مجھے خبر تھی۔ مگر سیدھا کرنے کا وقت کس کے پاس تھا۔ جانے دو۔) بابا۔ بابا۔ بابا۔



”یہ اندر کی خوب صورتی اور پاکیزگی ہے جو چہرے پر نور بن کر جھلک رہی ہے۔“
ای خاموش ہیں مگر خوش ہیں بے پناہ۔
”شادی شادی۔ لیس! ہو گئی احمد کی شادی۔“
اسٹیج پر دو وہ پلائی کا جھکڑا ہے پر میں امی کے ساتھ صوفے پر ٹنگ گئی ہوں۔ مشتاق ہیں ہیلو کے طور پر احمد کے ساتھ۔ سیر اور گناز بے حد پیاری لگ رہی ہیں۔ زیادہ کون؟ مشکل فیصلہ ہے۔
(شادی کی سب سے اہم چیز سادگی اور کوئی احتقانہ اور ہندوانہ رسموں کا نہ ہونا بھی رہا۔)

23 فروری بروز پیر۔

میں آج صرف آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میری ایسی قسمت کہاں۔ شمس کے تھری پیس کی شرٹ لانی ہے۔ میرے میچنگ بندے اور دلہن کو پار لے کر جانا ہے۔ حبیب بینک پر بنتا فلائی اور شام کا شدید ٹریفک جام۔ حل۔ حل؟

گناز موٹر سائیکل پر میاں کے ساتھ پار لے جائے گی۔ (ہیں! کیا ارے؟) میرج لان میں مہمان ہم سے پہلے موجود تھے۔ حیرا سرخ نیٹ کی قمیص کے ساتھ بناری چوڑی دار پا جامہ میں کھلا گلاب لگ رہی ہے، جان حفل۔ گو میچنگ جیولری پہننا بھول گئی ہے۔ مگر پھر بھی وہ سب پر بھاری ہے۔ حرمت کرے گرم سوٹ میں پانڈا لگ رہی ہے۔

میری بیٹیاں سیاہ گلابی اور نچ لائنگ میکسی میں خود کو سنڈریلا سمجھ رہی ہیں اور سب سے پیاری بھی۔ میں پتا نہیں کیسی لگ رہی ہوں۔ گلابی لائنگ شرٹ ٹراؤزر کام بنا ہوا، مگر تھکی ہوئی نڈھال۔ دفع کریں۔ میں نے ایک گھنٹہ شراب میں انک جانے والی گناز کی انگوٹھی کو ڈھونڈا ہے۔

احمد گناز کا ہاتھ پکڑ کے اسے اسٹیج پر لایا۔ گناز گلابی اور سی گرین شرارے میں گلابی گلاب کی کلیاں بالوں میں لگائے بے حد دلکش لگ رہی ہے۔ تھری پیس میں میرا بھائی تو ہے ہی پیارا۔ گناز کے گہروالوں خصوصاً اسی ابو کا اس سے ملنا ایک بے حد جذباتی لمحہ

ہوائے کابرائے اہم سید رہوں پاکستان میں۔
”کتنے مہینے ہو گئے ہیں شادی کو؟“

”30 دسمبر 2011ء کو ہمارا نکاح اور شام کو
مہندی کی رسم ہوئی اور 2 جنوری 2012ء کو رخصتی
ہوئی۔“

”ثانیہ آئندہ سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی
اور کوئی رشتہ داری ہے کیا؟“

”نہیں جی کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ غیروں میں

شادی ہوئی ہے اور میری پسند ہے گزشتہ سات سال
سے میں اسے جانتا تھا میں نے اسے پہلی بار عاطف
اسلم کے کنسرٹ میں دیکھا تھا۔ اور مزے کی بات یہ
کہ یہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں گرتی پڑتی آرہی تھی
اور میرے قریب آتے ہی دھڑام سے گری تو میں نے
سنبھال لیا۔ بس اس وقت پہلی نظر میں یہ مجھے اچھی
لگی اور میں نے سوچا کہ یہی میری شریک سفر ہونی
چاہیے۔“

”تو فلمی سین ہو گیا۔“

”بالکل جی! فلمی سین ہو گیا۔ انہوں نے ہم سے
آؤگراف لیا۔ ہم نے آؤگراف دیا اور ساتھ ہی ای
میل ایڈریس بھی دے دیا۔ بس پھر بات چیت کا
سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر میں
نے پروپوز کر دیا۔ دوسری طرف سے بھی اچھا رسالہ
ملا۔ اور مجھے ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ
ان کی فیملی بہت اچھی ہے۔“

”اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”ہم پٹھان کہلاتے ہیں۔ اندیسا سے ہمارا تعلق ہے
لیکن میں نے اور میری بہنوں نے کراچی پاکستان میں
جنم لیا۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ والدین کے علاوہ ایک
بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن ہے۔“

”دوستی تقریباً ساڑھے چھ سال رہی۔ ساتویں
سال میرا رشتہ بکا ہوا۔ مجھے بہت صبر کرنا پڑا اور اس کی
وجہ یہ تھی کہ ایک تو یہ عمر میں بہت چھوٹی تھی اور میں
بھی کوئی بہت بڑا نہیں تھا پھر میرا بھی آگے بڑھنے اور

جدوجہد کرنے کا پیرید تھا۔ ثانیہ نے مائیکرو بیاالوجی میں
ماسٹرز کرنا تھا اور مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اس کے ماسٹرز کرنے
تک کوئی بات نہیں ہوگی شادی بیاہ کی اور جب اس کا
ماسٹرز مکمل ہوا پھر ہم لوگ رشتہ لے کر گئے۔ فنکار کا
گھرانہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو رشتے کے وقت
تھوڑی بہت پر اہم تو ہوتی ہی ہے اور اس رشتے کے
لیے میرے والد اور ثانیہ کی والدہ نے اہم رول ادا کیا۔
بے شک بات چیت کے دوران (رشتے کے سلسلے) کوئی
پر اہم نہیں ہوئی۔ بس میرے سرے سوچنے میں
تھوڑا تاثر لیا۔ پھر میں نے اور میرے والد نے ان
کے گھر والوں کو کنوینس کیا اور ثانیہ کی والدہ کو معلوم تھا
کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں
نے اس رشتے کے لیے بہت سپورٹ کیا۔“

”اور پھر کب بات کی ہوئی؟“

”13 مارچ 2011ء کو بات کی ہوئی تھی ساتھ ہی
شادی کی تاریخ بھی فیکس ہو گئی میں تو شوٹ نہ گیا ہوا
تھا۔ میری غیر حاضری میں گھر والے ان کے گھر گئے اور
مٹھائی کھا کے آ گئے۔“

”دوستی کے دوران ملاقاتیں ہوتی تھیں؟“

”دوستی کے دوران ڈیٹ یہ جانے کا کوئی چکر نہیں
ہوا۔ جب ویسے بات ہو جاتی تھی تو اس چیز کی ہم نے
ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ جب بات کی ہو گئی
اور شادی کی شاپنگ شروع ہو گئی تب ہم ایک ساتھ
جاتے تھے شاپنگ کے لیے کیونکہ میری ای نے کہا کہ
ثانیہ کی پسند کی شاپنگ ہونی چاہیے۔“

”اتنے عرصے میں ایک دوسرے کے مزاجوں سے
بھی واقف ہو گئے ہو گے تو شادی کے بعد ویسا ہی پایا یا
کچھ چھینچ لگا؟“

”ایک دوسرے کے مزاجوں کے بارے میں بہت
اچھی طرح جان گئے تھے لیکن جب آپ سات سال
کسی کا انتظار کریں اور پھر اس سے شادی ہو جائے تو
ایک دفعہ تو یقین ہی نہیں آتا کہ شادی ہو گئی ہے۔ یہی
حال میرا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ لگا اس بات پہ یقین کرنے
میں کہ میں جس لڑکی کو چاہتا تھا اس سے میری شادی

ہی ہو گئی ہے۔ اب تھوڑا تھوڑا یقین ہو چلا ہے کہ
میری شادی ہو گئی ہے۔“

”تو پھر کیا خیال ہے کہ لو میرج ہونی چاہیے یا آرٹج؟“

”بات یہ ہے کہ جہاں انڈر اسٹینڈنگ ہو وہی
شادی کامیاب رہتی ہے۔ خواہ لوہو یا آرٹج ہو۔“

”شادی کے بعد لڑکیوں کی آزادی پہلے جیسی نہیں
رہتی ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہوا؟“

”شادی کے بعد آزادی میں بہت فرق پڑتا ہے۔
آپ بایند ہو جاتے ہو۔ کیونکہ گھر سے ابھی نکلنے ہی لگو تو
بیگم پوچھتی ہیں کہ کب آئیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ
بھئی پہلے نکلے تو دو۔“

”پہلے والی زندگی یاد آتی ہے؟ اور کون سی زندگی بہتر
لگتی ہے؟“

”بالکل آتی ہے۔ اور زندگی تو دونوں طرح سے
ہی اچھی ہے خواہ شادی ہو یا نہ ہو بات ضرورت کی
ہوتی ہے۔ پہلے والی لائف میں بیگم نہیں تھیں
دوست تھے۔ اب دوست نہیں ہیں بیگم ہے۔ ایسا تو
ہوتا ہی ہے۔“

”شادی زندگی کے لیے کتنی ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ بندہ ذمہ دار ہو جائے۔ لائف
سٹیبل ہو جاتی ہے۔ اچھا لگتا ہے انسان کا بچہ بن جاتا
ہے۔ فیملی لائف شروع ہو جاتی ہے۔“

”ثانیہ مزاج کی کیسی ہے؟“

”بہت معصوم ہے۔ کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی سوائے
اس کے کہ چاکلیٹ دلا دیں، چمپس دلا دیں۔ بچوں والی
فرائشیں ہیں اس کی۔“

”ثانیہ نے مائیکرو بیاالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ جاب
کرتی ہیں اور تم چاہو گے کہ تمہاری فیملی میں آئیں؟“

”یہ جاب نہیں کرتی شادی سے پہلے ریکش کرتی
تھی اور میں تو نہیں چاہوں گا کہ یہ جاب کرے بلکہ
میری خواہش ہے کہ یہ گھر پر ہی رہے اور یہ بھی کبھی
نہیں چاہوں گا کہ یہ اس فیملی میں آئے کیونکہ اگر مجھے

کسی اداکارہ سے شادی کرنی ہوتی تو میں اس سے شادی
کیوں کرتا اور جاب بھی لڑکیوں کو اس وقت کرنی
چاہیے جب بہت مجبوری ہو۔“

”ہنی مون کہاں منانے گئے تھے؟“

”ہنی مون منانے اب جاؤں گا۔ ایک کمرشل کے
سلسلے میں ملائشیا جانا ہے تو ساتھ میں بیگم کو بھی لے
جاؤں گا۔ ہنی مون بھی ہو جائے گا اور کام بھی ہو جائے
گا۔“

”ثانیہ کی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ۔“

”اچھی عادت تو یہ ہے کہ بہت رحم دل ہے۔
ہمدردی کا مادہ کوٹ کوٹ کر کھرا ہوا ہے۔ بری عادت یہ
کہ تھوڑی ضدی ہے۔ اتنا رست بہت ہے مگر اب
شادی کے بعد حساس بہت ہو گئی ہے۔ پہلے جیسی ضد
اور اتنا نہیں رہی ہے۔“

”فضول خرچ ہو؟“

”فضول خرچی کا تو سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ منگائی
بہت ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے صرف تین مرتبہ
گھر سے باہر ڈنر کرنے گئے ہیں۔ سینما ہاؤس بھی نہیں
جاتے۔“

”تمہارے ڈرامے پسند کرتی ہیں اور شادی کی
رسمیں دونوں طرف کی ایک جیسی تھیں کیا؟“

”نظر آجائے تو دیکھ لیتی ہے اور رسمیں تھوڑی سی
مختلف تھیں۔ ہماری ایڈین ٹائپ کی رسمیں تھیں اور
ان کی الگ ٹائپ کی تھیں۔ مجھے ایڈین کی رسم زیادہ
اچھی لگی تھی۔“

”شادی کی صحیح عمر کیا ہونی چاہیے اور لڑکی کا خوب
صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟“

”دیکھیں جی خوب صورتی تو بہت سی لڑکیوں میں
ہوتی ہے لیکن بات یہ ہوتی ہے کہ آپ کو کسی کی ادا
پسند آجائے۔ مجھے اس کی معصومیت زیادہ پسند آئی
تھی۔ اب اس سے زیادہ معصومیت کیا ہوگی کہ کچھ دن
پہلے کی بات ہے۔ ایک مجھے مجھے تنگ کر رہا تھا اب
ثانیہ نے ایک دم میرے منہ کے سامنے اس پرے کر دیا
میں نے تھوڑی خفگی سے کہہ دیا کہ ”یہ کیا طریقہ

ہے۔ جس اتنا کہنا تھا کہ اس نے رونا شروع کر دیا۔“

ثانیہ آفندی

”ثانیہ! کیسی ہیں آپ؟ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“

”جی میں ٹھیک ہوں۔ میرے والد لائبریرین اور ان کا نام غنفر آفندی ہے جبکہ امی کا نام نازنین ہے اور وہ ہاؤس وائف ہیں۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے۔ پھر میں ہوں اور مجھ سے چھوٹی بہن ہے۔ بھائی اے سی سی کر رہا ہے اور بہن بی فارمی میں ہے۔“

”اور زندگی کیسی گزر رہی ہے اور تمہاری اور فائق کی دوستی کس طرح ہوئی؟“

”بہت اچھی گزر رہی ہے اور ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا ہے اور دوستی اس طرح ہوئی کہ میں ان کی فین تھی اور ہم ایک کنسرٹ میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے انہیں دیکھا اور ان سے آؤ گراف لیا اور میری بہن نے ان سے ان کا آئی ڈی مانگ لیا۔ پھر ایک دو سال کا گپ آگیا۔ اس کے بعد ہماری چیٹ ہوئی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پروپوز کیا۔ پھر انہوں نے گھر والوں سے بات کی۔ ان دنوں میرے ابو امریکا میں تھے پھر جب ابو سے بات کی تو انہوں نے پہلے تو تھوڑا ایڈو بتایا۔ پھر ان کی فیملی سے ملے۔ فائق سے ملے تو ابو کو یہ اچھے لگے۔ اور پھر وہ رشتے رضامند ہوئے۔“

”جو انٹ فیملی میں آئیں تو گھر کا حوالہ کیسا لگا؟“

”جی بالکل۔۔۔ ان کے امی ابو ہیں اور وہ بہنیں ہیں اور ماشاء اللہ ان کے گھر کا حوالہ بہت اچھا ہے۔ مجھے سسرال میں آکر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

”شادی کی رسموں کے بارے میں بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ نکاح کے وقت کیا کیفیت تھی؟“

”مجھے شادی کی رسمیں اچھی لگتی ہیں اور ہندی کی رسم خاص طور پر جو کہ میں نے خود بھی انجوائے کی اور نکاح سے پہلے میں بہت ریلیکس تھی اور مجھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میرا نکاح ہو رہا ہے۔ جو جب نکاح ہو گیا تو ایک

دم سے رونا آگیا اور رخصتی کے وقت تو میں کافی اپ سیٹ تھی اور روتی بھی تھی۔ مگر پھر دوسرے دن ہی سیٹ ہو گئی تھی۔“

”یوں تو چیٹ ہوتی تھی لیکن جب فائق شریک سفر بن گئے تو کیسا پایا عادت اطوار میں؟“

”عادت و اطوار میں بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں اور کمپو وائزنگ بھی بہت ہیں۔ البتہ غصے کے تیز ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر ڈانٹ دیتے ہیں۔“

”گھر کے کاموں میں تمہارا ساتھ دیتے ہیں؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ رات کو جب میں برتن دھونے جا رہی ہوں تو کہتے ہیں کہ لاؤ میں دھو دیتا ہوں اور زبردستی میرے ہاتھ سے چھین کر خود دھو دیتے ہیں برتن۔“

”سسرال میں سب رشتے کیسے لگے؟“

”سسرال میں سب بہت اچھے ہیں اور خاص طور پر ساس تو بہت اچھی ہیں۔ بہت معصوم سی ہیں۔ ساسوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ ایسی ہوتی ہیں فکسی ہوتی ہیں تو میں سوچتی تھی کہ پتا نہیں میری ساس کیسی ہوں گی۔ لیکن شکر اللہ کامیری ساس تو بہت اچھی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ ساس ہیں۔ بالکل ماں کی طرح لگتی ہیں اور ننڈیں بھی بہت اچھی ہیں۔ سسر بھی بہت پیار کرتے ہیں۔“

”ابھی تو شادی کو بہت کم وقت ہوا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سب رشتے تمہیں ہمیشہ ایسے ہی اچھے لگیں۔ تم بتا رہی ہو کہ تھوڑے غصے کے تیز ہیں تو کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟“

”چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آتا ہے۔ جیسے اب مجھے ”ناخن کترنے“ کی عادت ہے تو اس بات پر غصہ کرتے ہیں۔ اسپرے والی غلطی بہت ڈانٹ پڑی تھی۔ کوئی چیز اوھر سے اوھر رکھ دی تو غصہ آ جاتا ہے۔“

”تم بتا رہی ہو کہ تم ان کی فین تھیں تو کون سا ڈراما دیکھا تھا اور اب تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم بھی اس فیلڈ میں آؤ؟“

”میں نے ان کا ڈراما ”شیشے کا گھر“ دیکھا تھا۔ آج کل ان کا ڈراما ”اجنبی شہر کے اجنبی راستے“ بہت اچھا ہے۔ اس طرح ”لیلیٰ“ بہت اچھا ہے اور ڈراموں میں کام کرنے کا میرا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی میرا دل چاہتا ہے۔ ہاں اگر کمرشل کی آفر آئی اور وہ بھی ان کے ساتھ تو ضرور کروں گی۔ ویسے ان کے ساتھ فوٹو شوٹ کروا چکی ہوں۔“

”شادی اور ولیمہ کا جوڑا کس کی طرف سے تھا اور پسند کس کی تھی؟ شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی؟“

”جی! شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی اور شادی اور ولیمہ کا جوڑا سسرال کی طرف سے ہی تھا لیکن پسند میری تھی۔ شادی کا جوڑا تو سرخ تھا اور ولیمہ کا گرین کلر کا تھا۔“

”تم پڑھتی لکھی ہو۔ سائیکرو بیالوجی میں ماسٹرز ڈگری لی ہے۔ جب کرنے کو دل چاہتا ہے؟“

”نہیں دل تو نہیں چاہتا لیکن کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں تاکہ پڑھا ہوا بھول نہ جاؤں۔ پریکٹس میں رہنا چاہتی ہوں۔“

”مشہور بندے سے شادی کرنے میں نقصان یا فائدہ؟“

”فائدہ ہے۔ اب کیا فائدہ ہے؟ یہ تو نہیں معلوم لیکن بس اچھا لگ رہا ہے کیونکہ بیکم بھی مشہور ہو جاتی ہے اور اب تو لوگ مجھے بھی پہچاننے لگے ہیں۔“

”فائق کتنے رومانٹک ہیں اور منانے میں پہل کون کرتا ہے؟“

”جی۔۔۔ رومانٹک مزاج ہیں اور کبھی وہ پہل کر لیتے ہیں منانے میں کبھی میں کرتی ہوں۔ جس کی غلطی ہوتی ہے وہ ہی پہل کرتا ہے۔“

”منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور اگر تمہارا موڈ خراب ہے تو فائق کی کس بات سے تمہارا موڈ فوراً ٹھیک ہو جاتا ہے؟“

”منہ دکھائی میں مجھے برسٹل ملا تھا اور جب یہ پیار

سے بات کر لیتے ہیں تو میرا موڈ فوراً ٹھیک ہو جاتا ہے اور یہ اگر پروانہ کریں تو پھر میرا موڈ اور زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔“

”رات کو فائق کے گھر آنے پر سارا دن کی روداد سناتی ہو؟“

”نہیں جی! ٹائم ہی نہیں ملتا۔ کیونکہ یہ بہت دیر سے آتے ہیں۔ پھر میں ان سے ہی پوچھتی ہوں کہ آپ نے سارا دن کیا کیا؟ دن کیسا گزرا آپ کا۔“

”سادگی پسند ہو یا فیشن اچھا لگتا ہے؟“

”میں تو سادگی پسند ہوں اور ان کو بھی میں سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ لیکن چونکہ ابھی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں تھوڑی سچی بنی رہا کروں۔“

”جس فیلڈ سے فائق کا تعلق ہے وہ ایک خطرناک فیلڈ ہے ڈر لگتا ہے؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ ایک تو میں انہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں اور پھر فیلڈ کے سب لوگوں کو ہماری شادی کے بارے میں پتا ہے۔“

”اگر ان کا دل کسی اور لڑکی پہ آگیا اور دوسری شادی کرنے کا سوچ لیا تو کیا رد عمل ہو گا تمہارا؟“

”میں انہیں کرنے ہی نہیں دوں گی اور میری اجازت کے بغیر یہ کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“

اس دوران فائق کی آواز آئی۔

”اس منگائی کے دور میں کوئی بھی دو شادیاں افورڈ نہیں کر سکتا۔“

اور ان دونوں کے قہقہوں کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔





دستک دستک

ایمن طارق

”کیسی ہو۔ کمال کی اداکارہ ہو۔“

”میں ٹھیک ہوں اور کیا مطلب کہ میں کمال کی اداکارہ ہوں؟“

”کمال کی اداکاری اس لیے کہا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم ہر قسم کا کردار بہت آسانی اور عمدگی سے کر سکتی ہو۔“

”شکریہ۔ آپ کو میرا کون سا کردار بہت اچھا لگا۔“

”مجھے تو سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ لڑکیاں تو کوئی کردار لیتے وقت اپنی خوب صورتی کا بہت خیال رکھتی ہیں مگر تم نہیں سمجھتی گیوں؟“

”آپ کا اشارہ ”دل تو بھٹکے گا“ اور ”میری صبح کا ستارہ“ سے ہے تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ مجھے اپنی خوب صورتی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔“

”کیونکہ میں ایک فنکارہ ہوں اور اپنی اداکاری سے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتی ہوں اپنی خوب صورتی سے نہیں۔“

”بات تو یہ ٹھیک ہے۔ میری صبح کا ستارہ میں بھی ایک سائنولی لڑکی کا رول کیا اور دل تو بھٹکے گا میں ایک نوکرائی کا جو کہ کافی بد صورت دکھائی گئی ہے کارول کیا۔ اس بارے میں کسی نے بھی کچھ کہا؟“

”ہاں۔ بالکل کہا کہ ایسے رول کیوں کرتی ہو تو میں یہی کہتی ہوں کہ اگر میں اپنی بیوٹی کا خیال رکھوں تو پھر مجھ میں اور دیگر لڑکیوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ایک اداکارہ کا مکمل تو یہ ہے کہ وہ نظر آئے جو وہ نہیں ہے۔ اور آپ یقین کریں کہ مجھے میری اداکاری کے

شاہین رشید

حوالے سے بہت لوگ پسند کر رہے ہیں اور جب کوئی پسند کرنے لگے تو محنت وصول ہو جاتی ہے۔“

”آئندہ بھی ایسے ہی رول کرنے ہیں؟“

”ایسے ہی رول سے مراو سائنولی اور کالی لڑکی کے رول ہیں تو ایسا نہیں ہے آئندہ ایسے رول کروں گی جو میرے لیے چیلنجنگ ہوں گے میں چاہتی ہوں کہ میرا ہر کردار دوسرے کردار سے مختلف ہو میں ناظرین کو مختلف انداز میں نظر آنا چاہتی ہوں۔“

”گٹھ۔ آج کل کیا آئن ایر ہے؟“

”دل تو بھٹکے گا مجھے روٹھنے نہ دینا جنت سے نکالی گئی عورت اور اس وقت یاد نہیں آرہے۔ اس طرح انڈر پروڈکشن بھی کافی کام ہو رہا ہے۔“

”آئن ہی مصوفیات کی وجہ سے تم ہاتھ نہیں آتیں۔“

”کیا کروں سب کو یہی شکایت ہے۔ گھر والوں کو بھی یہی شکایت ہے۔ ان کو بھی کئی کئی دن میری شکل

”نظر نہیں آتی۔“

”کیوں۔“

”کسی ایک شہر میں ریکارڈنگ تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ آج اس شہر میں تو کل اس شہر میں۔ بس اس وجہ سے گھر میں رہنے کا اتفاق ذرا کم ہی ہوتا ہے۔“

”اچھا ہے نا۔ سب جگہ گھومنے پھرنے کو مل جاتا ہے۔“

”گھومنے پھرنے کا مزا تو اس وقت آتا ہے جب فیملی ساتھ ہو، فرصت کے اوقات ہوں، کوئی مصروفیت نہ ہو کوئی ٹینشن نہ ہو۔“

”تم نے سوپ بھی کیے، سیریلز بھی، مزا کس میں آتا ہے؟“

”مزا کام میں آتا ہے۔ (تقبہ) سوپ کا کام طویل ہوتا ہے۔ کہانی روز کے روز چل رہی ہوتی ہے۔ یہی لمبی اقساط یعنی سوڈیز سو سے کم نہیں ہوتیں جبکہ سیریل زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس اقساط تک ہوتا ہے۔ مجھے تو کام کرنا ہے خواہ سیریل ہو یا سوپ۔“

”ویسے تو تم ماشاء اللہ بہت اچھی فنکارہ ہو مگر کبھی کسی نے کہا کہ فلاں ڈرامے میں آپ اچھا پر فارم نہیں کر رہیں؟“

”نہیں، ایسا کسی نے نہیں کہا اور مسئلہ یہ ہے کہ یہاں منہ پر تو کوئی تنقید کرتا ہی نہیں ہے۔ آگے لپچھے بہت تنقید ہوتی ہے کہ ایسا کر دیا ویسا کر دیا وغیرہ وغیرہ۔“

”اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ ایسی کڑی تنقید ہوئی نہیں۔ اور ویسے بھی میں تعمیری تنقید کو پسند کرتی ہوں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ آپ اچھا کر رہی ہو یا آپ برا کر رہی ہیں۔ کافی نہیں ہوتا۔“

”اتنی مصوفیات کے بعد نیند بھی اچھی آتی ہوگی اور ٹینشن بھی نہیں ہوتی ہوگی؟“

”ٹینشن نہیں ہوتی؟ یہ کیسی بات کر دی آپ نے مجھے تو ٹینشن بھی ہوتی ہے اور ڈپریشن بھی بہت ہوتا ہے۔ بے شک نیند اچھی آ جاتی ہے لیکن اگلے دن کی ٹینشن بھی بہت ہوتی ہے۔“

”تم نے اس فیلڈ میں کافی کام کیا ہے۔ آسان کون سا شعبہ لگتا ہے۔ ساؤنڈنگ اداکاری یا ٹھیکر؟“

”سب سے آسان تو مجھے ٹھیکر لگتا ہے بشرطیکہ آپ بولڈ ہیں اور آپ کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے کہ آپ پبلک کے سامنے سب کچھ آسانی سے کر لیں گے۔ ٹھیکر میں فوراً اندازہ ہو جاتا ہے اپنی کارکردگی کا اور اپنی صلاحیتوں کا۔ ٹی وی میڈیا اس لیے مشکل ہے کہ ہر کردار کے لیے موڈ کو پچویشن کو اور کہانی کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔“

”ٹھیکر کے لیے تم اندازہ بھی جا چکی ہو؟“

”جی، بالکل جا چکی ہوں اور ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ جا چکی ہوں اور نپا کے پلیٹ فارم سے ہی گئی ہوں اور اب تک کلکتہ، امرتسر اور دہلی جا چکی ہوں۔“

”اپنی کوئی خاصی بتانا چاہو گی؟“

”جی، مجھے غصہ بہت آتا ہے۔ میں بہت حساس طبیعت کی مالک ہوں۔ چھوٹی سی بات بھی میرے دل کو لگ جائے تو گھٹنوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ اپنی ان خامیوں کو دور کرنا چاہتی ہوں۔“

✽ ✽ ✽

کنور ارسلان

”کنور کیسے ہو؟ تمہارا نام لوگ صحیح تلفظ کے ساتھ لیتے ہیں؟“

”جی میں ٹھیک ہوں۔ اور آپ نے ٹھیک کہا کہ اکثر لوگ میرا نام غلط لیتے ہیں۔ لیکن کیا کریں جو غلط لیتا ہے اس کو تو بتا دیتے ہیں کہ اس طرح نہیں اس طرح ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لکھنے والے بھی خیال نہیں رکھتے۔“

”آج کل کم کم نظر آرہے ہو کیوں؟“

”بس اتفاق ہے۔ جب کام آئن ایر ہوتا ہے تو ایک ساتھ ہی ہو جاتا ہے اور جب کم ہوتا ہے تو ایک ساتھ



عالیہ بخاری

دلالت

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ امداد لیلہ نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیرہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تھلے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو میڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لادی اذتے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دیر حیران کن ہے۔ شہر اگر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالور شرکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آٹلی چوڑیل دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اس لیے مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دسا لوٹ جانے کا فکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری عہدے کے ایمان دار میڈیکرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پروردگار کاہنوں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں امداد دی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا لکھنؤ اظہار تھا کہ ہے جو ظاہری نمود و نمائش ادب سے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری عہدے میں مگرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کمپن ہے۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاوضے طے ہوتی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چنانچہ سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس میں یوسف کمال کی بیٹی زویرہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر لبثا ملش ہے۔ جویا امداد معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موانع ہیں۔

زد تاج بیگم کے بچے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ بیگم کی پہلی جمعات کو یہاں سے عزیز عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ امداد بول بیسی کتی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہلے مل رہے ہیں۔ بوا عظمت، قد تاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے جو عرصہ دراز



یوسف کمال کی نگاہ اسی ایک سمت پر ساکن ہوئی۔ ثانی ستارہ کا وہ وسیع آرائشی برآمدہ ۴ اطراف میں جھوم کر دو چمکی برسات سب ہی کچھ کہیں فضاؤں میں تحلیل ہوئے تھے۔
صرف وہ تھے اور سامنے دیوار پر لگی حقیقت سے پردہ اٹھاتی وہ بڑی سی تصویر۔
بادل بہت زور سے گر جاتھا۔ انہوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

برآمدے میں وہ اکیلے کھڑے تھے۔ گھینے یا ثانی ستارہ میں سے کسی نے بھی انہیں دروازے تک چھوڑنے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ کوئی معزز مہمان نہیں تھے بلکہ وہ تو کسی عام سے ملاقاتی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

یوسف کمال نے شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت یہاں اکیلے تھے ورنہ شاید کبھی بھی۔
چند قدم آگے بڑھ کر وہ اس کمرے کے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے یہاں بھی کوئی نہیں تھا مگر وہ تصویر اب اور بھی نمایاں تھی۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اس تصویر کے بالکل قریب آ گئے تھے۔
”یہ وہی تھا۔“

وہی سنہری رنگت، وہی براؤن آنکھیں، جن کی اداسی اس تصویر میں بھی نمایاں ہو رہی تھی اور چہرے پر وہی زمانے بھر سے لا تعلقی کا گہرا اثر!

یوسف کمال کی شاید پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔
اب کوئی جلتے انگاروں پر بھی کھڑا ہو کر حلق اٹھائے کہ ان کا بیٹا مر چکا ہے تو وہ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔
وہ جسے نصف چار سال کی عمر میں اس بیمار، تھکی ہاری فیروزہ کے سپرد کر کے، وہ ان دونوں کے سارے حقوق و فرائض سے اپنے طور پر بری الذمہ ہو گئے تھے۔

وہ ننھا سا بچہ ان کی بے حسی، مال سے محرومی اور زمانے کی ٹھوکروں کے باوجود بھی زندہ رہا اور آج ایک بھرپور حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔

انہیں خیام کی سخت جانی پر حیرت ہوئی قدرت کی بے نیازی اور کارگری، دونوں ہی بیک وقت عجیب انداز میں ان کے نصیب کا حصہ بنی تھیں۔

”پتا نہیں انہیں اپنی خوش نصیبی کا جشن منانا چاہیے یا اپنی بد نصیبی کا ماتم کرنا چاہیے۔“
ایک ساتھ بہت سے آنسو یوسف کمال کے چہرے کو بھگوتے ٹپپیں میں جذب ہو گئے۔

تھیلی سے چہرہ خشک کر کے وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئے۔
برآمدہ ابھی بھی خالی تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے جالی گئے گلابی، کاسنی پردوں کو اڑائے لیے جارہے تھے اور برستی بارش کا پانی برآمدے کا آدھے سے زیادہ فرش گیل کر چکا تھا۔

اندرونی ستارہ کے کمرے میں ان کے اور گھینے کے بیچ موضوع گفتگو یوسف کمال ہی تھے۔
”بے غیرت گھینے۔ ہمت تو دیکھیں اس کی، کیسے آکر سر پر کھڑا ہو گیا جواب طلبی کرنے۔ مری ہوئی بہن کی قسم کھا کر کہتی ہوں اماں! کہ میں۔۔۔“ گھینے کے کڑواہٹ میں ڈوبے الفاظ ادھر سے مفہوم کے باوجود سمجھ میں آتے تھے۔

دروازے کی چوکھٹ میں وہ بے غیرت گھینے پھر سے آکھڑا ہوا تھا۔
”تم نے مجھ سے اتنا برا جھوٹ بولا گھینے!“ دو قدم آگے بڑھ کر وہ ٹھیک اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔ چہرے پر ایسی عجیب سی کیفیت تھی کہ گھینے جیسی بدنگ عورت کو بھی ایک بار آنکھ چرائی ہی پڑی۔
”کیوں آخر؟ تم اگر اسے مجھ سے ملنے نہیں دینا چاہتی ہو تو تم مجھے صاف لفظوں میں بھی منع کر سکتی تھیں۔“

سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔
سلمان رفتہ رفتہ زندگی بھر کی مارت سے متاثر ہو کر اس کے ذرا اثر آجاتا ہے۔
زود بیانی منہ بانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات متواہی ہے۔
اظہارِ بچا، شاکرہ بیگم ادا پاگل سولہ تھلنے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امتدیں زود بیہ کو ملنے والے ہنگے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔
اسکول کے بچے سہیل کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہوتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔
دیعباس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی پاتی ہے۔ اظہار بچا خاندان مع سولہ جویا اور ندیہ لکھا اس حادثے سے خوب خطا اٹھاتا ہے۔ جویا چلتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبیس سالہ روئی دن بدن برستی جا رہی ہے جس پر گھینے آئے دن جتنی کوششیں رہتی ہیں۔ شام ہر موقع پر اس کی اشک شونی کرتی ہے۔ گھینے کی تمام امتدیں اپنی بڑی بیٹی مندل سے وابستہ ہیں۔ گھینے زیادہ تر ہڑحانی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالانہ آمدورفت اسے قدم بے قدم چھین کرنے لگتی ہے۔
خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گھینے کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بالوشوک سے اس کی اچھی دُعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھیں۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوا لہ نشان لگ جاتا ہے۔

زندہ تاج بیگم اپنے لاش کی دیگر عورتوں کی طرح خود غامی اور خود ستا لاشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکرپٹرز بدلنے کی عادت ہے۔ عالیہ سکرپٹرز میں سے ان کا تعلق ”ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نیل جسے دُعا شوروں کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زندہ تاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زندگیوں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جزیب ہوتا ہے۔ زندہ تاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نیل کی اختیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زندہ تاج بیگم جنگیوں میں ڈال دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے بڑے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بالوشوک کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بالوشوک اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گھینے کی چوڑیاں اسے یاد کی دود سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آباگل سے بحث کرتی ہے۔ آباگل کی لالچنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آباگل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہ ہم بھتیجی ہیں۔ سلمان، زود بیگم کے گھر میں شغف ہو چکا ہے اور شازادہ دانی ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم ادا اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آنا قاتلانے ہو جاتا ہے جس میں اظہار بچا، آباگل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں، شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو خلاق کی دھکی اپنا سلام دکھاتی۔۔۔ وہ جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ کم کم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دوا دی، ”چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زود بیگم جویا کو اگسائی ہے کہ اگر وہ چاہے تو دس تھن ختم کھٹنے میں مدد کر سکتی ہے۔ زود بیگم، آباگل اور شاکرہ بیگم کو بچھا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔ مندل کو بالی صاحب کی فلم دونوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں گھینے کے طور طریقے کھٹکے ہیں۔ وہ ایسے ساتھ بے جلتے بے انکار کرتی ہے تو گھینے کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۵۱ اکیا و لوین قسطنطین

شاید وہ خود بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اتنا بھیا تک جھوٹ۔۔۔ اولاد ہے وہ میری۔“

تگینہ اور یوسف کمال دونوں ہی نے خود کو اپنی اپنی جگہ کمزور کیا۔

”شرم آتی چاہیے تمہیں! یوسف کمال نے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا یا اسے احساس جرم کا۔

”شرم! خود برکمال کی لائق تھی طاری کیے بیٹھی تھی ستارہ نے چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا جس کے لیے

ان کے پاس کوئی گھٹیا سے گھٹیا لفظ بھی اب باقی نہیں رہا تھا۔ نہ وہ اس کی شکل دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی آواز سننا

چاہتی تھی، مگر اب جب وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کے گھر میں کھڑے ہو کر جواب طلبی کر رہی رہا تھا تو جواب

دینا بھی لازم ٹھہرا تھا۔

”خود صاحب اولاد ہو کر کسی کے بچے کو جیتے جی مار دینا، تم لوگوں کے ہاں شاید معمول کا قصہ ہو، مگر ہم شریف

لوگ۔۔۔“

”بس! اب ایک اور لفظ آگے نہیں یوسف کمال! ایک اضطراب کے عالم میں وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تگینہ کی طرف رخ موڑ کر کھڑے یوسف کمال نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

ثانی ستارہ کی گلابی رنگت سرخی یا گل ہو رہی تھی۔ وہ ان کے جاہ و جلال کے زمانہ عروج کے گواہ تھے۔

”ہمیں ہماری اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے یوسف کمال! ہمارے ہاں تو تم جیسے شریفوں کی اولادوں کا

پلنا بھی معمول کا قصہ ہے، سو یہاں کھڑے ہو کر اپنی شرافت کی دہائی دینے سے بہتر ہے کہ تم ان ہی قدموں پر واپس

چلے جاؤ ورنہ تمہیں باہر تک پہنچانے کے لیے مجھے کسی کو آواز دینی پڑے گی۔“

اور وہ جو کچھ کہتی تھیں، خالی دھمکی نہیں ہوتی تھی۔ محلے کے سب سے شان دار اور سب سے وضع دار

جو بارے پر ستارہ جان کی زوال پذیر حکومت اب بھی اچھے اچھوں کے چکے چھڑا سکتی تھی۔

”اور ان کی قسمت کا چکر تھا کہ زندگی کی دوسری بڑی خواہش نے انہیں دوبارہ اسی چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے

پر مجبور کر دیا تھا۔

”میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آپ مجھے بس خیام کا پتا دے دیں۔ آپ اسے مجھ سے چھین نہیں سکتیں۔ وہ میرا بیٹا

ہے اور یہ حقیقت۔۔۔“

ثانی ستارہ سے نگاہ چراتے ہوئے وہ ایک سانس میں جو کچھ کہے جا رہے تھے ایک تلخ ترین باب کو کھولنے کا

سبب بن رہا تھا۔

”فیروزہ بھی میری بیٹی تھی یوسف کمال! لاکھوں میں ایک، میرے موتیوں میں تو لے جانے کے لائق اُس کے

قدموں کے نیچے دل رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ میرا سب سے قیمتی اثاثہ تھی وہ جسے تم پوری مکاری سے لے

اڑے۔ مفلس کر دیا، ہمیں ہماری زندگیوں کا پورا نقشہ بدل گیا فیروزہ کے بعد۔ جلتے انگاروں پر سفر تھا جو میری

تگینہ کے حصے میں آیا، مگر۔۔۔“

”رہنے دیں اماں!“ بے آواز آنسو بہاتی تگینہ نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا۔ ”قاتل کے آگے رونے نہیں

روئے جاتے۔ چلتا کریں اس آدمی کو بس غیورہ کا ماتم کرنے کے لیے، ہم اکیلے ہی کافی ہیں۔“

”وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ گئی تھی نکاح کیا تھا پورے عزت و احترام کے ساتھ میں نے اس سے۔۔۔ بہت

محبت کرتے تھے، ہم دونوں ایک دوسرے سے۔۔۔“

”کیسی محبت تھی تمہاری یوسف! جو میری بچی کو جلا کر راکھ کر گئی؟ زندہ لاش کی صورت وہ میرے پاس واپس آ

گئی تھی۔ محض کتنی کی سانسیں تھیں اس کے پاس۔ کیا نہیں کیا میں نے اسے بچانے کے لیے، مگر وہ تو زندوں میں

تھی ہی نہیں۔ تم سے جدا ہوتے وقت اس کی روح بھی جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔۔۔ ہمارے پاس صرف فیروزہ کا

ماں آہا تھا سو وہ بھی مختصر سے عرصے میں معدوم ہوا۔ چپ چاپ قبر میں جا لیٹی۔ مٹی کا رزق ہوئی۔“

ثانی ستارہ کی خوں رنگ آنکھوں سے آنسو گرے تھے یا لہو کے قطرے۔ ایک ایک لفظ میں ہزار ہا بین کرتی

نہیں گراہیں۔

باہر زور و شور سے بارش برساتے بادلوں کا رنگ اور بھی گہرا ہوا تھا۔

کمرے میں اترتے سر مٹی اندھیرے میں زندگی صرف اور صرف غم کا عنوان ٹھہری تھی۔

یوسف کمال کے لیے زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے کھڑا رہنا مشکل تر ہوا تھا۔ ٹانگوں میں ہوتی خفیف سی

لرزش بر قابو پانے ناکام ہوتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل جھکے۔ ثانی ستارہ نے دونوں ہاتھ جوڑے، گھٹنوں کے بل

بیٹھے اس شخص کی طرف محض ایک نگاہ ڈال کر رخ پھیر لیا۔

”چلے جاؤ تم یہاں سے یوسف! تمہاری تسلی کے لیے اتنا بتا دیتی ہوں کہ خیام چار سال پہلے یہاں سے جا چکا

ہے۔ اب وہ کہاں ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ بس یا کچھ اور؟“

”چلا گیا؟ مگر کیوں؟ آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟“ وہ ابھی تک نیچے ہی بیٹھے تھے اور ہاتھ اسی بے بسی کے

ساتھ بندھے تھے۔

ثانی ستارہ کے چہرے پر آئی مسکراہٹ کی ایک جھلک ہزار ہا آنسوؤں سے کشید کی ہوئی تھی۔

”یہ میری قسمت کا لکھا ہے شاید۔ جن جن کو میں نے دل و جان سے چاہا، وہ یوں ہی مجھ سے ہاتھ چھڑا کر فرار

ہوئے۔ وہ بھی تو آخر فیروزہ کا ہی بیٹا تھا۔“

باہر برستی بارش کا شور اور بھی بڑھا۔

”آپ نے اسے ڈھونڈا نہیں؟“

”ڈھونڈا! انہیں جاتا ہے جو کھو جائیں۔ ہم نے فیروزہ کو کب تلاش کیا تھا؟ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ قسمت کی

مار کھا کر واپس آئی تھی۔“

وہ چند لمحے ثانی ستارہ کے چہرے کو تنگے گئے، ایسے جیسے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

”وہ بد نصیب بھی تقدیر کی مار کھا رہا ہے۔ پتا نہیں ٹوٹ بھی سکے گا یا پھر وہیں کہیں ٹھوکروں میں زندگی کی بازی

ہارے۔۔۔“

ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی تھی۔ ثانی ستارہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

”تم۔۔۔ تم نے دیکھا اسے؟ کہاں تھا وہ؟“

اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے بے ساختہ قریب رکھی کرسی کو تھاما تھا۔

”اماں!“ تگینہ تیزی سے آگے بڑھی مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے فاصلے پر ہی روک دیا۔

”اب جھوٹ تم بول رہے ہو یوسف! کہاں دیکھا ہو گا تم نے اسے تم اسے پہچانتے کب ہو؟ کبھی پلٹ کر دیکھا

تک نہیں تھا خیام کو پھر کیسے دعو کرتے ہو کہ۔۔۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ، میں نے تو کبھی اسے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، نہ اسے اور نہ اس کی ماں کو۔ اتنے

ناراض ہیں وہ دونوں مجھ سے کہ وہ میرے خواب تک میں آنا گوارا نہیں کرتے مگر۔۔۔ مگر پھر بھی جب وہ میرے

سامنے آیا تو مجھے اسے پہچاننے میں بل بھر کی بھی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں، ان کا سنہرا پن، سب گواہی

دیتے ہیں کہ وہ فیروزہ کا بیٹا ہے، ایک غلط فہمی ہے، وہ بذات خود! اور اب وہ کمرے میں لگی تصویر۔“

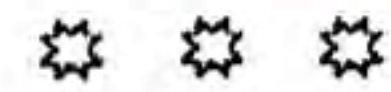
کمرے میں چند لمحوں کے لیے بڑی بو جمل سی خاموشی اتری۔ ثانی ستارہ تگینہ اور یوسف کمال۔

قیان کے پاس اب تردید تصدیق کے لیے کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

چلتا ہوں۔" بنا کسی بھی طرف دیکھے وہ دھیمے لہجے میں کہہ کر دروازے کی طرف مڑے۔
نانی ستارہ نے پیچھے کھڑی نگینہ کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کندھے پر محسوس کر کے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
نگینہ کا سر ہلکے سے نفی میں ہلاتا تھا۔

"نہیں اماں۔ اب اور نہیں! ایک خاموش مگر واضح پیغام نگینہ کی آنکھ کے اشارے نے انہیں دیا تھا۔
انہوں نے بے بسی سے کمرے سے نکلتے یوسف کمال کو دیکھا اور پھر چشم تصور میں اسے برآمدے کی آرائشی
محرابوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے بھی۔
پہلی دوسری تیسری چوتھی۔

اور پھر چند لمحوں بعد وہ سیڑھیاں اتر کر اس بھری دنیا میں ایک بار پھر کھوجائے گا اور اس کے ساتھ ہی خیام کو
زندگی میں ایک بار پھر دیکھ لینے امید بھی۔
اس آخری بات کے ساتھ ہی ساری مصلحتیں بالائے طاق ہوئیں۔
"یوسف کمال! ان کی آواز محرابی برآمدے میں یہاں سے وہاں تک گونج اٹھی۔



آج چوتھا دن تھا اسے یہاں آتے ہوئے۔ یہاں اس گھر میں اسلام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر وہ ایک انوکھی
خوشی اور سکون بھرے احساس میں مبتلا تھا۔ جتنی محبت اور احترام وہ معاذ کا کرتا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ
اسلام صاحب کا کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ اتنے پیارے انسان تھے کہ۔۔۔

"معاذ بھائی کے والد کو ایسا ہی تو ہونا چاہیے تھا! پہلے ہی دن یہاں سے واپسی پر اس نے خود سے کہا تھا سونہ وہ اس گھر پر چھائے سنہرے پن پر حیران ہو سکا اور نہ
ہی پرانے فرنیچر سے سجے اس کھلے روشن کمرے کے سکون بھرے احساس پر۔
یہ نیکی اور سچائی کی طاقت تھی جو منتخب دلوں کے حصے میں آتی ہے اور پھر اطراف کو نور بن کر جگمگاتی ہے۔ سو
جہاں کہیں بھی ایسے لوگ ہوں گے وہ جگہ یوں ہی اپنے نور سے نہاتی ہوگی۔ خیام کو پورا پکا یقین ہو چلا تھا۔
اسلام صاحب ابھی کسی کام سے اٹھ کر باہر گئے تھے۔ خیام نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے خود کو
خوش قسمتوں میں شمار کیا جو یہاں اس گھر تک آسکا اور ان بے حد پیارے لوگوں کی زندگی کے کچھ لمحوں میں
حصے دار بن پایا۔

یا ہر تپتے جھکتے دن سے بالکل مختلف سکون بھری ٹھنڈک گھر کے اندرونی حصے میں پھیلی تھی۔ پچھلے احاطے کی
طرف کھلنے والی کھڑکی آج پوری کھلی تھی اور تیز ہوا سے پرہ اڑا جا رہا تھا۔

وہ پردہ ٹھیک کر کے کھڑکی بند کرنے لگا تھا کہ نگاہ بے ارادہ ہی چپا کے پودے کے قریب کھڑی اس لڑکی پر پڑی۔
بالکل سادہ سے جلے میں وہ بڑی توجہ سے پودوں میں پانی ڈال رہی تھی۔ تیز ہوا سے اس کے بالوں کی لٹکیں ہیر پینڈ
سے نکل کر چہرے پر بکھرتی جا رہی تھیں۔ عجیب سی کشش تھی اس میں کہ وہ چند لمحوں کے لیے اسے بے اختیار
ہی دیکھے گیا۔ کچھ ایسا تھا جو لگتی کی یاد دلا رہا تھا۔ شاید اس کا چہرہ یا پھر وہ غصہ کی سادگی اور معصومیت شاید اس
نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔

باہر کچھ آہٹ ہوئی تھی وہ چونک کر تیزی سے واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔
"کیا حرکت تھی بھلا؟ کسی کو اس طرح دیکھنا اور وہ بھی اپنے عین حسن کے گھر آکر۔"

اس نے بے ساختہ خود کو شرم دلا نا چاہی مگر بل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس طرح شاید اس نے کبھی کسی لڑکی کو

نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گیتی سے بھی نظر چرا کر ہی چلا تھا اب تک۔ گھر سے نکلتے وقت بھی جب اس نے دل سے التجا
ہی کی تھی کہ وہ اسے ایک نظر بھر کر دیکھ لے وہ دل کی آواز پر کان دھرے بغیر نکل آیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اگر
وہ اسے دیکھے گا تو وہاں سے نکلنے کا ہر راستہ خود پر بند پائے گا۔ مگر آج۔۔۔!

اس نے میز پر رکھی کتاب یوں ہی خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے اپنے سامنے کھول کر رکھ لی مگر۔۔۔
کمرے میں کوئی نہیں آیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس طرف دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔
چپا کے جھنڈ کے نیچے اب کوئی نہیں تھا۔ بلکہ ادھر ادھر بھی نہیں پانی کا پائپ وہیں زمین پر رکھا تھا۔ خیام کو
اپنی ہاؤسی پر تھوڑی حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ دروازے سے اسلام صاحب اندر آ رہے تھے۔
"معاف کرنا۔ خیام بیٹا! مجھے تھوڑی دیر ہوئی!"

"نہیں سر! ایسی کیا بات ہے؟" وہ شرمندہ سا کھڑا ہوا۔
"بیٹھو بیٹھو! انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا "دور یہ تم مجھے سر کیوں کہتے ہو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے
بچوں کی طرح ہو تم بھی بیٹا۔" ان کے لہجے میں بڑی محبت تھی۔
"جی! خیام نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ ہلکے سے مسکرائے۔ معاذ سے اس کی تنہائی اور غیر معمولی رویہ کے بارے میں جان کر انہیں بے حد دکھ
ہوا تھا۔

"پھر میں آپ کو کیا کہا کروں؟" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔
"بھئی جیسے معاذ آبا کہتا ہے، تم بھی اب ایسی کہا کرو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" ان کے سرسری سے انداز میں کہی
بات نے خیام کو چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش کر دیا تھا۔ اسلام صاحب دانستہ اپنے سامنے رکھی کتاب کی ورق
گردانی میں مصروف ہوئے۔

"میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اتنے محترم رشتے سے پکاروں۔" اس کی نگاہ جھکی ہوئی تھی اور لہجے میں
اعتراف جرم کی سی کیفیت۔
"تم کسی قابل ہو یا نہیں ہو یہ فیصلہ دنیا کو کرنے دو وہی بہتر فیصلہ کرتی ہے۔ ہم تم اپنے بارے میں کبھی ٹھیک
دعا نہیں کر سکتے ہیں بیٹا!"
"مگر انسان کے لیے اپنی اوقات کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے سر اور نہ وہ کہیں کا نہیں رہتا ہے۔" خیام کا سر کچھ
اور بھی جھکا تھا۔

اسلام صاحب کا دل دکھ سے بھرنے لگا۔ "کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکیں۔" انہوں نے بہت دل سے
خواہش کی۔

"ایسا تم سوچا کرو خیام! کسی کے پاس محض چند میسے زیادہ یا کم ہو جانے سے کسی کی اوقات طے نہیں ہوتی۔
خدا نے سب کو برابر پیدا کیا ہے۔" شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے اس کی گنجی کو کم
کرنا چاہا۔ مگر یہ دو چار دن کی دین نہیں تھی۔ عمر بھر کا قصہ تھی۔

"کہاں برابر پیدا کیا ہے خدا نے۔ بنگلوں محلوں میں پیدا ہونے والے کا کچرے کے ڈھیر میں پیدا ہونے والے
سے کیا مقابلہ ہے سر! اصل میں آپ اور معاذ بھائی دو سروں سے بہت مختلف ہیں۔"

اس بار اس نے اسلام صاحب کی طرف دیکھ کر بات کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی گہری اداسی تھی کہ وہ
ہل ہی خود کو سنبھال پائے۔

"میں پھر اپنی بات دہراؤں گا خیام! کوئی کہیں بھی پیدا ہو خدا کے نزدیک ہر انسان برابر ہے۔ یہ طبقاتی فرق تو اس

دنیا کے نظام کا حصہ ہے بیٹا! اس کی اتنی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ بس خدا کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرتے رہو۔ وہ بڑا مہربان ہے، کسی کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتا، سارا آخر، سارا غور اسی کو زیبا ہے۔

فلو ص دل سے کہے گئے الفاظ کی اثر انگیزی غضب کی تھی۔
”یہی ہیں وہ جن کے آگے وہ اپنے دل کا سارا بوجھ اتار سکتا ہے۔“ خیام کے دل نے اپنی ساری زندگی میں پہلی بار پوری شدت سے اس طرح آرزو کی۔ وہ ایک بار تو پورا کا پورا کانپ اٹھا۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری! اسلام صاحب نے اسے فکر مندی سے دیکھا۔
خیام کے ہونٹوں کی ہلکی سی لرزش اور چہرے پر آتا پسینہ۔ وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔
”خیام بیٹا! اسلام صاحب نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر خو سے قریب کیا۔
”جی! میں ٹھیک ہوں۔“ چہرے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے بمشکل مسکرایا۔

”بس چلتا ہوں۔“ اس نے مڑ کر میز پر سے کتابیں اٹھائیں۔
اسلام صاحب اسے روکنا چاہ رہے تھے۔ ان کے خیال میں وہ ٹھیک نہیں تھا، لیکن وہ خود پر کمال ضبط کا مظاہرہ کیے گیا۔

”باہر کو چپ ہے، آپ تکلیف مت کریں۔“ جب وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کے بیرونی احاطے کی طرف آ رہے تھے تب خیام نے انہیں منع بھی کرنا چاہا۔
”میں اتنا بھی بوڑھا نہیں ہو گیا ہوں کہ چار قدم چل کر تھک جاؤں گا۔ معاذ بھی ہر وقت یہی ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے کہ میں اب زیادہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں اور اب تم بھی۔“ انہوں نے دانستہ خوش دلی سے ناراضی جتائی۔ اس بار خیام کی مسکراہٹ بھی بے ساختہ تھی۔
”معاذ بھائی کی تو کیا بات ہے، ان جیسا کون ہوگا۔“ معاذ سے اس کی محبت، عقیدت میں بدلنے لگی تھی۔ آبا خوش ہونے کے بجائے سنجیدہ سے ہوئے۔ خیام ان کو رکتا دیکھ کر فوراً ہی خود بھی رکا۔

”معاذ جیسے ہزاروں لاکھوں ہوں گے اس ملک میں خیام! یہ میرا یقین ہے، اور وہ جہاں بھی ہیں، اپنے حصے کا کام کر رہے ہوں گے۔ معاذ سے بھی کہیں زیادہ بہتر طریقے سے اور میری دعا ہے کہ آنے والے دنوں میں تم بھی معاذ سے کہیں آگے نکل جاؤ۔ نیکی کا چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا بیٹا! کیونکہ نیکی صرف نیکی ہوتی ہے چھوٹی یا بڑی نہیں۔ اس راہ میں سبقت لے جانے کی تو یقیناً تمہیں ضرور اللہ کی طرف سے ملے گی۔“
ایک بھاری ذمہ داری انہوں نے پورے یقین کے ساتھ اسے سونپی۔ خیام نے ایک گہری سانس لی۔ اندر پھیلی پیش پر سکون کا ٹھنڈا احساس محیط ہونے لگا۔
”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ آبا! اپنے الفاظ پر وہ اب حیران بھی نہیں ہوا۔ ذات کی تبدیلی کا عمل اب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

”ان شاء اللہ! انہوں نے اسے بہت محبت سے گلے لگایا اور جب وہ ان سے الگ ہوا تو اس بار اس کی آنکھوں میں دکھ کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے، جنہیں صاف کرتے ہوئے وہ جھپٹا نہیں، مسکرایا تھا۔
”میں تمہارا انتظار کروں گا، جب بھی وقت ملے آجانا۔“ جب وہ بائیک اشارٹ کر رہا تھا تب انہوں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

”میں ضرور آؤں گا آبا! بہت ساری باتیں کرنی ہیں مجھے آپ سے۔“
اس نے پورے اعتماد سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر بائیک اشارٹ کر کے گیٹ سے نکلتا چلا گیا تب ہی وہ اسے

ایک بار پھر اچانک سامنے نظر آئی۔ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ وہ گھر میں واپس داخل ہو رہی تھی۔ شاید کسی قریبی اسٹور تک کچھ لینے گئی تھی۔

خیام نے اگر فوراً ہی بریک نہ لگائے ہوتے تو شاید وہ اس کی زد میں آجاتی۔
”معاف کیجئے گا!“ خیام نے گھبرائی ہوئی آواز میں اسے کہتے ہوئے سنا۔
”غلطی تو میری ہے، مجھے دیکھنا چاہیے تھا۔ چوٹ تو نہیں لگی؟“
جواباً اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر پچھلی شرم اور گھبراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ لڑکوں سے زیادہ بات کرنے کی عادی بھی نہیں ہے۔
”ویسے آپ نے بڑے وقت پر بریک لگائی، ورنہ ربیعہ باجی تو گنی تھیں کام سے۔“ ساتھ والی لڑکی نے بڑا بے تکلفی بھرا تبصرہ کیا۔

”ربیعہ!“ خیام نے زیر لب دہرایا۔ ”یہ نام بہت جانا پہچانا تھا۔“ اتنے دنوں میں وہ جان چکا تھا کہ ربیعہ، معاذ کی بہن کا نام ہے۔ جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہے۔ اس بار خیام کی نگاہ احتراماً جھکی۔
”چلو نا اب کیا بیس کھڑی رہو گی زری!“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر تقریباً کھینچتی ہوئی اندر چلی آئی۔
”انتابے نکا کیوں بولتی ہو تم؟ اچھا لگتا ہے کیا باہر کھڑے ہو کر اس طرح کسی سے بحث کرنا!“
”میں نے بحث نہیں کی، میں تو اس کی تعریف کی تھی۔ بے چارے نے کیسے پھرتی سے آپ کو بچایا!“
”اللہ بجاتا ہے!“ ربیعہ نے لا پرواہی سے ہاتھ ہلایا۔

”ہاں اگر زری ربیعہ تو بندوں کو ہی بتاتا ہے، جیسے مجھے دارالامان جانے سے بچانے کے لیے معاذ زریعہ بنے ویسے یہ لڑکا مجھے بہت دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔ شاید ادھر ہمارے پرانے محلے میں۔“ زری کی نگاہوں میں الجھن تھی۔ وہ دونوں احاطہ پار کر کے برآمدے کی سیڑھیوں کے نیچے آکر رکی تھیں۔
”آپ کو نام پتا ہے اس کا؟“ وہ ربیعہ سے پوچھ رہی تھی۔

”ان کا نام خیام ہے، معاذ کے اسکول میں ہی پڑھاتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔“
”خیام!“ زری نے نام دہراتے ہوئے یاد کرنا چاہا۔ ”خیام، خیام۔ ارے یہ تو وہی لڑکا ہے جو خالہ بتول کے ساجد کے پاس ایک آدھ بار آیا تھا تب ہی میں نے ایسے دیکھا تھا۔ ویسے ہے کتنا خوبصورت ہے نا؟“
زری نے اپنی الجھن مٹاتے مٹاتے ربیعہ سے رائے طلب کی۔

”پتا نہیں۔ میں نے بہت غور سے نہیں دیکھا۔“ وہ کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
”کیسے نہیں دیکھا، باہر اتنی دیر تو کھڑے ہو کر بات کی ہے۔“ زری پیچھے پیچھے آئی تھی۔
”دماغ خراب ہے تمہارا زری! کیا بات کی ہے میں نے، شاید ایک منٹ بھی نہیں لگا ہوگا۔“ ربیعہ نے جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کسی کو دیکھنے کے لیے تو ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے، آپ کو تو اچھا خاصا نام ملا تھا۔“ وہ اسے چھیڑنے پر تلی تھی، سو بحث سے پرہیز بہتر تھا۔

”میری بات غور سے سنو زری! اپنی زبان اور سوچ دونوں ہی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرو۔ بھابھی آ رہی ہیں چند دن میں۔ تمہاری یہ لڑکوں بوڑگوں کی باتیں انہوں نے سن لیں تو پتا نہیں۔“
بات دانستہ ادھوری چھوڑ کر ربیعہ آگے بڑھ گئی تھی۔
”بھابھی۔ ہونہ۔“ زری نے منہ بنا کر کہا جیسے کوئی کڑوی شے نگلی تھی۔



کورٹ کے پرچوم احاطے سے بمشکل راستہ بتاتی، فرید الدین تک پہنچی تھی۔
 ”ارے آپ میں تو صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ وہ اسے دیکھ کر کھل سا گیا۔ ”دوبارہ فون بھی کیا مسلمان کو بھی اور آپ کی بڑی بہن بھابھی گل کو بھی۔ انہوں نے بتایا کہ آپ خاصی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہیں غریب تو تھی نا؟“ وہ کسی قریبی عزیز کی طرح اپنی فکر کا اظہار کر رہا تھا۔ جو یا تو اس کے الفاظ اور لہجہ دونوں ہی سے سخت کوفت ہوئی تھی۔

”راستہ خاصا لمبا ہے وکیل صاحب! اور ٹریفک کا مسئلہ بھی۔ آپ بتائیں کیس کس وقت چلے گا۔“
 ”کیس تو نہیں چلے گا آج میں نے اگلی تاریخ لے لی ہے۔ تقریباً“ بیس بائیس دن کے بعد کی۔“

”کیا؟“ جو یا کو اپنی ساری ہمت رخصت ہوئی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے تو اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔

”میں نے سوچا ہے کہ اگلی پٹری تک ہمیں زیادہ وقت مل جائے گا میں نے کچھ لوگوں سے بات کی ہے اس بارے میں۔“ وہ ایک لہجہ حاصل سی تفصیل سن رہا تھا۔ جو یا نے مایوسی سے سر جھکا دیا تھا۔
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میں آپ کے لیے ٹھنڈا منگواتا ہوں۔ گری بھی تو بہت ہے۔“ وہ مہمان نوازی پر تنے لگا، مگر جو یا نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں میں چلوں گی۔ اگر آپ پہلے ہی بتا دیتے کہ آپ یہ کرنے والے ہیں تو میں آنے سے بچ جاتی۔“
 اسے آج کی چھٹی ضائع ہونے کا بھی رنج تھا اور اس سے کہیں زیادہ اظہار صاحب سے نہ مل پانے کا اور اس سے بھی زیادہ اس کیس میں کوئی بھی مثبت پیش رفت نہ ہونے کا۔

”ارے ایسے کیسے جاسکتی ہیں آپ تھوڑی دیر تو رکنا ہی پڑے گا آپ کو۔ مجھے آپ سے کچھ تفصیلات ڈسکس کرنی ہیں۔“

جو یا نے سوالیہ نگاہوں سے فرید الدین کی طرف دیکھا۔
 وہ بڑے اشتیاق سے اسی پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ آنکھوں کا گدلا پن ہونٹوں پر چھماتی سی مسکراہٹ سب ہی کچھ اتنا نمایاں کہ وہ سمٹ سی گئی۔

”مسلمان بھائی اگر آپ سے بات کریں گے مجھے جلدی ہے۔“
 اپنے گرد لپٹی چادر کو اور بھی مضبوطی سے تھام کر وہ جانے کے لیے مڑی، مگر وہ بڑی پھرتی سے سامنے آکھڑا ہوا۔
 ”مسلمان کو فرصت کب ملتی ہے۔ وہ نہیں آئے گا۔ یہ تو آپ مجھ سے لکھوائیں۔ یہ سب کچھ تو آپ ہی کو دیکھنا ہو گا مس جو یا!“ بات سچ تھی مگر ہاتھ نہیں جو یا کو کیوں ایسا لگا جیسے وہ اس کی حیثیت جتا رہا ہے۔
 ”مجھے پتا ہے کہ آپ بہت باہمت ہیں، ساری ذمہ داری آپ نے ہی اٹھا رکھی ہے۔ بھابھی گل آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں۔“
 فرید الدین کی بات ختم نہیں ہوئی تھی مگر وہ کچھ سننے کی خواہش مند نہیں تھی۔

”مجھے راستہ دیجیے پلیز!“
 ”لگتا ہے آپ ناراض ہو گئیں۔“ جو یا کے سخت لہجے نے اسے تھوڑا سا پریشان کیا تھا۔ جو یا اس کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ گوریڈور میں ہونے والے رش نے اسے تیزی سے آگے بڑھنے کی آسانی فراہم نہیں کی تھی۔
 فرید الدین چند کانڈاٹھائے اگلے چند لمحوں میں پھر اس کے اعصاب کا امتحان لینے کے لیے آچکا تھا۔

”یہ کچھ فون کا پتہ نہ کروا کر رکھی تھیں میں نے آپ کے لیے“ آپ اپنے پاس رکھی انہیں نکام کی ہیں۔“ اس بار اس نے ذرا پرو فیشنل سا انداز اختیار کیا۔ کیس کے سلسلے کے کچھ کانڈاٹ تھے نہ چاہتے ہوئے تھی جو یا کو لینے

کے لیے ہاتھ بڑھانا پڑا۔

”آپ بالکل فکر مت کریں میں آپ کے والد کی رہائی کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔“ کانڈاٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ جب کہہ رہا تھا تو جو یا نے اپنے ہاتھ پر اس کی انگلیاں سرسرائی محسوس کی تھیں۔
 شاید نادانستہ! اس نے اپنے کانٹے ہوئے دل کو سہارا دینے کے لیے حرف تسلی بھروسہ اٹھا۔
 فرید الدین کی نگاہ اس وقت تنگ جو یا پر جمی رہی جب تک وہ اس کی نظروں سے غائب نہ ہوئی۔

مگینہ نے بڑی آہستگی سے آگے بڑھ کر نانی ستارہ کا ہاتھ چھوا۔ بخار کا زور ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا، مگر وہ پھر بھی بڑی فکر مندی سے ان کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

دواؤں کے زیر اثر وہ اس وقت گہری نیند میں تھیں۔ مگینہ وہ بے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی تب ہی اسے برآمدے کے آخری سرے سے گلناز آتی دکھائی دی۔

گلناز کو زور سے ہنسنے اور زور سے ہی بولنے کی عادت تھی۔ یہاں تک آتی تو ضرور ہی نانی کے آرام میں مغل ہوتی۔ سو وہ تیزی سے خود ہی آگے بڑھ گئی۔

”سو کام پڑے ہیں آج کل تجھے تو پتا ہی ہے مگینہ! پر خالہ ستارہ کی فکر ایسی دل کو لگی کہ کہیں دل نہیں لگ رہا۔“
 وہ دور سے ہی بولتی ہوئی آ رہی تھی۔ جب سے نانی بیمار ہوئی تھیں وہ دن میں کئی چکر لگا رہی تھی اور اس کے اس خلوص پر مگینہ کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔

”اماں سو رہی ہیں گلناز! چل ہم اس طرف بیٹھتے ہیں۔“ مگینہ اسے لیے بچھلے مہن میں بنی سہ دری میں آ بیٹھی۔
 ”بس پانچ دس منٹ ہی بیٹھوں گی۔ یہ بتاؤ اکثر نے کیا کہا خالہ کی طبیعت کے بارے میں یہ اچانک ہی اتنا تیز بخار۔ ان کے تو کبھی سر میں بھی درد نہیں ہوتا تھا۔ ماشاء اللہ۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“

کچھ جھجکتے ہوئے گلناز نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔
 ”دیکھ! بہن ہوں تیری اور خالہ ماں کی جگہ ہیں بلکہ میرے لیے تو ماں سے بھی زیادہ مجھ سے مت چھپا مگینہ دیکھ بتا خالہ کو کیا نیشن ہوئی ہے؟“

مگینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ جس فکر مندی اور اپنائیت سے پوچھ رہی تھی اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ مگینہ نے بڑی صفائی سے نگاہ چرائی۔

”بتایا تو تھا تجھے ٹھنڈ لگی ہے اماں کو، بچھلے ہفتے سے بارش بھی تو کتنی پڑی ہے، اوپر سے شامانے والے بھرے پرائیوٹ کے لیے ان کے ساتھ آم اور لیموں کا اچار غورا ہی گلا پکڑ لیا۔ اب اس عمر میں کہاں برداشت ہو سکتی ہیں یہ سب چیزیں۔“ نانی کی بیماری کے بارے میں وہ اپنے گزشتہ بیان پر ہی قائم رہی۔ گلناز کو مایوسی ہوئی۔
 ”خالہ نے تو اچار بھی منہ میں نہیں رکھا تھا۔ ہم لوگوں پر بھی کتنا خفا ہوا کرتی تھیں۔ یاد ہے۔“

”انسان ہیں، کبھی تو دل چاہ ہی جاتا ہے۔“ مگینہ نے بات دانستہ بدلتی چاہی۔ ”تو سنا کچھ بات بڑھی الماس کی کیا کہہ رہا ہے وہ شادی کرے گا یا پھر۔“

گلناز نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”ابھی تو شادی کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی، دو چار دن ہی ہوئے ہیں آتے ہوئے، لیکن اس بار میں اس کی واپسی سے پہلے کوئی فیصلہ کرواؤں گی یہ تو میں نے سوچ لیا ہے۔ ویسے تجھے تو خائف تو بہت دیا ہے میں الماس کو اس نے پہلے سے بھی زیادہ۔“

گلناز کے لہجے میں امید اور بے یقینی کے درمیان والی کیفیت تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نگینہ بہت دلچسپی سے اسے کوئی مشورہ دے سکتی تھی مگر آج کل ہر بات سے دل اٹھا ہوا تھا۔ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہی نگناز نے بھی اس کی بے دلی کو بخوبی نوٹ کیا تھا سواٹھ کھڑی ہوئی۔

”پھر کسی وقت آؤں گی“ اس وقت تو مجھے بھی جلدی ہے اور تو بھی خالی کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہے۔ خدا کرے وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ وہ گلے مل کر رخصت ہونے لگی تھی۔ تب ہی کچھ یاد آیا۔

”گیتی کا فون آئے تو میری دعا پیار کہنا اسے کہنا بھی خالہ کو بھی یاد کر لیا کرے۔“ نگینہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

شاما چائے لے کر آئی تو وہ وہیں سہ وری کے تخت پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”باجی گلناز چلی بھی گئیں؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”ہوں! جلدی تھی اسے۔“

”ظاہر ہے جلدی تو ہوگی ہی۔ نیچے گاڑیاں جو آنا شروع ہو گئی ہیں۔“ شاما کی دی ہوئی اطلاع میں مسالا تھا مگر بہت سی باتیں وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی ختم کر رہی تھیں۔

”اماں کو پوچھنے آئی تھی بے چاری بڑی فکر مند ہے ان کے لیے۔“ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے نگینہ نے دھیرے سے اتنا ہی کہا۔

”ننانی نے بستر بھی تو ایک دم پکڑ لیا ہے باجی! کبھی ایسی بیمار نہیں پڑی تھیں۔ مجھے تو لگتا ہے نظر ہوئی ہے انہیں“ میں تو سوچ رہی ہوں کہ آج جا کر اتار کرنے والی کو لے کر آؤں۔ ساری رونق ان ہی کے دم سے ہے ہمارے گھر میں تو۔“

”مقام شکر تھا کہ ان کے ہاں محبتوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔“ گھونٹ گھونٹ لے کر چائے پیتی نگینہ کا دل بھر آنے لگا۔

صندل اٹھ گئی۔ اپنی جذباتیت پر آج کل وہ بار بار قابو پار ہی تھی۔ نانی ستارہ کی بیماری نے پچھلے دنوں میں ہونے والے سارے اچھے برے واقعات میں سب سے زیادہ اس کے دل کو دکھایا تھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ نانی ایک دم ہی کیوں۔؟“

”جائے تو جا کر صندل کو دیکھ اسے کسی شے کی ضرورت نہ ہو۔“ بے ساختہ بات کاٹتے ہوئے نگینہ کی آواز قدرے اونچی ہوئی تھی۔

شاما نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ نگینہ کی بد مزاجی، پھنکار، بد زبانی سب ہی کی وہ عادی تھی مگر یہ رنگ اجنبیت۔

کچھ تو ہے جو باجی نگینہ اور نانی دونوں کو پریشان کیے ہوئے ہے اور وہ بھی اتنا کہ۔ زندگی میں پہلی بار اسے نگینہ تک پہنچنا از حد مشکل لگا تھا۔ سہ وری سے نکلنے ہوئے اس نے مڑ کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سر جھکائے وہیں تخت کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں کیا۔ جو مجھ سے بھی چھپایا باجی نے۔“ تخت کے کنارے بیٹھی نگینہ نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر اپنی جھنجھکیاں رکھیں۔

کتنی راتوں سے وہ جاگ رہی تھی۔ نانی کی بیماری کے ان دنوں میں وہ بڑے بڑے پریشانی میں آئی تھی پاؤں تلے انکارے لیے جلتے ہوئے جو سفر اس نے کاٹا تھا۔ اس کی ساری ہمت اور طاقت نانی ستارہ سے ہی مستعار لی ہوئی تھی۔ وہی تھیں جن کی موجودگی کا احساس بڑا ہی عافیت بھرا تھا۔

”اور جو خدا نہ کرے اماں کو کچھ۔“ وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح خوف زدہ ہوئی۔

”ہذا فرق ہو اس یوسف کمال کا معلوم نہیں کہاں سے آگیا ہماری زندگی میں اتنے برسوں ہی کے بعد۔“

لوگ مرے ہوں گے اتنے سالوں میں یہ بھی کہیں مر چکا ہوتا پھر یوں زخم ہرے کرنے تو نہ آتا اور ساتھ میں اماں بھی تو اس منحوس خیام کی خبر ہماری بلا سے کہیں دھکے کھائے آجائے کسی گاڑی کے۔“

ہفتہ سے اوپر ہونے کو آیا تھا مگر کڑواہٹ تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی شاید اس لیے بھی کہ وہ اسے اب تک کسی کے بھی ساتھ شیر نہیں کپائی تھی۔ نانی ستارہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ یوسف کمال کی آمد کا ذکر کسی سے بھی نہ ہو شاما تک سے نہیں۔ سوا س سنسان وہ پر میں آیا یوسف کمال اب تک کسی برہکننگ نیوز کی طرح نشر نہیں ہو سکا تھا۔

”نانی اٹھ گئی ہیں آپ کو بلا رہی ہیں۔“

شاما نے دور سے ہی پکار کر اسے اطلاع دی تو وہ فوراً ہی اٹھ کر تیز قدموں سے برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

نانی ستارہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں، نگینہ کو آنا دیکھ کر ہلکے سے مسکرائیں۔

”اب کیسی طبیعت ہے اماں؟“ وہ کہتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھی۔

”ٹھیک ہوں شکر ہے خدا کا یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا نگینہ! مجھے تو تم بیمار لگ رہی ہو۔“

بیماری کی نقاہت ان کے لہجے میں نمایاں تھی مگر لہجے میں مخصوص سکون اور مضبوطی۔

نگینہ کو بخوبی اندازہ تھا کہ ان پریشانی بھرے دنوں میں وہ کتنی خستہ حال دکھائی دے رہی ہوگی مگر اپنی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کسے تھا۔

ان کے اطمینان کے لیے وہ مسکرائی۔ ”بس ایسے ہی اماں! اصل میں آپ بیمار تھیں تو بس دل ہی نہیں چاہا کسی بات کو۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

نانی نے بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ سر جھکائے پلکیں جھپک جھپک کر جس طرح وہ اپنے آنسوؤں کو بننے سے روک رہی تھی وہ انداز بڑا دل چھو لینے والا تھا۔

”ناگل ہوئی ہے کیا میری بیماری پر اس طرح ہوش حواس گم کرے گی تو جب میں مہلوں کی تہہ۔“

”تمہیں اماں! نہیں بس۔“ ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بے اختیار ہی نانی ستارہ کے گلے لگ کر روئی تھی۔

نگینہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی نانی ستارہ نے چند منٹ وائنتہ اسے رونے دیا۔ ”تو تو میری باہمت اور بڑے حوصلے والی بیٹی ہے نگینہ! سارے گھر کو سنبھال کر چلنے والی۔ میرا خیر میرا مان سب ہی کچھ تو ہے۔“ نگینہ کی ہچکیاں ہلکے ہلکے کم ہوئی گئیں۔ شاما نے خاموشی سے سائیڈ ٹیبل پر لاکر کپائی کا گلاس رکھا اور واپس پلٹ گئی۔

”میں اب ٹھیک ہوں سچ کہہ رہی ہوں سو تم بھی خود کو سنبھالو۔“

جب پانی کا گلاس ختم کر کے اپنی آنکھیں خشک کر چکی تو وہ کہنا شروع ہوئیں۔ ”دس مسئلے ہیں تمہاری توجہ کے منتظر۔ یہ بیماری آزاری تو چلتی رہتی ہے انسان کے ساتھ اب ہم گناہ گار بندے اتنے بھی مضبوط نہیں کہ ساری عمر ہمیں یہ چھوٹی مولی لکھیں نہ ستائیں ہم تو بہت کمزور لوگ ہیں نگینہ۔“

وہ سعادت مندی سے سر جھکائے سننے لگی۔

”چھاپہ تیار ہو گیتی کو تو میری بیماری کی اطلاع نہیں کی تھی نا؟“

”نہیں آپ نے منع جو کر دیا تھا۔“

”بہت اچھا کیا یہاں کی ذرا ذرا سی باتوں کی وہاں اطلاع دینا مناسب ہے بھی نہیں۔ گیتی آنے کی ضد کرتی پتا نہیں سالار کے لیے بھی ابھی اسے لانا آسان بھی ہو گیا نہیں۔“

”اور یوسف کے آنے کا بھی۔ کسی کو بتایا تو نہیں تاہم نے؟“ ان کے لہجے میں پھر سے اضطراب تھا۔
”مت نام لیں اس کینے کا؟“ پتا نہیں کہاں سے آرا سو ہی بیمار ڈال کر گیا ہے آپ کو پہلے ہمارے گھر کو آگ لگا چکا ہے اب پھر رخ کیا ہے یہاں کا؟“ گلی بار آیا تو ہاتھ پاؤ تڑوا کر گلی سے باہر پھینکوا دوں گی۔“ وہ تلملا ہی تو گئی۔
”میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“

”نہیں! مگر میں صاف کہہ رہی ہوں کہ آئندہ اسے یہاں نہیں سمھنے دوں گی اور نہ ہی اس بد بخت خیام کو۔ اگر وہ کبھی آیا۔“ نانی کی طبیعت سننے کے ساتھ ہی عجیب کی ساری کڑواہٹ اس کے لہجے اور الفاظ دونوں میں گھلنے لگی تھی۔ نانی ستارہ نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔

”بتاؤ گیا ہے اس کا باپ کہ وہ دیکھ چکا ہے اسے وہاں سڑکوں پر رلتے ہوئے کہاں بھٹک رہا ہوگا؟ کیسے کیسے عذاب سے چکا ہوگا بھانجا ہے تمہارا عجیب! ایمان داری سے کہو کہ دل نہیں دکھتا کیا؟“
”نہیں! میرا نہیں دکھتا“ یوسف اور فیونہ جیسے خود غرضوں کی اولاد ہے خیام اس کے ساتھ جو بھی ہو وہ کم ہے۔“

وہی زہر بھری کڑواہٹ وہی سخت دل۔ عجیب نانی ستارہ کی بیماری و بیماری سب کچھ بھولنے لگی۔ ”اور اماں“ اتنے سال بعد اگر یوسف نے اسے برے حالوں میں دیکھا ہے تو یہ قدرت کی سزا ہے۔ اب اسے اپنے بنگلوں، گاڑیوں میں ایک بل کا بھی چین نصیب نہیں ہوگا میں تو دعا کرتی ہوں کہ ساری عمر اسے خیام نہ ملے پاگل دیوانہ ہو کر مرے ہماری طرف سے۔“

نانی ستارہ نے بے ساختہ اپنے ماتھے کو چھوا۔ ”تو نہیں بدلے گی عجیب! قدرت کا اپنا حساب کتاب ہے جب یہ سمجھتی ہے پھر کیوں اپنی رائے اپنی بددعا مسلط کر رہی ہے خیر کے الفاظ منہ سے نکلا کر۔“
”تو آپ کیوں گئی تھیں اس یوسف کے پیچھے کہ خیام مل جائے تو وہ اسے آپ کے پاس لے کر آئے۔ کیا ضرورت تھی خود کو کمزور دکھانے کی۔“

ہفتہ بھر سے دل میں پن کی طرح چھپی بات گلے کی صورت عجیب کے لبوں پر آئی۔
”میں اسے ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں عجیب! گلے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں پھر چاہے وہ کبھی نہ آئے۔ رہے اپنے باپ کے پاس خوش و خرم میری فیونہ کی روح کو چین آجائے گا بس۔“
ان کے چہرے پر خیام اور فیونہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے جیسی محبت بھری چمک پھیلتی تھی عجیب کو ہمیشہ ہی منہ چراتی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

”مری ہوئی فیونہ کی روح کی بھی فکر اور میں جس نے اپنی بڑیاں گھلا ڈالیں میرے لیے بس پیار بھری تھکی؟“
اگر نانی ستارہ کی بیماری کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ شاید فوراً ہی الجھن جتا بھی دیتی مگر تبھی مندل کمرے میں چلی آئی۔
”کیسی ہیں آپ نانی!“ وہ سیدھی ان کے گلے آکر گئی۔ نانی ستارہ نے بڑی محبت سے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔

مندل آج بہتر موڈ اور بہتر چلے میں تھی۔ نانی اور عجیب دونوں ہی کو اچھا لگا تھا۔
”آج صبح ہی مجھے پتا چلا ہے کہ بلی نے اس نئی لڑکی کو اپنے دونوں پروجیکٹ سے الگ کر دیا ہے اور اب وہ مجھے ہی سائن کرنے والے ہیں۔“ وہ کسی ٹیلیفونک خوش خبری کی اطلاع نانی کو دیتے ہوئے بڑی مطمئن محسوس ہو رہی تھی۔

خبر اچھی تھی لیکن نامکمل اور غیر مصدقہ!

”میں نے بتایا تمہیں؟“ الجھن بھڑے انداز میں عجیب نے مندل کی طرف دیکھا۔ ”لوگ یوں ہی اڑاتے بھی ہیں۔“

”مخالفت کیمپ سے ہی خبر آئی ہے۔ ہیں وہاں میرے بھی کچھ خیر خواہ“ آپ ہر وقت یوں ہی شک مت کرتی رہا کریں ہر ایک پر۔ ایک مقام ہے میرا عجیب مشنری میں مجھ سے مذاق کی ہمت سہر چل نہیں ہے کسی میں۔“
مندل کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ عجیب کی آنکھوں میں ابھی بھی الجھن پائی تھی۔

”یہاں کوئی کسی کا خیر خواہ نہیں ہے۔ یہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی کیا تمہارے؟“
مندل نے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے عجیب کی بات کو رد کیا۔ خود نانی ستارہ کو بھی اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔

”ماں کی بات کو سنجیدگی سے لو مندل! اس کا تجربہ انڈسٹری کے بارے میں تم سے کہیں زیادہ ہے بلکہ تمہارے خیر خواہوں سے بھی زیادہ۔“
عجیب نے تشکر بھری نگاہ سے نانی ستارہ کو دیکھا لیکن نمبروں کی دعوے دار کے لیے فی الوقت کوئی نصیحت کارگر نہیں تھی۔

اس کے چہرے سے وہ طنزیہ سی مسکراہٹ بھی غائب ہوئی۔
”زمانہ بہت بدل گیا ہے نانی! وہ اسی بے چاری کا تو کیا تجربہ۔ ساری زندگی ایکسٹرا میں دھکے کھاتے گروپ ڈانس کی آخری لائن میں کھڑے ہوتے کے لیے بھی منتیں خوشامدیں ہیوٹن کے انتظار میں گھنٹوں سوکھنا ان کا تجربہ تو یوں ہی ڈرا سہاؤ سوسوں سے بھرا ہی ہونا ہے نا۔ مگر یہاں تو شکر ہے کہ پہلی فلم ہی سپر ہٹ ہوئی ہے نمبروں ہیوٹن تسلیم کیا گیا اور۔“

”ہالو! لیکن اس غریب کم وقت ملاں کی جوتیوں کے صدقے سے۔“ نانی ستارہ کے انداز میں بڑی ہی تکلیف وہ چھین تھی۔ مندل کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔
”شاما! شاما!“ مزید کچھ اور کہنے سے نانی ستارہ نے شاما کو آواز دی تھی آج ان کی آواز میں آیا بدلاؤ شاما کو بھی سر پٹو ڈاکر لایا تھا۔

”جی نانی!“
”وہ لفافہ مندل کو دے دو جو چھوٹے پہلے بلی کا ڈرا یوروے کر گیا تھا۔“
”کیسا لفافہ اماں! مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا آپ نے۔“

شاما کو نانی کی الماری کی طرف مڑا تو عجیب نے حیرت سے نانی ستارہ کو چھوڑ دیا۔ ”خاموش ہی رہیں۔ ان کے اشارے پر ہی وہ لفافہ مندل کو پکڑا کر شاما خاموشی سے باہر نکل گئی۔
عجیب بے تابی سے مندل کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
کوئی بر بقاء قرضہ کے کاغذات ملازمین کی بقاء تنخواہیں پس وہ رقم جو مندل کے اخراجات کی مدد میں مندل کی طرف نکل رہی تھی اور منصف خشتہ کا ٹریکٹ۔

مندل کے چہرے پر آنسوؤں کی باوریک سی لکیر پھیل رہی تھی ایک بار پھر پاؤں تلے سے میڑھی کھینکے کا تکلیف دہ تجربہ۔
عجیب کا دل بری طرح دکھلا۔ ”کیا تھا جو اماں! یہ سب مندل سے چھپا لیتیں۔“ مندل کی ساری نافرمانی اور قہر کی لکیر بھلا کر اس نے شکایت بھری نگاہاں پر ڈالی۔

”زندگی بلی کی فلموں سے کہیں آگے نکلنے والی شے ہے۔ میں نے صرف تمہاری دل شکنی کے خیال سے نہیں

بتانا چاہتا تھا مگر اب چھپانا بھی بے سود تھا۔
 نالی ستارہ مندل سے مخاطب تھیں۔ ”سب سے پہلے اپنے پاؤں زمین پر ٹکاتا اور سر کو جھکانا سیکھو مندل اور نہ
 بار بار کرتی رہو گی۔“ کمرے میں اب صرف ان ہی کی۔ آواز کی گونج تھی۔

”جیوا! شاکرہ امی نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی تو دھوپ کی روشن لکیر کھلے دروازے سے کمرے
 کے وسط تک چلی آئی۔
 شاکرہ امی اسی لکیر پر چلتی ہوئی اندر آئیں اور اس کے قریب آکھڑی ہوئیں۔
 ”ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“

”جی! اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی طرف۔
 بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے خالی الذہن کے عالم میں وہ کب سے اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی، سوسپہ کوئی
 ایسی قابل اعتراض بات تو نہ تھی۔
 ”بھائی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ تیز بخار چڑھا ہے غریب کو، کل کب سے بیٹھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی ہے مگر
 تم نے آکر جھانکا تک نہیں کہ گھر میں کیسی پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔“ زوسپہ کی طرف سے آئے نوٹس کا عم تا حال
 تازہ تھا۔

بات شکوہ سے شروع ہوئی اور اس کی کوتاہی کو ختم ہوتے ہوئے ختم ہوئی۔ اور ختم بھی کہاں۔؟
 ”اور کچھ نہیں تو گل کو ناشتا ہی بنا دیتیں، صبح سویرے کی آئی بیٹھی ہے اب ساڑھے دس بج رہے ہیں۔“
 ”میں سمجھی وہ ناشتا کر کے آئی ہیں۔“
 ”بھائی کی پریشانی میں کہاں کھایا گیا ہو گا اس سے۔ تم خود ہی ہر بات فرض کر لیتی ہو، کم از کم پوچھ ہی لیتیں اس
 سے بڑی۔ صبح ہے آخر۔“ اس کا بے تاثر سا انداز شاکرہ امی کو اور بھی کھلاتا تھا۔

جیوا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ ان کا اپنا گھر ہے امی! ناشتا کھانا جو چاہیں خود بھی بنا کر کھا سکتی ہیں۔“
 شاکرہ امی کچھ گڑبڑ سی گئیں۔ جیوا کی بات سے متفق ہونے کا مطلب آنے والے دنوں میں اس کی مستقل
 خدمت گزاری سے ہاتھ دھو لینے کے مترادف تھا۔

”تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس لیے تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں شادی شدہ بیٹی کی حیثیت سہمان
 کی سی ہوتی ہے، از خود کچھ بھی کرنے سے وہ جھجکنے لگتی ہے۔ گل بے چاری بھی بظاہر کتنی فری ہو، لیکن پھر بھی
 ہے تو اب پرانی۔“

معلوم نہیں وہ کیوں بحث کر رہی ہے جبکہ جانتی بھی ہے کہ اس کی ہر بات خواہ وہ کتنی درست ہو، اسی طرح رد
 کرتی جاتی رہے گی۔ اس بار سر جھکا کر اس نے صرف اتنا ہی سوچا تھا۔
 ”چلو اٹھو، ناشتا بنا لو، میں نے نیچے والوں کے لڑکے سے گوشت بھی منگو لیا ہے، دوپہر کے لیے بھی کچھ اچھا سا
 پکاؤ، سلمان بے چارہ شاید تھوڑا بہت کھا ہی لے، پسند کی چیز دیکھ کر ورنہ تو۔“

سلمان کی حالت زار کے خیال سے ان کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔ سو وہ بات ادھوری چھوڑ کر آنسو صاف کرتی
 ہوئی واپس باہر نکل گئیں۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔
 چند لمحے یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے اندر آتی دھوپ کی اس چمکتی لکیر کو دیکھ گئی۔
 زوسپہ کی طرف سے آئے خلع کے نوٹس کے بعد گھر میں جو رنج و غم کی سی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس میں اب

تک کوئی کمی واقع ہونے کے آثار نہیں تھے۔
 سلمان کی تو خیر شاکرہ امی کے بقول زندگی ہی برباد ہو گئی تھی، لیکن تپا گل بھی اپنی ابتدائی خوشی پر شرمندہ ہو کر
 اب اس کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔ زوسپہ کے ساتھ سلمان کی مصاحبت سے انہیں اپنے ٹیکے کا گرتا ہوا
 مورال بہر حال اوپر ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سوا بیہ امید بھی بھارت ہوئی تھی۔
 گھر میں صرف زوسپہ تھی جو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئی تھی۔ جیوا کے لیے اب
 سب ہی کچھ یکساں تھا۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ سلمان کے کمرے کے دروازے میں سے شاکرہ امی اور تپا گل دونوں ہی نے اسے
 کچن میں جانا دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

”خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہی کرتا ہے اب یہی دیکھ لیں کہ اگر اس وقت جیوا کی شادی اس کم بخت اعجاز کے ساتھ
 ہو گئی ہوتی تو اس وقت اس گھر کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ ابو جیل جا کر بیٹھ گئے اور بے چارہ سلمان۔“
 تپا گل نے سلمان کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر تھوڑا سا غافل ہوا تھا۔

”خیر وہ تو وقت ہی اور تھا، کیا پتا جیوا کی شادی ہو گئی ہوتی تو تمہارے ابو کے خلاف مقدمہ بھی نہیں بنتا۔
 سارے معاملات درست بھی تو رہ سکتے تھے، یہ مستقل جگہ ہنسائی تو نہ ہو رہی ہوتی۔ کیسی سہل زندگی ہوتی۔“
 شاکرہ امی کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

”سارا زمانہ رشوت لے رہا ہے، کیا حکمران کیا عوام، مگر سب چین کی بانسری بجاتے ہیں۔ ایک ہمارا ہی گھر ہے،
 جہاں سب کام بے عقلی کے ہوتے ہیں۔ ابو بھی اگر ذرا سمجھ داری سے کام لیتے تو یہ کچھ نہ ہوتا۔ جواب سب
 بھگت رہے ہیں۔“

اب سارے بچھتاوے بھی گئی گزری سی بات لگتے تھے۔ شاکرہ امی جو پہلے اولاد کی اس بے چہری اور نا شکر پر اپنی
 خفگی کا اظہار کر لیا کرتی تھیں اب خاموش رہنے لگی تھیں۔

ان کی حیثیت اب معذول ملکہ کی سی تھی۔
 ”ہرالی کمات ہے کہ نہ پریشانی بھی اکیلی آتی ہے، نہ خوشی، دونوں ہی کے ساتھ مزید سامان بندھا چلا آتا ہے،
 خوشی کا بھی اور تکلیف کا بھی۔ ہمارے اپنے گھر کی مثال سامنے ہے۔“

ادھر ادھر سے بڑھی اور سنی گئی باتوں کو تپا گل مہارت سے اپنے مطلب معنوں میں استعمال کر لیا کرتی تھیں۔
 مگر اس وقت یہ کس بات کی تمہید تھی؟

شاکرہ امی نے بے تاثر سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
 ”اب یہی دیکھ لیں، ابو کی گرفتاری، گھر کا بلتا، زبور سامان کا بک جانا اس منحوس جہانے کو بھرے میں ہی کیا کم تھا
 کہ سلمان بھی اپنی برباد زندگی لیے واپس آگیا۔ پتا نہیں کیا لکھا ہے اب اس غریب کی قسمت میں، فی الحال تو کوئی
 اچھی امید نظر نہیں آتی۔“

ان کے الفاظ اور لہجے میں ایسی ہی رقت اور مایوسی تھی، جیسی کسی مظلوم اور لٹی پٹی لڑکی کے لیے ہو سکتی تھی۔
 سر کو تھامے بیٹھی شاکرہ امی نے ایک سر دھو بھری۔

”بڑا ہی خطرناک سفلہ کروایا ہے اس بار دشمنوں نے۔ سختی ہے کہ ٹل ہی نہیں رہی۔ ابھی آگے اور کیا دیکھنا
 للہا ہے۔ کچھ پتا نہیں۔“ اتنی سی بات کے دوران ہی ان کے حلق میں آنسوؤں کا پھندہ اسکا گھا۔

جتنی دیر میں انہوں نے سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر ختم کیا، تپا گل پر سوچ سی نگاہوں سے ان کی شکل
 دیکھ گئیں۔

”خود کو سنبھال لے اب ساری عمر دے ہی تو نہیں رہتا“ آگے کی فکر کریں ہی ہمارے گھر کی بہتری کے لیے کوئی بڑا قدم خود اٹھانا ہو گا کوئی ایک راستہ کھل گیا تو سمجھ لیں راستے پر راستہ کھلتا چلا جائے گا۔“
وہ باتوں باتوں میں پہلی بوجھنے لگیں ”شاکرہ امی کی ذرا جو کچھ سمجھ میں آیا ہو۔“ پہلے تمہارے ابو جیل سے چھوٹیں اس کے بعد ہی کچھ۔“

”جب آتا ہو گا آجائیں گے وہ اب اپنے ہاتھ میں تو ہے نہیں“ قانونی معاملہ ہے آخر۔“ آپاگل جھنجھلا سی گئیں۔ جو بات وہ کرنے جارہی تھیں اس میں اظہار صاحب کی قید یا رہائی کوئی حتمی نہیں رکھتی تھی۔ ”اب ان کے انتظار میں زندگی کے باقی سب کام روک تھوڑی لیے جائیں گے۔ آپ بھی باہر۔“
بہت قریب سے مزے دار سی خوشبو آ رہی تھی۔ بات ادھوری پھوڑ کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ جو ابڑے لیے کمرے میں آئی تھی۔

پراٹھے، چار شامی کباب اور غالباً ”ایک انڈے کا آلیٹ۔“ آپاگل نے ایک نگاہ میں جائزہ لیا۔
”یہ کباب کب بنائے تھے؟“

”دو تین دن پہلے بنا کر فریز کیے تھے امی نے بتایا کہ آپ نے ناشتا نہیں کیا تو۔“
”ہن ہو تو تم جیسی۔ دیکھا امی! جو اب کو کتنا خیال ہے میرا“ یہی بے چاری ہے جو سب کی فکر کر لیتی ہے ورنہ تو آپ کے ہاں ہمیشہ نفسا نفسی کا ہی دور رہا ہے۔“ ہاتھ پکڑ کر جو اب کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے آپاگل کے منہ سے ایک سچ بے ساختہ ہی ادا ہوا تھا۔ جو اب نے غیر محسوس انداز میں ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ آج کل وہ پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف رویہ رکھے ہوئے تھیں۔ اتنا مختلف کہ جو اب کو خوف سا آنے لگا تھا۔

”بہت ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔ دیکھ لیتا تمہارا شوہر بہت خوش رہے گا تم سے۔ مرو چاہے جیسے بھی ہوں“ اچھا کھانا پکانے والی بیوی کی ہمیشہ قدر کرتے ہیں۔“
ان کا اپنا کبھی کچھ سے کوئی خاص ربط نہیں رہا تھا، مگر وہ پھر بھی اکبر بھائی پر برسوں سے راج کر رہی تھیں اور بہت سی باتوں کی طرح جو اب انہیں یہ بھی نہ یاد دلا سکی۔ چپ چاپ انہیں کباب پر انھوں کا صفایا کرتے دیکھے گئی۔
”کل فرید بھائی آئے تھے ہمارے ہاں خاص طور پر۔“

”کون فرید بھائی؟“ اسے بالکل یاد نہیں آیا کہ خاندان میں اس نام کا کوئی شخص ہے۔ آپاگل کو اس کی غیر حاضر دماغی پر ذرا سا افسوس بھی ہوا۔ ”فرید الدین ایڈووکیٹ۔“
جو اب نے بے ساختہ نچلا لب و لہجہ دانت تلے دبایا۔

یہ نام آپاگل کی باتوں میں آج کل بار بار آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ یاد نہیں رکھ پا رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ انہیں وکیل صاحب کہتی تھی اور اس لیے بھی کہ وہ لوگوں کے چہروں اور ناموں کو یاد رکھنے کی قطعی خواہش مند نہیں رہی تھی اور خاص طور پر یہ نام۔ اور یہ چہرہ۔

”بے چارے بہت ہی اچھے آدمی ہیں“ جب بھی آتے ہیں بچوں کے لیے چاکلیٹ اور جوس کے ڈبے ضرور لے کر آتے ہیں۔ کل تو تم لوگوں کے لیے بھی لے کر آئے تھے یہ لو۔“ انہوں نے ذرا رک کر اپنے ساتھ لائے ہوئے شاپر میں سے چند پکٹ نکال کر میز پر بڑے فخریہ انداز میں رکھے۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ یہ آپ کی بہنوں کے لیے ہیں خاص طور پر۔“

”کیوں ہمارے لیے کیوں؟ آپ کو ان سے لینے بھی چاہیے تھے واپس کر دیجئے گا فوراً ہمارا کوئی ایسا تعلق نہیں کہ وہ ہمارے گھر کچھ بھیجیں۔ ان کی بہت کیسے ہوئی؟“
جو اب ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔

شاکرہ امی اور آپاگل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور آواز قدرے اونچی۔
”آپاگل کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی پڑی تھی۔“

”تعلق بنائے جاتے ہیں“ تم تو بے کار میں جذباتی ہو جاتی ہو۔ ارے مذہب میں بھی ایک دوسرے کو تحفے کاائف دینے کو پسند کیا گیا ہے۔ اگر بے چارے فرید الدین نے دو چار چیزیں بھجوادیں تو کون سی قیامت آگئی۔“
”آپ یہ چیزیں ابھی اسی وقت یہاں سے لے جائیے گا۔ اپنے بچوں کو دیں یا اس آدمی کو واپس کریں۔ مگر ہمارے گھر میں اس حوالے سے کچھ مسئلہ لائے گا۔ یہ میں آپ سے آخری بار کہہ رہی ہوں۔“
وہ ان کے وضاحتی بیان سے ذرا بھی متفق نہیں ہوئی بلکہ ایک عرصے بعد اس کا وہی اکھڑا اکھڑا سا انداز سامنے آیا تھا۔ جس سے انہیں سخت نفرت تھی۔
”تمیز سے بات۔“

اس نے انہیں بات پوری کرنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ بڑی تیزی سے صحن سے گزرتی ہوئی اپنے اور زویا کے مشترکہ کمرے کی طرف گئی اور دروازہ خامے زور سے بند ہوا تھا۔
شاکرہ امی نے بے ساختہ ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔

”دیکھ رہی ہیں نا اس کے انداز“ آ رہی ہے واپس اپنی بد تمیزیوں پر مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ معاذ سے باہر کا ملنا جلتا رنگ لا کر رہے گا ہر بار وہی اس کے دماغ کا فتور بنتا ہے۔“
آپاگل کی آواز غصے سے پھٹی جارہی تھی۔ سلمان اس سارے شور شرابے میں پوری طرح اٹھ چکا تھا اور صورت حال سے واقف بھی۔

”خیر معاذ کا تو نام مت لو کہاں ملتی ہے وہ اس سے“ وہ تو بس کورٹ میں ہی۔“ شاکرہ امی کی طرف سے کمزور سی صفائی کی کوشش بھی رائیگاں گئی، آپاگل کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
”کورٹ کی ملاقات پر ہی تو باہر بند کی لگ گئی ہے فرید الدین کے آنے سے“ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں آخر۔ یہ بچی کبھی عزت رہ گئی ہے۔ اسے بھی داؤد پر لگانے والی ہے یا پھر لگا ہی چکی۔“

ان کے لہجے میں غصہ کی سرد مہری اور یقین تھا۔ شاکرہ امی نے بنا کچھ کہے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔
”جان سے مار دوں گا میں اس جو اب کو“ چاہے پھر مجھے بھی جا کر جیل میں بیٹھنا پڑ جائے۔“ وقتی طور پر اپنا غم بھول کر سلمان اٹھ بیٹھا تھا اور اتنا بڑا دعو کر کے فرید الدین کی لائی ہوئی چاکلیٹ کا ڈبا کھول چکا تھا۔
”تو ہی کوئی راہ نکال گل! میرے تو بس کا کچھ بھی نہیں“ یہ پھر سے معاذ کا قصہ کیوں آلیا ہمارے بیچ۔ تمہارے ابو نے کچھ ایسا دیا سن لیا تو۔“ حسب معمول شاکرہ امی کے اعصاب نے جواب دینا شروع کیا تھا۔

آپاگل نے دانستہ چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی۔ ان کے حسب مرضی ماحول ایک بار پھر بچن چکا تھا۔
”فرید الدین ابو کے کیس پر بڑی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ انہوں نے خبر شری۔
مگر سلمان ایک دم ہی ہنس پڑا۔ ”فرید الدین خرچ کرے گا“ حال دیکھا ہے اس کا۔ بالکل پھیپھر۔ تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے آپاگل!“

آپاگل نے ایک تھراؤ نگاہ سلمان پر ڈالی۔ جو بات وہ کرنے جارہی تھیں، سلمان کے منہ لگنے سے اس سے لہا لہا ہم تھی۔
”ڈیڑھ کروڑ سے اوپر کی زمین بیچی ہے ابھی اس نے اپنی ادھر اندرون سندھ میں۔ سادگی سے رہنے کا عادی ہے“
اب اسے اس وکالت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو یہ کیسے کہ مہا کنجوس ہے۔ ایسا آدمی جو خود پر خرچ کرنا نہیں جانتا“ وہ ابو پر فی سبیل اللہ تو نیکی کرنے سے

رہا۔ "سلمان لب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔
تپاگل کے چہرے پر اس بار پراسراری مسکراہٹ ابھری تھی۔
"ٹھیک کہا تم نے سلمان! فرید الدین بھی نیکی نہیں، کاروبار کر رہا ہے۔ جو یا کارشتہ مانگا ہے اس نے بدلے میں۔"

سلمان اور شاگرہ امی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں ہی کے چہروں کے تاثرات کچھ ایسے خوشگوار نہیں تھے۔
"خیر جو یا سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، یہ بات تو رہنے ہی دیں۔" سلمان نے بے زاری سے ہاتھ ہلا کر فی الفور تپاگل کی بات کو روک دیا۔
"اور ویسے بھی فی الحال تو جو یا نے گھر سنبھال رکھا ہے۔ وہ چلی گئی تو ہم سب کیا ہوا پھا نکلیں گے۔ اوپر سے ابو بھی یہاں گھر آکر بیٹھ جائیں گے خالی ہاتھ۔" اس کے اپنے تحفظات تھے۔
تپاگل کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ انہوں نے بات شروع ہی غلط نوٹ سے کی تھی۔
گھر میں اب اظہار صاحب کی رہائی ترجیح نہیں تھی بلکہ بتا کسی رکاوٹ کے گھر کے اخراجات کا پورا ہونا تھا۔
سلمان اب جس بے نیازی سے چاکلیٹ کھا رہا تھا صاف لگ رہا تھا اپنی طرف سے وہ یہ قصہ ختم کر چکا ہے۔
مگر پچھرا بھی باقی تھی۔

"فرید الدین کے وفلیٹ ہیں، تین بیڈروم والے، ایک وہ تم لوگوں کو دے دے گا اور شاید ایک چھوٹی سی گاڑی بھی۔ اور بھی سپورٹ کر سکتا ہے، مگر پہلے بات تو کی جائے۔" سلمان کا منہ کی طرف جاتا ہوا ہاتھ یک بار کی رکا تھا۔ تپاگل کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ اتری۔
"اور ویسے بھی زندیا کا بھی یہ آخری سال ہے میڈیکل کا پھر تو وہ جو یا سے کہیں زیادہ اگلی کمانڈے گی۔ اب تو فکر کی ایسی کوئی بات نہیں، میرا تو خیال ہے کہ ایک بار فرید الدین کے بارے میں غور کر لینے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

اس بار وہ چپ رہا۔
"ہمیں حالات کو درست کرنے کے لیے کوئی بڑا قدم اب اٹھانا ہی ہو گا سلمان! ورنہ ساری زندگی کے لیے یہی خستہ حالی مسلط رہے گی۔ اب تو تمہارے پاس بھی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ ذرا عقل سے کام لو میرے بھائی! میں تم لوگوں کی دشمن نہیں۔" وہ سرک کر سلمان کے قریب ہو کر بیٹھی تھیں۔ ان کی محبت اپنائیت بھی اپنی جگہ حقیقت تھی۔

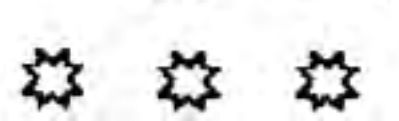
"مگر جو یا۔۔۔ وہ کہاں راضی ہوگی دیکھا تو ہے نا؟ ابھی کتنی ناراض ہو کر گئی ہے۔ جبکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔" سلمان کی نیم رضامندی ظاہر ہو رہی تھی۔
"اے بھی سمجھنا پڑے گا۔ یوں ہی کب تک وہ کھائے گی۔ کوئی اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ پیسے والا شوہر ہو گا تو عیش آرام سے رہنا اسے بھی سب کچھ بھلا دے گا۔ میں اپنی بہن پر الزام بھی نہیں لگانا چاہتی، مگر خود سوچو جو ان لڑکی ہے اگلی حالات کا دباؤ سہہ رہی ہے۔ کسی کے ورغلائے میں آسانی سے آسکتی ہے۔"

وہ جو یا کا بھی بھلا ہی چاہتی تھیں۔ سلمان کو اس بار پورا یقین ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے، غور کر لیتے ہیں اس بات پر، آپ بھی ذرا اس آوی کو چیک کریں کہ واقعی وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"اگر کبر کی پرانی دوستی ہے۔ خود ہر بات کی پوری ذمہ داری لے رہے ہیں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔"

ٹھوک بجانے والے انداز میں انہوں نے اپنی طرف سے بات کو نقطہ اختتام پر پہنچایا۔ "تم اور امی کسی دن

پل کر ان کا گھر بھی دیکھ لو، کیوں امی! ٹھیک ہے نا؟"
اتنی دیر میں پہلی بار وہ شاگرہ امی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ عرصہ ہوا گھر کے منظر نامے سے حاضر غائب کی کیفیت میں تھیں۔ بے تاثر سے انداز میں سر ہلا کر رہ گئیں۔



معاذ آج بہت خوش تھا۔

اپنی ذاتی خوشی کو بالائے طاق رکھ دینے کے بعد طول عرصے سے وہ صرف اجتماعی خوشیوں پر ہی خوش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سو آج کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ اسے کوشش بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔
"میرا سب سے دیرینہ خواب۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی پورا ہو جائے گا۔ میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔" اس ہزار گز کے ڈبل اسٹوری گھر کے آگے کھڑے ہو کر اس نے پورے دل سے سالار سے کہا تھا۔ جواب اسکول کے لیے مختص ہونے کے لیے تیار تھا۔
جواب "سالار نے مصنوعی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تھا، معاذ ہنسنے لگا۔
"اچھا! نہیں کہتا شکریہ، لیکن اب یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے، پورا بورڈ بنے گا جو اس کو چلائے گا۔ چیئر مین آپ ہوں گے اور افتتاح بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔"

سالار نے لاپرواہی سے نفی میں سر ہلایا۔
"نہ میں چیئر مین بن رہا ہوں اور نہ ہی افتتاح کر رہا ہوں۔ یہ دونوں کام اسلام انکل ہی کریں گے۔ وہی ڈیزو بھی کرتے ہیں۔"

"آپ سے ہی کروائیں گے۔ یہ ان کی خواہش ہے کہ آپ اور گیتی بھابی دونوں ایک ساتھ اس فنکشن میں آئیں۔"

"گیتی کی اچھی کمی اس کا بس چلے تو وہ آج سے ہی تمہارا اسکول جوائن کر لے ویسے یہ مجھے پتا ہے کہ وہ بہت اچھی نیچر ثابت ہوگی۔ بچے جلد ہی اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ بہت ہی سوفٹ نیچر ہے اس کی۔"

گیتی کا ذکر کرتے ہوئے جو خوشی سالار کی آنکھوں میں اتری تھی، معاذ نے بخوبی نوٹ کی تھی۔
"بہت محبت کرتے ہیں آپ گیتی بھابی سے۔"

"ہاں! وہ خوش دل سے مسکرایا "اتنی کہ اگر وہ مجھے نہ ملتی تو شاید میں یہاں کھڑا ہوا بھی نہیں نہ ملتا۔ کھو جاتا کیس دنیا کی ان بھول بھلیوں میں زندگی کے کوئی اور مطلب معنی نہیں تھے میرے پاس معاذ!"

"بہت سے لوگ اپنی زندگی کے مطلب معنی کھو دیتے ہیں سالار! اگر ان کے پاس تو کھو جانے کی آسانی بھی نہیں ہوتی، آپ شاء اللہ خوش قسمت ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

بات کے اختتام تک وہ اپنی افسردگی پر قابو پا کر پورے خلوص سے مسکرایا۔ سالار بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم نے کسے کھویا ہے؟"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا، ایسے ہی ایک مثال دے رہا ہوں۔" وہ دانستہ ذرا سا رخ موڑ کر اس عمارت کو دیکھنے لگا، جواب اسکول کی ملکیت تھی۔

"مجھے بے وقوف سمجھتے ہو یا پھر اعتبار نہیں کرتے؟ ہوں!" معاذ نے بے اختیار ہی پلٹ کر سالار کی طرف دیکھا۔

”اگر آپ پر بھی اعتماد نہیں کروں گا تو میری بد قسمتی میں کیا شک رہ جائے گا مگر آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت مدت بعد اتنا سکون بھرا احساس حاصل ہوا ہے اور یہ آپ کی وجہ۔“

”اف!“ سالار نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ”میرا خیال ہے اب ہم دونوں کو چل دینا چاہیے کیونکہ میں اب ایک بار پھر تم سے اپنی تعریف سننے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔“ معاذ بے اختیار ہی ہنس پڑا۔

”چلیں پھر ٹھیک ہے کل بول ملتے ہیں ان شاء اللہ۔“

”ایک منٹ!“ سالار نے اسے روکا۔ ”یہ تمہاری امانت!“ اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھی گھر کی چابی اٹھا کر اس نے معاذ کی طرف بڑھائی۔ ”اور پلیز اب کوئی تعریفی نوٹ نہیں۔“

معاذ نے بنا کچھ کہے چابی اس کے ہاتھ سے لی تھی۔ وہ جانتا تھا بعض عمل بعض لوگ کسی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ہوتے اور سالار ان ہی میں سے ایک تھا۔

سالار سے رخصت ہوتے وقت اس کا ارادہ تھا کہ وہ خیام کو لا کر یہ گھر دکھائے گا، لیکن تب ہی پروگرام میں عجیب سا رد بدل ہوا۔

گھر پر کوئی غیر معمولی صورت حال اچانک ہی پیش آگئی تھی۔ سوربیہ نے اسے فوراً ہی گھر پہنچنے کے لیے کال کی تھی۔

”کچھ مہمان آئے بیٹھے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے تمہاری موجودگی ضروری ہے۔“ اس کی پریشانی کم کرنے کے لیے سوربیہ نے اتنی سی وضاحت دی اور فون بند۔

معاذ کی بائیک غیر ارادی طور پر تیز ہوتی چلی گئی۔ گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ بائیک گھڑی کر کے وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آیا تو سامنے بڑے ہال کے کھلے دروازے میں سے وہ سب اسے نظر آ گئے۔

زری کی بھابھی سعیدہ اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی اور عورت اور سعیدہ کے دونوں بچے۔ ان کے علاوہ جملہ اہل خانہ کوئی زوردار بحث تھی جو اس کے اندر آنے پر ذرا تھمی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ سلام کے بعد اس نے پہلی بات یہی کی تھی۔

جس کے جواب میں ایک ایسا ملا جلا سا شور اٹھا جس میں سے کسی ایک کا بھی مطلب اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن سعیدہ اور اس کے ساتھ آئے لوگوں کے چروں کے تاثرات سے وہ یہ اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب رہا کہ وہ سب بے حد غصے میں ہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر معاذ وادی اور ابا کے قریب ان سب کے بیچ جا کر بیٹھ چکا تھا۔

”لڑکی کو لینے آئے ہیں اور وہ ہے کہ جانے کو تیار نہیں۔“

وادی نے ایک مختصر سے جملے میں اسے صورت حال سمجھائی تھی۔ سو جب وہ سب چپ ہوئے تو معاذ نے فوری طور پر بات آگے بڑھائی۔

”سعیدہ بھابھی!“ وہ اسے ہی جانتا تھا سو سب سے پہلے اسے ہی مخاطب کیا۔ ”آپ ان لوگوں کو لے کر ہمارے ہاں مہمان آئی ہیں پھر یہ غصہ ناراضی کس بات کی ہے۔ جو بھی ہے آرام سے بھی تو کھانا جاسکتا ہے۔ ہماری آپ کی خدانہ کرے۔ کوئی لڑائی تو نہیں جو یہ اتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے؟“

ابا نے مطمئن سی نگاہوں سے معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ خود ابھی آئے تھے اور فطرتاً ’لڑائی جھگڑوں سے گھبراتے تھے۔“ نہیں معاذ بھائی! آپ سے کیا جھگڑا، سارا فساد تو اس لڑکی نے ڈالا ہے۔ ”سعیدہ قدرے شرمندہ ہوئی تھی۔

”اگر یہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ چلے تو ابھی شام کی بس سے ہم واپس نکل جائیں گھر کے لیے۔“

”نیں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ کہہ دینا میں نے پھر کیوں بیٹھے ہو یہاں جاؤ اپنے گھر۔“ معاذ کے کچھ

ابھی کہنے سے پہلے زری بہت زور سے چلائی۔

”آہستہ بولو“ شریف گھرانوں میں اس طرح بات نہیں کی جاتی۔ ”اسی نے ناراضی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر معاذ کی طرف متوجہ ہو کر۔“

”اس لڑکی کو ان کے ساتھ روانہ کرو معاذ! میں خود بھی اس کی ذمہ داری زیادہ دن نہیں لے سکتی اور یہ رشتے داروں کے پاس نہیں جائے گی تو کہاں جائے گی۔“

”وہاں سکھر میں سارے خاندان والے ہیں جی سب نے ناک میں دم کر دیا ہے، طعنے دے دے کر کہتے ہیں جو ان لڑکی پتا نہیں کن لوگوں کے گھر چھوڑ دی، جس کے پیسے کھا رہے ہیں ہم۔“ سعیدہ کے ساتھ والے آدمی نے تڑپ کر حالت زار بیان کی۔ ”ہم تو سچ سچ ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں سارے میں۔“

شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا، لیکن معاذ کو سارا غصہ سعیدہ اور زری پر آ رہا تھا۔ معاملہ تھا بھی ان ہی دونوں کا۔

”جس وقت آپ اسے دارالامان بھیج رہی تھیں اس وقت آپ نے ایسا کیوں نہیں سوچا سعیدہ بھابھی! میں نے کتنی درخواست کی تھی آپ سے کہ آپ اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ مگر اس وقت تو آپ۔“

بے حد کوفت سے معاذ نے بات ادھوری چھوڑی۔ زری کو ساتھ لا کر جو مستقل ٹینشن اس نے خاموشی سے جھیلی تھی وہ اپنی جگہ اور امی کا مستقل غصہ ایک الگ کہانی۔

”نیں نہیں جاؤں گی اور اگر زبردستی کوئی مجھے لے کر گیا تو میں راستے میں سے ہی بھاگ جاؤں گی، سن لیں یہاں کھول کر۔“

زری ایک بار پھر بد تمیزی سے چیخی تھی۔ معاذ کو اس کا رویہ بہت برا لگ رہا تھا۔

سعیدہ اس کے ساتھ آئے مرد اور عورت تینوں ایک ساتھ پھر بولنے لگے تھے۔ معاذ نے بے بسی کے ساتھ ابا کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی قدرے فکر مند سے تھے۔ معاذ بمشکل ان سب کو چپ کرانے میں کامیاب ہوا۔

”اس طرح معاملہ کیسے سلجھے گا میرے بھائی! کوئی ایسی راہ نکالیں جو آپ کے لیے بھی قابل قبول ہو اور اس بچی کے لیے بھی، ہمیں کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہم تو خود چاہتے ہیں کہ زری کے مسئلے کا کوئی حل نکلے۔“

ابا نے ساتھ آئے اس مرد کو مخاطب کیا تو اس نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا۔

”حل تو ایک ہی ہے بڑے صاحب! آپ اس کی کہیں شادی کر دیں، ہم بھی لوگوں کو کہہ سکیں گے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور۔“

”میں نہیں کروں گی شادی۔“ وہ یک بارگی اٹھی اور اپنا فیصلہ سنا کر ہر نکل گئی۔ سب ہی کے چروں پر ناخوشگوار سی کیفیت ابھری تھی۔ معاذ اٹھ کر اس کے پیچھے آیا تھا۔ زری برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھی مل گئی۔

”یہ کیا طریقہ ہے زری! سب لوگوں کو تم نے کتنا پریشان کر دیا ہے، کچھ احساس ہے نہیں؟ میری ہی بے وقوفی تھی جو میں نے تمہاری ذمہ داری قبول کی ورنہ اسی دن۔“ بے حد غصے میں بولتا ہوا وہ سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

تب ہی اس پر زری کے رونے کا انکشاف ہوا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ معاذ کو باوجود غصے کے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا۔

”دیکھو زری! میرے لیے ریشائیاں مت بڑھاؤ، میری زندگی میں پہلے ہی بہت الجھنیں ہیں جن کے ختم ہونے کے آثار بھی نہیں ہیں، کم از کم تم تو رحم کرو مجھ پر۔“ وہ کھٹکے کھٹکے سے انداز میں اس سے ذرا ہٹ کر سیڑھیوں پر لی بیٹھا۔

اندر سے باتیں کرنے کی ہلکی سی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ زری نے دوپٹے سے اپنا چہرہ خشک کرتے ہوئے بڑی حسرت سے معاذ کی طرف دیکھا۔

پتا نہیں کس بری گھڑی میں وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس نے اندر ہی کہیں دم توڑا۔ وہ جس تک جانے کی ہر راہ پر ”یہ شاہراہ عام نہیں ہے“ کا بورڈ کب سے آویزاں تھا۔ زری کو اس ان دیکھی جویا پر کبھی تو بڑا ہی رشک آتا اور کبھی بے حساب حسد محسوس ہوتا تھا۔

معاذ کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچی تھی۔ تب ہی اس نے مرکز زری کی طرف دیکھا۔

”تمہارے دل میں میری اگر ذرا سی بھی جگہ ہے زری تو تمہیں میری بات سنانی ہی ہوگی۔ میں تمہیں حکم نہیں دے رہا ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہا ہوں۔“

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا جس کی پوجا وہ خود پر کب سے فرض کیے ہوئے تھی۔ سو یہ کتنی بڑی بے ادبی تھی۔ دکھ بھری حیرت کے ساتھ اس نے معاذ کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر بے اختیار ہی ہاتھ رکھا۔ بنا کوئی لفظ کے بہت سے آنسو چہرے پر پھیلتے چلے گئے۔

”تم شادی کر لو زری! میرے دل پر تمہاری طرف سے بڑا بوجھ ہے۔ میں تمہیں تمہارے شوہر کے ساتھ بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ کسی اور کا نہیں، میری خواہش کا احترام کر لو۔“

وہ اس کے چہرے کی طرف اس طرح دیکھے گئی جیسے سزائے موت کا مجرم، سزا سننے کے بعد بھی رحم کی امید پر منصف کی طرف۔

اور اس نے سزا سنانے کے بعد کسی اصول پسند منصف کی طرح ہی نگاہ چرائی۔ زری افسردگی سے مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے میں شادی کر لیتی ہوں، مگر خوش رہنے کی شرط مت لگائیے۔“

معاذ نے کچھ کہنا چاہا، مگر زری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

”لیکن یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوگی اسی گھر سے اسی شہر میں، میں کہیں دور نہیں جاؤں گی۔“ جدائی کے راستے پر قدم رکھتے اس نے ایک آخری رعایت اپنے لیے ڈھونڈی تھی۔

”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔“ معاذ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ”اند ر چلو اب اور بس اب خاموش رہنا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میرے ایک سوال کا جواب دیں گے۔“ وہ سیر ڈھیوں پر ہی بیٹھی تھی۔

”ہاں سہہ بولو“ معاذ نے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ جویا سے بہت محبت کرتے ہیں؟“

اس بار وہ بری طرح چونکا تھا۔

”بتائیے نامعاز! آپ جویا سے بہت محبت کرتے ہیں کیا؟“ اس نے پھر اپنی بات دوہرائی۔

نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے معاذ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں جویا سے بہت محبت کرتا ہوں زری!“ اس نے زری کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ صاف محسوس کیا تھا۔

”مگر یہ آخری احسان تھا جو وہ اس پر کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ امید کی اس آخری کرن کے بجھنے کے بعد ہی وہ اپنی زندگی میں آگے بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہو سکے گی۔“ آجاؤ سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ کہتا ہوا آگے ہال کی طرف چلا گیا۔

اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ جو اقرار اس نے آج تک کسی کے سامنے نہیں کیا۔ وہ زری کے سامنے۔

”دھت!“ دکھ بھری ہنسی اس کے لبوں پر آئی، مگر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنا غم منانے کے بجائے ایک مناسب لڑکے کا سوال دل میں اٹھ رہا تھا۔ ”کون ہو سکتا تھا مناسب ترین لڑکا زری کے لیے۔“

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اور ڈیوڑھی والی ہنسیاں منڈیر سے سنائی دینے لگیں۔
”پاکل ہیں۔ چھٹیوں میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ تو
بس۔ تمہاری چھٹیاں۔ بچے اور بیوی نہیں آئے
؟“

مینا کو نہ جانے کیا بات ناگوار گزری ”پرل“ کر کے
پرے ہوئی اور ایک سو دم اڑ کے نیم کی ٹنٹی پہ جا بیٹھی۔
”یہ کیا سی رہی ہیں آپ؟“ اس نے نیم کے درخت
سے نظریں چرا میں جیسے وہ درخت تنہا ہو بلکہ میڈو سا ہو

لٹ گئی۔ عیشم نے نظراٹھا کے دیکھا۔ مینا بچھڑک کے
کوئٹی کے کنارے پہ جا بیٹھی تھی اور پانی پی رہی
تھی۔

”کپڑے بدل لو گے؟ نکلا دوں؟“
”ارے نہیں! سوکھ جائیں گے۔“
”ہاں بھئی! کرنی بھی تو بلا کی ہے۔ اور وہاں
تمہارے ٹورنٹو میں تو موسم بڑا اچھا ہوتا ہو گا؟“ آپا جیسے
ہوئی ہمت سے بولیں۔ اوپر کی بھت پہ کوئی دگر دگر دڑا

وہ بھٹا گیا۔ چاہا کہ دوڑ کر گدھوں کے اس گروہ کے
سرغنہ کو پکڑ لے۔ لیکن برآمدے میں بیٹھی آپا کو دیکھ کر
ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے بھیگا چوہا بنا دیکھ کر کپانے
سکرا ہٹ پائی۔

”ارے ارے! تم تو بالکل بھیگ گئے۔ فاطمہ! ابھی
تولید لاؤ۔ عیشم بھائی کے کپڑے لینے ہو گئے ہیں۔“
عیشم وہیں پٹنگ کے کونے پر بستر الٹا کے بیٹھ گیا۔
فاطمہ اندر سے تولیہ لے آئی۔

”لو سر پونچھ لو۔ بہت ہی بد تمیز ہو گئے ہیں یہ بچے
۔ ذرا شرم نہیں۔ بتاؤ اگر بارش نہیں ہو رہی تو اس کا
یہ مطلب تو نہیں کہ ہر آئے گئے۔ پانی پھینکو۔“

ان کی آواز میں ہنسی اور سرزنش کھلی ملی تھی۔ اتنی
گرمی میں پانی کی ٹھنڈک سے نہ نہ کرتے ہوئے بھی
اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا اور وہ یوں ہی بے وجہ ہنس پڑا۔
”نہیں آپا! کچھ نہیں۔ بچے ہی تو ہیں۔“ اس نے
سر پونچھتے ہوئے کہا۔ سامنے صحن میں ایک مینا چونچ
کھولے سوکھے تل کے نیچے آ بیٹھی۔

”ان بے چاریوں کو بھی تو پانی چاہیے۔ فاطمہ! بیٹا
کوئٹی میں پانی ڈال دو۔“ فاطمہ اسی طرح چپ چاپ
آئی اور کوئٹی میں پانی کا کٹورا الٹ کے واپس چلی گئی۔
”تم سناؤ؟ اتنے رہ رہے ہو؟ دل لگ گیا؟“

عیشم کو لگا آپا کچھ اور کہنا چاہ رہی تھیں مگر کہہ کچھ
اور گئیں۔ کپڑوں سے پانی نچر نچر کے پٹنگ کے بان کو
بھگو تا ہوا برآمدے کے فرش پہ پھیل رہا تھا۔
”فاطمہ بیٹا! ٹاکی لا کے فرش تو سونت دو۔“ فاطمہ
آئی اور ٹاٹ کے پوچے سے فرش صاف کر کے واپس

سورج آسمان کے پتوں بیچ چمک رہا تھا۔ پینہ سر
کے بالوں سے سرسرا تا ہوا قلموں سے کندھوں پہ ٹپک
رہا تھا۔ گلی دور تک ویران تھی۔ کھرنجے کا اکٹھا ہوا
فرش جس میں جا بجا گڑھے بنے ہوئے تھے۔
دروازے کھلے ہوئے تھے۔ نائک شاہی اینٹوں سے بنے
مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے۔
کسی کسی دروازے کے وائیں یا کیں چراغ جلانے کے
طاقچے ابھی تک سلامت تھے۔ ٹکڑ والے مکان کا
صدر دروازہ بھانٹ بھانٹ کھلا ہوا تھا اور اس میں پڑا
بھول دار پردہ بالکل ساکن تھا۔ دروازے کے وائیں
بائیں کنگورے جھڑے گڑ گڑے طاچے تھے جن میں
جھی موم کی موٹی تہ پہ گرد اور جالے جم چکے تھے۔ ان
طاقچوں میں نیچے چوہا اگست اور بارہ رینج الاول کو
شوقیہ موم بتیاں جلایا کرتے تھے اور اگلے روز سب
لوگوں کے جانگنے سے پہلے کوڑے والا ادھ جلی موم
بتیاں سمیٹ کر لے جاتا تھا اور پوچھنے پر نہایت
معصومیت سے کہتا تھا کہ۔

”نہاں بھائی! ہم نے تو دیکھی بھی نہیں ماؤ بتی۔“
اس نے پروے پہ ہاتھ مارا اور نیم اندھیری ڈیوڑھی
میں داخل ہوا۔ چھن چھن کر کے کوئی چیز جاگی اور
کونوں سے ”ہائے اللہ“ ”اوی اللہ“ کی سرگوشیاں
ابھریں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس نیم اندھیرے میں
دیکھنے کے قابل ہوتا، کسی نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی
اس کے سر پہ اوندھا دی۔ سرگوشیاں قہقروں میں بدل
گئیں اور بہت سے سائے ایک دوسرے پہ گرتے
پڑتے باہر کی طرف دوڑے۔



اور وہ ہمیں پتھر کا ہو جائے گا۔

”مسافر یہ یاد ہے نا ہمارے بچپن میں جب بارش نہیں رکتی تھی تو اہل مسافر بنا کے اس کے کندھے پر لکڑی اور لکڑی کے سرے پر پوٹلی باندھ کے لٹکا دیا کرتی تھیں۔“

”ہاں۔۔۔“ وہ کھویا کھویا بولا۔ ”بارشیں بھی تو کتنی ہوتی تھیں۔ دونوں جم کے گری پڑتی تھی اور پھر اچانک نہ جانے کہاں کہاں سے کالے بادل مستائے ہاتھیوں کی طرح آسمان پر چھا جاتے تھے۔ اتنی بارش ہوتی تھی اتنی بارش کہ برنالے، ندی نالے بن جاتے تھے۔ گلی میں گھٹنوں، گھٹنوں پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ گلی میں اس سرے سے اس سرے تک پکوان تلے جانے کی خوشبو پھیلنے لگتی تھی پھر رات بڑے بڑے جب کسی طرح بارش نہ رکتی تو اہل متوحش سی شکل بنا کے آسمان کی طرف دیکھتیں پھر منہ ہی منہ میں کچھ بولتی ہوئی اندر پلٹ جاتیں اور کچھ دیر کھٹ پٹ کرنے کے بعد ایک بے ہنگم سا گدا جس کے کندھے پر لمبی سی سوئی کے سرے پر کھڑکی لٹک رہی ہوتی تھی لیے برآمد ہوتی تھیں۔“

”لے جھٹے! ذرا یہ مسافر توشہ نشین پہ کھڑا کر آ۔“ وہ بڑی لجاجت سے کہتیں۔

”اونہ! مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ آپ خود چلی جائیں۔“ وہ کتاب میں ناک دیے نخوت سے جواب دیتا جس پر وہ خود ہی بوری کو برساتی کی طرح اوڑھ کے بیڑھیاں چڑھتی اور برستی بارش میں مدھم بلب کی روشنی میں ان کا سلبہ دوسری دیوار پر ”نوٹرے ڈیم کے کبڑے“ کی طرح نظر آتا۔

ہوا کا ایک جھونکا سا آیا اور نیم کے درخت سے کتنے ہی زد پتے ٹوٹ کے جیسے اس سے گلے ملنے والہانہ سے انداز میں برآمدے تک آئے اور پھر کسی انجانی دہشت سے وہیں پہلی بیڑھی پہ گر گئے۔

چھت پہ پھر کوئی دھڑا اور گرد آلود ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا۔

”اچھا تو مسافر بتا رہی ہیں۔ مگر آپ اتنی دھوپ میں؟“ صفائی دی۔

اس نے جیسے بات برائے بات کی۔

”شیم!“ آپا جیسے ایک دم دمکی سی ہو کر بولیں اس نے حیرت سے آپا کو دیکھا۔

”بارش تو ہوگی نا شیم! یہ کسے ہو سکتا ہے کہ بارش نہ ہو۔“ ان کی آواز میں واضح شکوہ تھا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

”ہاں آپا بارش تو ہوگی۔“

”اور جب بارش ہوگی تو۔۔۔“ انہوں نے جملہ اوجھڑا چھوڑا۔ آندھی کا بڑا سا گولہ ہزاروں شاہر، خس و خاشاک اور بہت سی گرد اپنے جلو میں لیے مکاتوں کی چھتوں سے کپڑے اتارتا، بالٹیاں اونڈھاتا، چلمنیں پھینچاتا اس طرف بڑھا۔ نیم کا درخت زور سے کانپا۔ ایک کو اپر اگلائیڈر کی طرح توازن قائم رکھتا ہوا نیم کی شاخوں میں کہیں جا گھسا۔

”دیکھا! بارش ہوگی۔“ آپا کے لہجے میں فخر تھا۔ چھت پر دی دی چھین سنائی دیں۔

”مگر آپا! کیا ضروری ہے کہ بارش اتنی ہو کہ۔۔۔“ ”اتنی ہی ہوگی بارش۔ شیم! یہاں اتنی ہی بارش ہوتی ہے۔“ آپا کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ آسمان پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ گونجی۔

”لو آگئے۔“ آپا کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

”فاطمہ! اری بیجی فاطمہ! اوپر کچھریاں سوکنے رکھی تھیں۔ اتار لائے۔ جا بھاگ جا بیٹا!“

فاطمہ بیڑھیاں اتر رہی تھی کہ بارش کی پہلی بوندیں چمکیں۔ پھر ایک دم تو اتر سے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ شیم کے کندھے پر ایک موٹی سی بوند گری نظر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔

”اوہو! امیاں تم اندر چلے چلو۔ یہ برآمدہ تو ٹپکتا ہے۔“ کچھلی کئی برساتوں سے اصل میں جب تمہا ہر گئے تھے تو اس سال امیاں نے پرنا لے ٹھیک نہیں کرائے۔ بارش ہوئی تو چھت پر پانی کھڑا ہو گیا۔ بس تب ہی سے ساری چھت چھلنی کی طرح ٹپکتی ہے۔“ آپا نے صفائی دی۔

اندر کمرے میں جس تھا۔ شیم نے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ جالی کے پار بارش زور سے برس رہی تھی اور کھڑکی کھولتے ہی ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو کا جھونکا آیا۔ آپا وہیں کونے میں ستارے والی دری پہ ٹپک گئیں۔ مسافر تیار ہو چکا تھا۔

”آپا! آپ لوگوں نے یہ دری ابھی تک سنبھال کے رکھی ہوئی ہے؟“

”یہ دری؟“ آپا نے دری پہ پیار سے ہاتھ پھیرا جیسے وہ دری نہ ہو بلکہ جیتا جاگتا انسان ہو۔ ”شیم! یہ دری ہٹا دیں گے تو نیچے کافر ش بڑا معمولی سا ہے۔“

اس نے جیسے زبردستی خود کو بولنے سے روکا کہ ”آپا! فرش گندا ہے تو کیا ہوا؟ نیا فرش لگوائیں، ٹائلیں، ویناٹیل فلورنگ یونیم اٹ، ہر طرح کا فرش دستیاب ہے۔“ لیکن وہ چپ رہا۔

”بیوی بچے نہیں آئے؟“ آپا نے بڑی ہمت سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھتا رہا۔ گلی کے مانوس مکان۔ سامنے کا درجہ کھلا ہوا تھا اور اس میں پلاسٹر آف پیرس کا بڑا سا سنہری گلہ ان دور سے آنے والے پھول رہا تھا۔ پلاسٹک کے پچھلتے رنگوں والے پھول پھوٹنے سے ٹھوٹے ہوئے تھے۔

”یہاں کہاں آنا چاہتے ہوں گے۔“ آپا کے لہجے میں دبی دبی خود اذیتی تھی۔

وہ چپ رہا اور جالی سے ناک چپکادی۔ دو تین بیڑھیاں چڑھ کے فضل الہی کا مکان تھا۔ جس میں ایک کمرے کی الماری پہ سرخ سرخ گالوں والے رام جی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ فضل کی امیاں ان تصویروں پہ لٹی سے اخبار چپکادیا کرتی تھیں۔ برسات میں لٹی سیل جاتی تھی اور اخبار نیچے گر جاتے تھے۔ تب شیم اور فضل، چپکے چپکے جا کے رام لکشمین اور سیتا کی تصویروں کو دیکھتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھونٹھریا لے ہال اور معصوم مسکراہٹ والے دیوی دیوتا بادلوں سے بھرے آسمان پہ پانی کی پچکاریاں لیے ایک دوسرے کے پیچھے دڑے پھرتے تھے اور کبھی کوئی شرارتی کنیا ہیرے کی کٹی جیسا پانی کسی شعلے کے

راستے میں اچھل دیتی تھی تو کاسنی بادلوں سے اٹھکے آسمان پہ اندر کے کمان کے ساتھ رنگ یہاں سے وہاں پھیل جاتے تھے۔

فضل الہی کی ماں، توبہ توبہ کرتی جھریوں بھرے ہاتھوں سے دونوں گال پٹتی اور آنے کی نئی نئی بنا کر ان شدید کافرانہ تصویروں کو چھپا دیتی۔

”بڑی لڑکی کی تو شادی کر دی ہوگی؟“ آپا کے لہجے میں رشک تھا۔

شیم نے جیسے سہارے کے لیے کھڑکی کی سلاخوں کو کس کر پکڑ لیا۔ فضل الہی کے کونٹے سے پیچھے پھیلے برگد کی جھولتی جناں تھام کر پچھلے میدان میں اتر جاؤ تو آگے فٹ ہال گراؤنڈ کی بیڑھیاں تھیں۔ نیم ہڈاڑے میں پھیلی ہوئی۔ جن پہ محلے کے سارے بچے اونچ نیچ کھیلا کرتے تھے اور بارش کے بعد یہ بیڑھیاں کچھوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ فضل الہی یہ سارے کچھوے بوتلوں میں بھر بھر کے کھیتوں میں ڈال آتا تھا۔ فضل الہی کے ابا جی زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور کچھوؤں کے عاشق تھے۔

”میرے بچو! کچھو اکسان کا دوست ہے، انسان کا دوست ہے۔ ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ کچھوؤں کے فضل کی وجہ سے کھاتے ہیں۔“

شیم کو ان کی اس بات پر ابکاکی آجاتی تھی۔ مگر فضل الہی بڑا بیباک تھا۔ برسات کے دنوں میں جب سب بچے فٹ ہال گراؤنڈ میں اونچ نیچ کھیلتے تھے اور مینڈکوں کے ننھے ننھے بچے پکڑ کے ایک دوسرے کی قیصوں میں ڈالتے تھے تو فضل الہی چپ چاپ بیٹھے کی بوتلوں میں کچھوے جمع کرتا رہتا تھا ایک بار فضل کے ابا نے ان دنوں کو کچھوے کی ڈانس کمیشن کر کے دکھائی تھی۔ اس رات وہ نیند میں بڑبڑاتا رہا تھا اور اسے بڑی بڑی جنتائی میخوں کے سائے نظر آتے رہے تھے۔ اگلے دن امی نے اس کا فضل کے گھر جانا بند کرادیا۔

”ناس پیٹے ہندوؤں کا گھر ہے۔ الٹی سیدھی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بھائی تو نیت سے اتنا نہیں ہوتا۔ ایک کوچی اور دس روپے کا چونا لے کے ان تصویروں

پہ پھیروں اندر کاہندو نہیں جاتا۔

کتنے ہی دن وہ اداس پھرنا رہا تھا۔ پھر ایک دن جب اہل فوارے کے پاس والے تخت پر سو رہی تھیں تو وہ جیکے جیکے فضل کے گھر چلا گیا تھا۔ فضل کے ابا شمد کی تمبیوں کی کسی نسل پہ تحقیق کر رہے تھے۔ ایک ننھا سا ڈبہ چار ٹانگوں پہ برآمدے میں کھڑا تھا۔

”یہ تمبیوں کا فارم ہے۔“ فضل نے اسے بتایا تھا۔ کئی گملوں اور کپاریوں میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا ایک دم ساری کھیاں بھن بھن کر گئی اس کے چہرے بازوں ہاتھوں اور پیروں پہ لپٹ گئیں۔ کئی دن بخار، سوجن، گلے کی سوزش۔ جھلنے کے بعد اسے پتا چلا کہ فضل الہی کے گھر کی طرف کھلنے والا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ اب آمدورفت کے لیے پچھلی میٹروکے ڈیوڑھی استعمال کی جائے گی جو بازار کے رخ تھی اور پردے کی غرض سے اس میں ایک پرانی الماری ایسے رکھ دی گئی کہ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ فضل الہی کے گھر جانا بند کر دیا گیا مگر اہل کی بدگمانیوں اور بددعاؤں کا رخ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فضل الہی کے گھر کی طرف ہو گیا۔

”سفلی کرتے ہیں دونوں میاں بیوی، جلتے ہیں ہم سے۔ خیر سے بھرا پڑا گھر ہے۔ ان کے گھر کی طرح نہیں۔ ایک لڑکی ہے، سوات بیاہ دی۔ ہتاؤ! سوات بھی کوئی جگہ سے بیاہنے کی؟“

”تبا! فضل الہی کی بہن۔۔۔“ وہ ایک دم مڑا۔ لیکن آوٹے جیلے کے بعد ساکت ہو گیا۔ آپا کے چہرے پہ برہمی تھی۔

”وہیں سوات میں ہے۔ سنا ہے تخت بھائی کے پاس کوئی گاؤں ہے وہاں بہت گھڑی ہے۔ اہل ٹھیک گھڑتی تھیں اندر کاہندو نہیں مرتا۔“

”اوہ!“ نہ جانے یہ سکون کا سانس تھا یا وہ کاہوگا؟ اس نے دوبارہ گلی میں جھانکا۔ بارش کا جھالا زور سے برسا اور ننھی ننھی بوندیں جلی سے چھن چھن کر شیم کے چہرے سے ٹکرائیں۔

”دیکھو تو کتنے بد تمیز بچے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کہ اتنے عرصے بعد ماموں گھر آیا ہے، مل لیں۔ سلام بھی نہیں کیا۔“ تبا بدبو دلائیں۔

”چھوڑیں تبا! بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”ہاں، مگر پھر بھی۔۔۔ اچھا تو بڑی کا نہیں بتایا۔ کہاں کی شادی؟“ آپا کے لہجے میں ٹوٹ تھی۔ شیم نے دوبارہ باہر جھانکا۔ گلی میں اتنا پانی تھا کہ دور سے وہ وٹس کی کوئی گلی لگ رہی تھی۔ فضل الہی کے مکان کی دو سیڑھیاں پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور طاپچے کے اوپر بارش کی بو چھاڑے دھلنے والی دیوار پہ ایک دم ہم سا نشان نظر آ رہا تھا۔ ننھی سی ہتھیلی، لمبی لمبی انگلیاں، لاکھ سے بنا ہوا نشان۔ اسے ایک دم جھرمجری سی آگئی۔

”اوہو، دھیان ہی نہیں رہا۔ چائے بنواتی ہوں تمہارے کپڑے بھی تو کیلے ہیں۔ بدل لو، دیکھو یہیں الماری میں ابا کے تہ بند اور کرتے رکھے ہیں۔“ آپا کی ترغیب اتنی دلنشین تھی کہ اس کا سر خود بخود اُٹھتا تھا۔ مل گیا۔ ابا کے کپڑوں میں سے خس کے عطری پرانی پاس آ رہی تھی اور ملل کا کرتا بار بار دھلنے سے اتنا گھس چکا تھا کہ ہنسنے ہنسنے کندھے سے مسک گیا۔

”لو چائے پی لو۔“ تبا نے چائے کی کشتی ستارے والی دوری پہ رکھ دی۔ گلابی پھول والی چائے کی پیالیاں نمبر شکروان اور ایک تشری میں گھر کے بنے ہوئے چاروں مغز کے بسکٹ۔

”دیر ہو گئی۔ میں مسافر شہ نشین پہ رکھنے چلی گئی تھی۔ بارش تو دیکھو دیکھنے سے برس رہی ہے۔ اور تم نے جانا بھی ہو گا تو۔“ تبا دوپٹے کا بھینکا ہوا آنچل ستارے والی دوری سے دور کر کے نچوڑ رہی تھیں۔

”جانا بھی ہو گا۔“ اسے لگا فضل الہی کے گھر میں رکھی شمد کی کھیاں ایک بار پھر پاگل ہو کے اس کے گالوں اور کانوں کی لوؤں پہ ڈنک سارنے لگی ہوں۔

”بچے تو بارش کے دیوانے ہیں۔ چاہے دس گھنٹے ہوتی رہے مگر تمہیں تو جانا ہے نا۔ گیوں شیم؟“ شیم نے گھر کی سے باہر جھانکا۔ بارش کے تسلسل

میں بار کی آئی تھی۔ ”مسافر رکھا ہے نا، رک جائے گی۔ تھوڑی دیر کو ہی سہی۔“ آپا کے لہجے میں غلج تھی۔ ”بڑی کی شادی کس سے کی تھی؟ اس کا نام جبرائیل کیوں ہے؟ وہ مردہ خانے کی دین کیوں چلاتا ہے؟ لڑکی کا سر پولش ہے تو کیا وہ۔۔۔؟“

سب سوال آپا کے چہرے پہ لکھے تھے۔ گھر کی کے پار فضل الہی کے گھر کی سیڑھی پانی سے باہر تھی اور دائیں بائیں پنوں پر بھی کے کھدے ہوئے ”شبو“ اور ”لاکھ“ کے الفاظ سالہا سال کے پڑائے ہوئے روغن کے نیچے سے واضح دکھائی دے رہے تھے اور طاقچے سے ذرا اور لاکھ سے بنا ہوا ہاتھ کا نشان۔

”آپا! یہ فضل الہی کی پروادی تھی ناں۔۔۔ جن کا یہ ہاتھ ہے۔ وہ سہی۔“

”اوہو شیم! دیکھو بارش رک گئی ہے۔ دیکھنا پھر نہ شروع ہو جائے۔ تو تم جلدی سے چلے جاؤ۔ ہوٹل تک جانا ہو گا۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟ اچھا تو پھر کپڑے۔“ آپا کے لہجے میں شدید غلج تھی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کے گھر کی بند کر دی۔ آپا کے پانچے کیلے تھے اور ان کے پیروں پہ نیم کا ایک پتہ چکا ہوا تھا۔

”میں اسد کو بلاتی ہوں۔ اس نے تم پہ پانی پھینکا تھا۔ لڑکیوں میں گھسارتا ہے۔ بس۔ کیا کروں ابا نے لاڈ میں بگاڑ دیا۔ سمجھتے تھے تم بڑی سے۔۔۔ چلو چھوڑو میں بلاتی ہوں۔ موٹر سائیکل پہ چھوڑ آئے گا۔“

آپا کی آدمی اور عورتی باتوں میں بہت تلخی تھی۔ ”بڑی کے شوہر کا نام جبرائیل کیوں ہے؟“ فضل الہی کے برآمدے میں شمد کی کھیاں جھنسنار رہی تھیں اور آپا کی سیڑھیوں پہ بوری اوڑھے اوپر جا رہی تھیں۔ برستی بارش میں سامنے کی دیوار پہ ان کا سایہ ”لوڑے ڈیم کے کپڑے“ کی طرح بے چنگم لگ رہا تھا۔ وہ جیکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

ترج موقوف ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ گلی کے

کنہ مکانوں کے خستہ چھجے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ گلی دیران گئی دور دور تک کوئی ذی مدح نظر نہیں آ رہا تھا۔ بند دیوانوں، جالی دار کھلی کھڑکیوں اور جھوکوں میں تنی سرکی چلمنوں کے پیچھے سے عام گھریلو کام کاج کی آوازیں چھن چھن کر گلی میں آ رہی تھیں۔

وہ بازار والے دیوارے سے گھوم کر گلی میں داخل ہوا تھا۔ مکان یہاں سے گلی کے ٹکڑے پڑتا تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ ذرا سار کا تھا۔ کسی مکان سے پکڑے تلنے کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ننھے سکیڑ کر اس خوشبو کو سونگھا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ فضل الہی کے گھر کی جالی دار کھڑکی کے اس پار کوئی ہسالور جس کے عطر کا تازہ جھونکا آیا۔ وہ ٹھنک گیا۔ جالی پہ جالی ہسی۔ مالوس خوشبو۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا، گلی کی تنگی سے سرسراتا ہوا گرد۔ گھر کی کے اس پار کسی نے سر ہوا سے جھرمجری ملی اور پھٹ سے گھر کی کا پٹ بند کر دیا۔

”صرف گلی ہی تو پار کرنا ہے“ اس نے سوچا اور سر جھکا کے چلنے لگا۔ گھر بچے کے فرش پہ جا بجا ننھے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ان گڑھوں میں بارش کا پانی کھڑا تھا اور اس پانی میں بادلوں بھرے آسمان کا عکس تیرتا تھا۔ گلی جلدی پار کرنے کی غلج میں اس کا پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑا۔ پاؤں باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے اس گڑھے میں پانی کے بجائے فلتش نما کٹی ہوئی برف بھری ہے اور وہ اس برف میں دھنستا جا رہا ہے۔ اس کے کانوں میں مسافر کے چھتروں کی پھڑپھڑاہٹ گونجی۔ مسافرت، غریب اور بے مری کی برف اس کے چاروں طرف شہ نشین کی بروہ دیواروں کی طرح بلند ہونے لگی اور گلی کسی کلیشیر کا کلیار ابن گئی جس میں اجنبیت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔



کھلی کتاب

”شادی کے بعد پہلی بار آفس آیا ہوں۔ تم نے ایک بھی میسج نہیں کیا۔ کل کی تو خیر مجھے امید ہی نہ تھی۔“ سروان نے پہلی فرصت میں اسے فون کیا اور چھوٹے ہی شکوہ کر ڈالا۔

”آپ نے آتو جانا ہے ناشام کو پھر خواہ مخواہ ہی ڈسٹرب کرتی؟“ انعم نے بڑے سجاؤ سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی، پیار بھی، مگر شوخی مفقود تھی۔ اس کے اس دھیمے انداز پر سروان کے شکوے سے چھلکتی شرارت اور لبوں پر رقصاں مستی نہ جانے کس کو نے کھدے میں جا چھپی۔

سروان کی انگلیاں موسیقی کی لے کے ساتھ اسٹیرنگ و ہیل پہ تھرک رہی تھیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھا انعم کا انتظار کر رہا تھا۔

”اتنا تیز میوزک؟“ انعم کی آمد اسے متوجہ نہیں کر سکی تھی وہ نہ جانے کب آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کی ناگواری میں ڈوبی آواز نے ہی سروان کو اس کی آمد کی خبر دی۔ ”تم ٹھیک سے تیار ہو تیں نا کوئی اچھا سا نیا سوٹ پہنتیں۔“ سروان نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کی تیاری پہ بھروسہ کیا۔

”سروان! یہ ڈیزائنو ویئر ہے اور میں نے آج پہلی بار پہنا ہے۔“ انعم نے تاسف سے کہا۔

”آہ اچھا! فکر بہت ڈل ہے، اس لیے۔“ ”سروان! تمہیں ایسے ہی شیڈز تو پسند تھے۔“ انعم

تمہاری جان لینے کا وہ ہے یا کچھ اور۔ میں نہیں جان پاؤں۔ بس ایک احساس زیاں ہے جو مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ میں۔ میں اسے کیا نام دوں؟“

”تمہیں کہا تھا نامت کر دے سب۔ بھکتو اب تمہارا بویا ہے تم ہی کاٹو گی۔“ انعم اس پر چلا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ یہ قصہ لے کر سیدھی انعم کے پاس آئی تھی۔ اس کو یہیں آنا تھا۔ اسی کے در پر سر پٹخنا تھا۔ کھیل تماشے میں اس نے اپنی متاع کل انعم کی جھولی میں ڈالی تھی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا اب صرف تماشا رہ گیا تھا۔ دنیا کے دیکھنے کو اور اس کے دیکھنے کو تو وہ بھی نہیں رہا تھا اس نے اپنی گود میں کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھا اور پھیلی پھیلا کر نظروں کے سامنے کر لی۔ اس کے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک دوسرے سے ابھتی ہوئی لکیروں کے۔

نے اس کی بات کٹ کر اسے یاد دلانا چاہا۔ ”مجھے۔ کب؟“ وہ غائب و غشی سے بولا۔ ”پتا نہیں۔“ انعم نے دو لفظی پتھر پھینچ مارا۔ ”مجھے تو ہمیشہ سے تمہی کے سے شوخ رنگ پسند تھے جیسے لور پختی تھی۔“

وہ اپنی ہی رو میں کے جا رہا تھا۔ شاید وہ بلا ٹکٹن بولتا رہتا اگر انعم ٹھک سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نہ نکل جاتی۔

”انعم سوری! اس نے تمہیں زندہ انداز میں کہتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔

”نہیں بلکہ سوری تو یو ماہ لور!“ اس نے کرب سے خود کلامی کی۔ ”میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پری کی جان لے لی۔ اپنی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے مرچیں بھر لیں اور انعم۔ انعم کی زندگی بڑھ کر دی! میرے مزاج کے قریب تو تم ہی تھیں لور! تمہاری معصومیت سے تمہاری شرارتوں سے تمہاری زندہ دل بنی سے۔ محبوب تو وہی ہوتا ہے نا جس کی ہر ادا بھائے تم ہی تو تھیں جو مجھے ہر حال میں اچھی لگتی تھیں۔ رونی منہ بسورتی لڑتی جھگڑتی شور مچاتی۔ اور انعم! وہ ایک لمحے کافسوں تھا جو مجھے مسحور کر گیا۔ میرے دل کی گہرائیوں تک جس کی جڑیں نہیں تھیں یہ تو محض وہ کشش تھی جو صنف مخالف کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور میں۔ میں اپنی طلب کو محبت سمجھ بیٹھا۔ تمہارا کھیل تماشا مجھے تماشا بنا گیا ہے زندگی یکم کر گئی میرے ساتھ۔ کتنی پشیمائیاں ہیں میرے اندر۔“

وہ جنگلے پر کنبیاں نکالے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے وہ بڑی متانت سے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔ ماہ نور نے دور سے ہی اسے وہاں کھڑے دیکھ لیا، اس لیے دروازے کے قریب بنا آہٹ کیے چل آتاری، بے آواز چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور ایک بے معنی مگر نہایت ادنیٰ سی آواز منہ سے نکال کر اسے ڈرانا چاہا۔

”تم؟“ اسی پرسکون انداز میں وہ دھیرے سے پیچھے مڑی تھی۔

”میرا خیال تھا تم ڈر جاؤ گی، مگر تم چونکیں بھی نہیں۔“ ماہ نور بد مزہ ہوئی۔

”کب آئیں تم؟“ مبہم لہجے میں سوال کیا گیا۔

”کچھ ہی دیر پہلے، تم کیسے خود کو اتنا کمزور رکھ لیتی ہو، نہ ڈرتی ہو نہ گھبراتی ہو نہ چونکتی ہو نہ غصہ میں بے قابو ہوتی ہو؟“ ماہ نور اس کے سوال کا جواب دے کر فوراً اپنے مطلب کی بات پوچھنے لگی۔

”یہ رنگ بہت نچ رہا ہے تم پر۔“ انعم اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے بولی۔

”سروان نے دلویا ہے۔“ ماہ نور نے مزہ لیتے ہوئے بتایا، پھر کچھ یاد آئے یہ اس کے چہرے کے زاویہ ذرا سے بگڑ گئے اور وہ تھوڑا بد مزہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بلکہ یوں سمجھو میں نے اس سے نکلوایا ہے، آخر کو مگیترو ہوں، اتنا تو حق بنتا ہے میرا بنتا ہے نا؟“ انعم نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”بتا ہے مجھے اس سوٹ میں دیکھ کر اس نے کیا کہا؟“ ماہ نور نے انعم کی دلچسپی ابھارنے کی خاطر سوال کیا، مگر اسے بتا تھا کہ کم گو سی انعم شاید ہی کچھ بولے، جب ہی وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی شروع ہو گئی۔

”ماہ نور! تمہیں یہ فکر بہت سوٹ کر رہا ہے، مگر مجھے لائٹ فکر اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے ہو ہو سروان کے

لہجے اور آواز کو کالی کیا تھا۔

”اب میں اسے کمنٹ سمجھوں یا کھلی منٹ؟“ وہ مجھے میں تھی۔ ماہ نور خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”ویسے انعم م م م۔“ کچھ توقف کے بعد وہ پرسوج انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ تمہارے جیسے فکر پہننے لگوں تو اسے زیادہ اچھی لگوں گی۔“ انعم نے چونک کر اسے دیکھا، مگر ایسا کوئی رنگ وہاں نہیں تھا، جس کا عکس اس کے دل کے چور نے محسوس کیا تھا۔

ماہ نور اور انعم خالہ زاد تھیں۔ ان کی ماؤں کی شادیاں ایک ہی گھر کے دو بھائیوں کے ساتھ ہوئیں۔ شادی کے دوسرے ہی ہفتے ماہ نور کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔ ماہ نور کے تاتا، تانی نے بمشکل ماہ نور کی پیدائش کا انتظار کیا۔ اس کے پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی ماں کی کسی دوسری جگہ شادی کر دی۔

ماہ نور کو دادا، دادی نے پالا تھا، تنیم پھوپھو جو اس کے باپ کی جڑواں بہن تھیں اسے اپنی بہن ہونے کے لیے جن چکی تھیں۔ خاندان بھر کی لاڈلی، شوخ و چنچل سی ماہ نور سے سروان کو اتنا ہی پیار تھا جتنا خاندان کے کسی بھی اور فرد کو، لیکن کبھی کبھی اس کی لاپرواہی طبیعت اور اٹلے سیدھے مشاغل سے وہ اکتا جاتا۔

ماہ نور اور انعم ایک ساتھ بی بی بڑھیں، دونوں کے گھر کی دیوار مشترکہ تھی، اسکول، مسجد، یوشن، کلج، پونہور سٹی، ہر جگہ وہ ساتھ رہیں، مگر اس کے باوجود ان کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انعم سنجیدہ اور بردبار سی تھی، جبکہ ماہ نور شرارتی جذباتی اور کسی حد تک ساہو مزاج بھی۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کی اچھی سہیلیاں تھیں۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے، انعم کو ضرور جانا چاہیے۔“ دادا ابو نے انعم کے ہاتھ سے چائے کا کپ

لہتے ہوئے کہا۔ رات کی چائے وہ دونوں گھرانے ہمیشہ کسی ایک جگہ پر پیتے تھے، کبھی عابد رضا، بیوی اور بیٹی کو، کبھی والدین کی حیرت دریافت کرنے پہنچ جاتے اور کبھی رضا عثمان صاحب پوتی اور بیگم کے ہمراہ عابد رضا کے ہاں آن موجود ہوتے۔ ایک بات جو دونوں صورتوں میں مشترک ہوتی وہ تھی انعم کے ہاتھ کی چائے۔

اس وقت وہ سب افراد خانہ رضا عثمان صاحب کے گھر موجود تھے، جب عابد رضا نے اپنے والد کو بتایا کہ کسی یوتھ کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد کروائی جانے والی آرٹ ایگزیشن میں انعم کو اپنی تین ہینڈنگز کے ہمراہ شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

”مگر بابا جی! ہم اسے کیسے بھیجیں؟ عابد تو آج کل بہت ہی بڑی ہیں۔“

غالباً ”صغیر عابد“ بیٹی کو انجان شہر میں نہیں بھیجتا چاہتی تھیں، جب ہی انہوں نے عذر پیش کیا۔

”تو بیٹا جی! آپ بھی تو نوٹنٹی فرسٹ سچری دو من ہیں، آپ چلی جائیے ساتھ بیٹی کے آگے بڑھنے میں اس کی معاونت کیجئے۔“ رضا عثمان صاحب نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

”مم۔ میں۔۔۔ اباجی وہ۔۔۔ یہ ایک ہی دن میں گھر تلپٹ کر دیں گے پیچھے سے۔“ وہ ساہو لوح سی گھریلو خاتون تھیں جانے کاسن کر رہی گھبرا گئیں۔

”تو پھر میں چلا جاتا ہوں اپنی بیٹی کے ساتھ۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

”نہیں دادا ابو! آپ نہیں، آپ تو پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتے اور ویسے بھی ابھی دو چار دن ہیں کوئی نہ کوئی آرٹ ہو جائے گا۔“ انعم نے سہولت سے منع کر دیا۔

”لوگ تو اپنی مگنیٹروں کو اتنی اتنی لمبی کالز کرتے ہیں اور تمہیں میں نے دو چار مسیج کیا کر دیے، تم نے تو لائٹش شروع کر دی، کیا ہوا؟ خیریت؟ کسی نے ڈانٹا جو

مجھے مس کر رہی ہو؟ کچھ چاہیے جو مجھے یاد کیا؟ حد ہو گئی، یعنی میں بغیر کسی وجہ کے تمہیں یاد بھی نہ کروں؟“

وہ کبیل میں دکی اپنا فوٹو ڈرامہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ نمکین مونگ پھلیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی، جب اچانک اسے نہ جانے کیا سوچ بھی اور اس نے سروان کے نمبر پر چند ایک دعائیہ اور مس بودا لے ایس ایم ایس فارورڈ کر دیے، اس کی فوراً ”کال آگئی اور اس نے اس کی طبیعت، گھر کے ماحول، دادا، دادی کی صحت کے متعلق اتنے سوالات کر ڈالے کہ وہ ہتھ سے اکھر گئی۔

”اوکے اوکے ریلیکس، تمہیں پتا ہے نا، مجھے چڑھتی ہے اس سب سے، موبائل ضرورت کی چیز ہے، کھلونا نہیں جو ہم ہر وقت اس سے کھیلتے رہیں۔“ اس نے نرم سے انداز میں اسے سمجھایا۔

”اچھا اچھا۔ بھاشن مت دو، پہلے ہی میں بہت ڈسٹرب ہوں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”کیوں ڈسٹرب ہیں دیوی جی؟“

”آج بھائی کی کمی بہت مل ہو رہی ہے۔“

”کو تو پوری کروں؟“ وہ شریر ہوا۔

”اب اتنی بھی فیل نہیں ہو رہی کہ تمہیں اپنی خدمات فراہم کرنی پڑیں۔“

”اچھا بابا اچھا، جتنی بھی ہو رہی تھی ہوئی کیوں؟“

”گھر میں کوئی بھی انعم کے ساتھ اسلام آباد والی ایگزیشن میں جانے کے لیے دستیاب نہیں ہے، وہ ڈس ہارٹ تو ہوئی ہوگی نا؟ ویسے کہتی نہیں یہ اور بات ہے۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیوں؟ انعم کے لیے پریشان ہونا بے وقوفی ہے؟“

”نہیں یار! مگر تم لوگ آجاؤ نا، یہاں میرے فلیٹ میں آرام سے رہ لینا۔ اتنی بھی خبر نہیں تمہیں کہ تمہارے مگیترو نے نانہ طالب علمی میں ہاسٹل کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے فلیٹ خرید لیا تھا اور اب

دوران ملازمت بھی مل رہی ہیں مقیم ہوں۔“

”تم تمہارا اسلام آبلو ٹرانسفر کب ہوا؟ پوچھو
نے پر اس نے کہا تھا تم جوں ہی اسلام آبلو آگے مجھے
پورے کا پورا آپٹیل سی دکھاؤ گے۔“

وہ اپنی لاعلمی اور پوچھو کی دہرہ خلائی پہ رہا
ہو گئی۔ سردان کہہ کر بچھڑا، کیونکہ اپنی بے پناہ
مصروفیت کے سبب اس نے اسی سے درخواست کی
تھی کہ وہ فی الحال ماہ نور کو اس کے تالوں کے متعلق
لا علم ہی رہنے دیں۔ مگر تیر کلن سے نکل چکا تھا۔ لہذا
اب جیسے تیسے کر کے اس کو بت سنبھالنی تھی۔

”اسی ہفتے سوچا تھا دیک اینڈ پہ تمہیں آکر لے
جاؤں گا سربراہ منور ناچا رہا تھا نا!“

”چھا!“ اس کے منہ سے بے یقین سا اچھا نکلا۔

”اب ایسا کرو کہ اس وقت سو جاؤ اور صبح تم اور ماہ
نور اپنی پیننگ کر لیتا یہاں آنے کے لیے۔“

”ٹھیک ہے میں صبح صبح اٹھ جاؤں گی۔“ وہ خوش
ہو گئی تھی۔

”گڈ کرل اور سنو فیصل آبلو سے اسلام آبلو شاید تم
دونوں کو اکیلے ہی آنا پڑے۔“

”ہم دونوں اکیلی؟“ اس نے پریشانی سے آنکھیں
سٹپائیں۔

”ہاں اور ہر سے عابد ماموں اسٹیشن تک چھوڑ دیں
گے، یہاں سے میں پک کر لوں گا“ ٹرین میں تو اتنے

سارے لوگ ہوتے ہیں ویسے بھی اب تو تم بڑی ہو گئی
ہو اور سمجھ دار بھی۔“

آخری جملے کا اضافہ اس نے ماہ نور کی پریشانی کم
کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر رہا۔ وہ

فورا ہی مطمئن ہو گئی اور فون بند کرنے کے کچھ ہی دیر
بعد سو بھی گئی، جبکہ عموماً وہ رات گئے تک جاگنے کی

عادی تھی۔

سردان کا نام سن کر تو کسی کے پاس اعتراض کی کوئی
منجائش ہی نہ رہی تھی۔ لہذا نہ صرف انہیں آسانی

سے اجازت مل گئی، بلکہ وہ اسی روز اسلام آبلو کے لیے
روانہ بھی ہو گئیں۔

ماہ نور تو بھی ہی سدا کی لاہور، تھل اور لیڈنر پینڈ
لینڈ اور بے فکری سے ٹرین کے سفر کو انجوائے کر رہی

تھی، جبکہ انعم کو اگر کوئی گھبراہٹ تھی بھی تو اس کے
چہرے سے اس چیز کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ البتہ

ابو دادا ابو، پچھو اور سردان کی یکے بعد دیگرے آنے
والی کالز سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ سب ان

دونوں کے لیے کس قدر فکر مند تھے۔ مگر ان دونوں نے
جس سکون اور رسائی سے ان سب کو مطمئن کیا،

اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا، ورنہ وہ جس
رفار سے فون کھڑکاتے جا رہے تھے، کوئی بعید نہیں تھا

کہ سارا سفر موبائل ماہ نور اور انعم کے کلن سے لگا
رہتا۔

ماہ نور کی ضد تھی کہ آج اور ہر صورت میں آج ہی
جاتا ہے، سب نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار تو ڈال

دیے، مگر انہیں تیاری اور پیننگ کر کے نکلتے نکلتے شام
ہو گئی اور اب تو ٹرین کو چلے ہوئے بھی گھنٹہ ڈیڑھ گزر

گیا تھا، یعنی شام ڈھل چکی تھی اور رات اپنے پر پھیلا
رہی تھی۔

انعم تو سر شام ہی سو جانے کی عادی تھی عشاء کی نماز
کے بعد وہ صرف سب کو چائے دینے تک جاگا کرتی تھی

اور اس کے فورا بعد سو جاتی، کیونکہ اسے صبح بہت
جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی بھی وہ کچھ دیر

نیم غنودگی کی کیفیت میں ماہ نور کی باتوں پہ سر ہلاتی رہی
اور پھر جلد ہی نیند کی دلدلیوں میں کم ہو گئی۔ رات گئے

تک جاگنے کی عادی ماہ نور کی آنکھوں سے نیند کو سوس
دور تھی۔ اس نے کچھ دیر موبائل پہ گیم کھیلی، پھر

فرنڈز کو مسیجز کرتی رہی، مگر جلد ہی وہ ان دونوں
مصروفیات سے اکتا گئی۔ وہ لیڈیز کے لیے مخصوص

ڈبے میں تھیں۔ تقریباً سب ہی خواتین حسب توقع
باتیں بکھارنے کے بعد اونگھ رہی تھیں۔ ماہ نور متلاشی

نگاہوں سے اوپر اوپر دیکھتے ہوئے اپنے لیے کوئی
دلچسپی ڈھونڈتی رہی، مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی

میں سے وہ اپنا دل بہلا لیتی۔

”ہاں نہیں یہ اس زلزلہ نما میں اتنے آرام سے کسے
سہ گئی۔ اس نے سوچا تھا تب ہی کسی چیز نے اس کی
ماری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی۔“

انعم کے شوڈر بیگ سے جھانکتی اس کی پرسل
اڑی تھی۔ جسے اس نے اکثر انعم کے ہاتھ میں اس کی

رائٹنگ ٹیبل پہ، اس کے دراز میں دیکھا تھا۔ وہ یہ
اڑی اچھا ناظم پاس ثابت ہوگی۔ اس نے بہت احتیاط

سے پوری زپ کھولی اور ڈائری نکال کر ہاتھ میں پکڑنے
کے بعد اسی احتیاط سے زپ بند کر کے بیگ انعم کے

پهلوی میں ڈال دیا۔ بیگ اس کے پاس رکھنے کے بعد اس
نے ایک تجزیاتی نگاہ انعم پہ ڈالی وہ یقیناً ”گہری نیند میں

تھی۔ اس نے ذرا سامخ موڑ کر انعم کی طرف پشت
کر لی اور سیٹ پر جیسے تیسے کر کے اتنی پالتی ماری۔

مارے تجسس کے اس نے کھٹ سے ڈائری کھولی
تھی۔ اس میں سے کچھ نکل کر گر اٹھا، نور نے ذرا سا

بھٹک کر اسے اٹھایا، یہ کوئی مڑی مڑی سی تصویر تھی جو
کافی پرانی تھی اور اس کے کونوں کو اس مہارت موڑا گیا

کہ لگ رہا تھا کہ درمیان میں موجود ساتھ ساتھ کھڑے
دو افراد کے سوا کوئی چیز اس کا منظر کا حصہ نہیں ہے۔ ماہ

نور نے تصویر کھول کر دیکھی اور حیرت سے سن رہی تھی،
انعم نے کنارے موڑ کر سردان کے دائیں جانب کھڑی

ماہ نور کو پس منظر کا حصہ بنایا تھا۔ اس کی نظریں بے
انتیاری اس صفحے پہ آٹھیں جہاں سے تصویر نیچے گری

تھی۔ بڑی خوب صورت لکھائی میں ایک ہی جملہ لکھا
تھا۔

”شاید اس تصویر کے سوا ہم کبھی بھی ساتھ نہیں
”کتے۔“

ماہ نور نے سیدھے کیے ہوئے کناروں کو آزاد چھوڑا
اور ایک تخت پیچھے کی جانب مڑ گئے۔ ماہ نور ایک دفعہ پھر

ہمت کٹ کر پس منظر میں چلی گئی۔

”شنا تھا خالص جذبے اثر رکھتے ہیں، پھر ایسا کیوں
ہوتا ہے کہ میں اس کی کال ریسیو کروں تو وہ آواز بھی

نہیں پہچان پاتا؟ سارے خاندان میں میرے ہاتھ کی
چائے مشہور ہے اور وہ کہتا ہے۔ رہنے دو انعم، میں خود

بنالوں گا۔“ دنیا میں کتنے ہی خوب رو اور ذہین مرد موجود
ہیں، پھر میرے دل کے آئین میں وہی کیوں بہار بن کر

اترا جو میری بہن کا نصیب ہے، یہ دل ہمکا بھی تو کس
کے نام پہ؟ کیسی ستم ظریفی ہے یہ قدرت کی؟ میں

کروں تو کیا کروں؟ جاؤں تو کہاں جاؤں کہاں؟ مجھے تو وہ
کبھی جی بھر کے دیکھنے کو بھی نہیں ملا، پھر کیوں اس کا

نقش نقش حفظ ہو گیا مجھے؟ اس نے تو کبھی مجھے نظر بھر
کر دیکھا بھی نہیں، پھر کیوں میں اس کے من پسند

رنگوں کے سوا کچھ بہن ہی نہیں سکتی؟ کتنی خواہش
تھی میری کہ اس کے گھر کو دکھوں، اس کے ساتھ

بہت سارے دن رہوں، وہ دن میں کئی بار میرے
سامنے آئے، میرا بار بار اس سے ٹکراؤ ہو، کبھی ناشتے

کی میز پہ، کبھی لان میں بیٹھے ہوئے، کبھی لی دی دیکھنے
کے دوران۔

کتنی بے وقوف ہوں نا میں، ہمیشہ اس بات سے
نظریں چراتی آتی ہوں کہ میرا اس سے رشتہ کیا ہے؟

میرے اندر کی شرم، میرے اندر کی غیرت شاید مرچکی
ہے، جو میں ماہ نور کی مدد پر اس کی شکر گزار نہیں، بلکہ یہ

سوچ رہی ہوں کہ کاش وہ منظر سے غائب ہو جائے،
کاش یہ دن صرف ہم دونوں کے ہو جائیں۔

یہ سچ ہے کہ میرا دل اس حقیقت سے نظریں چراتا
ہے کہ وہ میرا بہنوئی ہے، مگر میرے دماغ میں تو کوئی خلا

نہیں، نہ میں بہن کا برا چاہتی ہوں، میں تو صرف اسے
جی بھر کو دکھنا چاہتی ہوں، اس کے ساتھ کو محسوس کرنا

چاہتی ہوں، اس کے ساتھ صرف اس کے ساتھ کچھ
کچھ جینا چاہتی ہوں۔ جب صرف میں اور وہ ہوں۔

پھر چاہے وہ مجھے کبھی نہ ملے، میں اسے کبھی نہ دیکھ
پاؤں، مگر کوئی یاد تو ہوگی تا میرے پاس اپنی محبت کی۔

اب تو کچھ بھی نہیں، میرے پاس کوئی ایک خوشگوار لمحہ
بھی ایسا نہیں، جس میں جھانکوں تو وہ ساتھ نظر آئے،

پاس دکھائی دے قریب محسوس ہو۔

اور میری بھولی بہن، میری معصوم سی ماہ نور، شفاف آنکھوں والی ننھی بری اگر میرے دل کا میلا پن میری نظر کی چوری دیکھ لے تو میں کیسے نظریں ملاؤں گی اس سے؟ اگر وہ جان جائے تو نہ جانے کتنی قیاسیں ٹوٹ پڑیں اس پر۔

آج کی تاریخ میں اتنے ہی صفحات لکھے گئے تھے یہ بے ربط سے جملے اس بات کے شاہد تھے کہ انہیں بہت اہتر ذہنی حالت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ نہ جانے کب کس بات نے ماہ نور کی آنکھوں کو غم گریا اور اب وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کبھی ڈائری پہ لکھے الفاظ کو اور کبھی ہاتھ میں دبی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

”لیڈیز رائے“ ماہ نور کبل میں دو کی بیٹھی تھی جبکہ انعم زین پر بیٹھی پاس رکھے اپنی کی بیرونی جیبیں کھنکال رہی تھی جب سروان ایک ٹرے میں تین کپ چائے لے کر کمرے میں آیا۔ انعم کی چائے اس نے اس کے قریب موجود ٹیبل پر رکھی اور خود آگریڈ کی پائنٹی پہ بیٹھ گیا۔ چائے کی ٹرے اس نے اپنے اور ماہ نور کے درمیان رکھ لی تھی۔

”کیا ہوا؟ تھک گئی ہو؟“ وہ اس کے لیے متکرسا تھا۔

”نہیں۔۔۔ سروو کر رہا ہے بس۔“ اس نے ناخن کھرچتے ہوئے دوپھی سی آواز میں جواب دیا۔

”فیلٹ لانا ہوں۔“ وہ فوراً اٹھا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر مڑا۔

”تم نے تو ڈنر بھی نہیں کیا، فیلٹ بھلا کیسے دوں تمہیں؟ اچھا یہ چائے ہی لے لو بس اور سو جاؤ، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے کہتے ہوئے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر اس کی طرف برہایا، پھر وہ انعم سے مخاطب ہوا۔

”انعم! اگر ابھی کرنے والا تمہارا کوئی کام ہے تو تم باہر لاؤنج میں کر لو۔“ مختصر سی بات کر کے وہ اس کا

جواب سننے کو بھی نہیں رکا تھا۔ اور پھر سے ماہ نور کی جانب متوجہ ہو گیا تھا ”اور تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اجنبی لگ رہی ہو اتنی خاموش بیٹھی ہوئی۔“

ماہ نور اس کی بات پہ ہلکا سا مسکرائی، اس نے اٹھتے ہوئے گڈ ٹائٹ کہا اور روم سے باہر نکل گیا۔

”سروا دوں؟“ اس کے فسوں سے آزاد ہوتے ہی وہ ماہ نور کے قریب آ بیٹھی۔

”نہیں۔ اسے سنبھال لو۔“ ماہ نور نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ہاتھ کبل سے باہر نکال کر ڈائری اس کی گود میں رکھ دی۔ انعم کے لب ذرا سے وا ہوئے مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ اس کا ذہن ضرور آندھیوں کی زد میں آیا تھا۔ مگر اسے خود پہ اتنا کنٹرول حاصل تھا کہ کوئی اس کے چہرے سے اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ابھی ابھی لگنے والا جھٹکا اس کے لیے کتنا شدید تھا۔

کمر کی پہ گرے دیں پردوں سے چمن چمن کر آتی سورج کی روشنی اس بات کی پیا میر تھی کہ دن چڑھ آیا ہے۔ ماہ نور کی نیند پوری ہو چکی تھی، مگر وہ پھر بھی ابھی تک سست سی ہوئی کبل میں بڑی تھی۔ بادل خواستہ ناہی اٹھی اور پاؤں میں چپل اڑس کر جمائیاں روکتی ہوئی باہر نکل آئی۔

سروان کا پارٹمنٹ بہت مختصر سا تھا۔ دو ننھے سے کمرے جن میں سے ایک کو اس نے ڈرائنگ روم کی شکل دے رکھی تھی اور ایک بیڈ روم کے طور پر اس کے زیر استعمال تھا۔ کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ کچن بھی مختصر سا ہی تھا۔ اور ایک طرف ایک ننھی سی کیلری نما راہ واری تھی جو تازہ ہوا کے گزیر کے لیے تھی۔ ماہ نور سیدھا کچن کی طرف آئی۔ لاؤنج کی طرح یہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ انعم کی تلاش میں سروان کے کمرے کی طرف بڑھی مگر اچانک ایک منظر نے اس کی آنکھوں کو باندھ لیا۔ چوڑی سی سلیب کے سامنے دو اسٹول قریب قریب پڑے تھے۔ جیسے انہیں کرسی کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ سلیب پر

ہالے کے دو خالی کپ بھی موجود تھے۔ نہ جانے کتنی دیر وہیں کھڑی رہتی، مگر کسی آہٹ نے اسے اس منظر کے اثر سے آزاد کرا دیا۔ وہ پیچھے کی طرف مڑی۔ انعم ہاتھ میں کوئی چیز لیے سروان کے کمرے سے نکل رہا تھی۔ ماہ نور کی گہری جاچتی نظروں نے اسے ذرا سا زور دیا۔

”وہ رات سروان نے ہمیں اپنے روم میں ٹھہرایا تھا اور خود اسے ڈرائنگ روم میں سونا پڑا تو صبح جاتے دے وہ مجھے بتا گیا کہ کمرے میں کچھ چیخنگ کر کے اسے عارضی طور پر بیڈ روم بنادوں۔“

انعم نے لمبی چوڑی وضاحت دی۔ ماہ نور کا دل ہنس سے بھر گیا۔ یہ کیسے حالات پیدا ہو گئے کہ اب انعم اسے اپنے اٹھنے بیٹھنے کی بھی وضاحت دیتے لگی تھی۔ ماحول کی سختی کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے اسی شگفتہ سے لہجے میں پوچھا ”آفس چلا گیا؟“

”ہاں۔۔۔ ساڑھے آٹھ بجے ہی چلا گیا تھا۔“

”چھا پھر میرا ناشتا بنادو۔“ ماہ نور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس کی اس بات پہ انعم کھل ہی اٹھی اور پھر اسے اس کا ناشتا بنانے میں جت لگی۔

کلرز، اسکچوز، ایرل، کیونس اور انعم کے مہارت سے چلتے ہاتھ۔ اس سب میں انعم کہیں کھو ہی گئی تھی۔ انہیں آج یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ انعم اور سروان جا کر ایگزہبیشن کے لیے انٹری بھی کر آئے تھے اور وہ تھیم بھی لے آئے تھے۔ جس کو اسٹیپ وائز پینٹ کر کے تین ہشتنگز کی صورت ڈھیلے کرنا تھا۔ اسے انعم مصوفیت کے بہانے اس سے فرار چاہ رہی تھی۔ ماہ نور کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس آگئی۔ کچھ دیر کا آپ کے عالم میں فون کی جانب دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نمبر ڈائل کر ہی لیا۔ غالباً ”تیسری ٹیل“

”ہاں! امام علیکم پھپھو! کیسی ہیں آپ؟“ وہ تنہیم

پھپھو کی آواز سن کر کھل اٹھی۔

”ٹھیک ہوں میرے چاند، تمہارا دل لگا؟ پریشان کر کے رکھ دیا سب کو۔“ وہ بیک وقت اسے پکار بھی رہی تھیں اور اپنی فکر مندی کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔

”پھپھو! جھڑی سے کہیں مجھے آکر لے جائے۔“

نم سی آواز میں درخواست کی گئی۔

”کہاں لے جائے میرے بچے؟“

”آپ کے پاس، میں آپ کی گود میں سر رکھنا چاہتی ہوں، پھپھو! یہاں نہیں رہا جا رہا مجھ سے۔“

”بیٹا! تھوڑے سے ہی تو دن ہیں، جیسے تیسے کر کے گزار لو میری جان۔“

”ان تھوڑے سے دنوں میں میرا دم گھٹ گیا تو؟“

”نہیں چندا اللہ نہ کرے۔“

”پھپھو! مجھے یہاں کی خاموشی سے خوف آنے لگا ہے، آپ کو پتا ہے ناشائی سے کتنی وحشت ہوتی ہے مجھے، پھپھو! ان لوگوں کے پاس ٹائم نہیں اور میں ذہنی بیمار بن جاؤں گی ان کے بچہ رو کر۔“

”کب ٹائم نہیں ہوا نور؟ کتنی دفعہ تو سروان نے تمہیں باہر جانے کا کہا، تم ان کے ساتھ خود ہی نہیں نکلتیں۔“

”پھپھو! مجھ سے نہیں جایا جاتا ایسی جگہوں پہ جہاں ڈھیر سارے آفیشل یا کانغذی معاملات نمٹانے ہوں۔“

”تو میری لعل! پھر ان دونوں سے بدگمان تو مت ہو۔“

”پھپھو! آپ مجھے اپنے گھر نہیں بلوانا چاہتیں نا؟ کتنی کی ملاقاتیں ہوئی ہیں ہماری منگنی کے بعد، خود تو آپ آتی نہیں، مجھ پر بھی پابندی لگادی۔“ وہ پھٹ ہی پڑی۔

”میرے بچے! دنیا والوں کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ سروان سے منسوب ہو کر ہمارے گھر آکر رہو گی تو لوگ باتیں کریں گے نا۔“ انہوں نے اسے رسلن سے سمجھایا۔

”میں یہاں بھی تو سروان کے گھر ٹھہری ہوئی ہوں۔“

”لیکن بیٹا! اس گھر میں تمہارے قیام کی کسی کو خبر نہیں، سب کو یہ ہی پتا ہے کہ تم دونوں ہاسٹل میں رہ رہی ہو۔ اگر تم ٹیکسلا آگئیں تو یہاں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت فیصل آباد کے لیے رخت سفر باندھے رکھتا ہے پھر ادھر کے رشتہ داروں کو پتا چل جائے گا اور کتنی غلط بات ہوگی نا؟“

”کون سے رشتہ دار پھپھو؟ میرے نہیال والے؟ آپ کے سرالی یا فیصل آباد والے محلے دار؟ کیا ان میں سے کوئی بھی ماہ نور سے زیادہ اہم ہے؟“

”نہیں ہے۔“ پھپھو نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

”تو پھر جیڑی کو بھیج دیں۔ میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی ورنہ۔“

”نور بیٹا! اتنا جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟“

”اس لیے کہ اتنی قریب آکر رہا نہیں جا رہا مجھ سے۔ پھپھو ایلوچی کسی کو پتا نہیں چلے گا، لیکن میں یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتی کوفت ہونے لگی ہے مجھے۔ پتا نہیں کتنی مٹی سوچیں آتی رہتی ہیں، خالی دماغ میں اکیلے بیٹھ کر۔“ اس کے پاس ان کی ہر بات کا جواب موجود تھا۔ اس نے یہ طے کر کے انہیں فون ملایا تھا کہ اپنی منوا کر ہی دم لے گی اور وہی ہوا۔ پھپھو نے یہ کہتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے کہ ”اچھا میں جیڑی کو بھیجیتی ہوں آج ہی۔“

”تم کیوں جا رہی ہو؟“ وہ مصروف سے انداز میں اپنے کپڑے مشترکہ اپنی سے نکال کر ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھ رہی تھی جب انعم نے اس سے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں خود کو یہاں مس فٹ فیل کر رہی ہوں۔“

”نور! ہوا پس چلے چلتے ہیں۔“

”کیوں؟ واپس کیوں؟ تم تو اس میرویکل (معجزہ) کے انتظار میں تھیں تاکہ کوئی جاوڑی چھڑی آئے اور مجھے منظر سے غائب کر دے تو دیکھو اللہ نے میرا دل اچاٹ کر دیا یہاں سے۔“

”اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو؟“ وہ روپائی ہو گئی۔

”ہو نہ ہو۔ بدگمانی؟ تمہاری پاکیزہ ترائی محبت سے بڑی حقیقت تو ہماری ملگنی بھی نہیں اور تم اسے محض میرا گمان کہہ رہی ہو۔“

”مجھے معاف کر دو، میرے باغی دل کی سرکشی کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔“

ماہ نور کے سخت لہجے پر انعم کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جانتی ہو کتنا نامناسب ہے تمہارا جانا؟ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو؟“ وہ دھیسے لہجے میں بولی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر انعم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”انعم!“

”کو۔“ ایک لفظی اجازت۔

”کچھ الٹا ہو گیا تو تمہاری لگ۔ سب سیدھا رہا تو میرا زور اور بخت!“

”اللہ نہ کرے۔“ انعم دل ہی گئی۔ ”تمہارے ساتھ کچھ الٹا ہو گا تو میں اسے اپنی گڈ لک سمجھوں گی؟ سوچ بھی کیسے لیا تم نے؟“

”جہاں ہماری سوچ ختم ہوتی ہے وہیں قسمت کا کھیل شروع ہوتا ہے نہ جانے یہ کھیل میری جھولی میں جیت ڈالے گا یا ہار۔“

”وہ۔“ تو تم اس لیے منظر سے غائب ہو رہی ہو تاکہ حالات کو واقعات میں نقب زنی کا موقع ملے۔ کتنی عجیب ہو تم اپنی متاع کل لگا رہی ہو اس کھیل تماشے میں؟“

انعم نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے سر جھکا لیا، مگر بولی کچھ نہیں۔

”کیوں یہ ظلم کرنے لگی ہو؟ میرے اور سروان کے ساتھ کیا دشمنی ہے تمہیں؟ جانتی ہو اگر اس کے رنگ ڈھنگ بدلے تو بددیانت کہلائے گا وہ، میں لڑکھرائی تو

نامحب کے نام سے جانی جاؤں گی، کیوں اتنے بھاری اعمال کے بوجھ تلے لانا چاہتی ہو تم؟ ہمیں؟“

انعم کے لہجے میں کیسے گئے سوالات نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

”یعنی تمہارے لاشعور میں بھی کہیں یہ ہے کہ اگر اس کھیل میں ماہ نور نے اپنے لیے جواری کا گروار منتخب کیا تو وہ فلاح ہو جائے گی؟“ اس کے عجیب سے انداز میں کیسے گئے سوال۔ ”انعم گڑبگڑا کر رہ گئی۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی کہ تردید کرنا بھی مشکل لگنے لگا اسے۔

”سنو انعم عابد!“ اس نے بہت بدلے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ انعم کسی انہونی کے احساس سے بدک کر پیچھے ہٹی اور خوف زدہ نگاہوں سے ماہ نور کی جانب دیکھنے لگی، وہ کہہ رہی تھی۔

”اگر تم جیتیں تو سروان تمہارا، میں جیتی تو ماہ نور تمہاری۔“

”لگ۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ وہ واقعی سمجھ نہیں پاتی۔

”میں تمہاری پاک دامنی کی، تمہارے مضبوط ارادوں کی تمہارے ضبط نفس کی مرید ہو جاؤں گی اگر سروان میرا ہی رہا تو۔“ اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تھا ”انعم کا حلق خشک ہو گیا۔“

”نور! میں آج ہی واپس چلی جاتی ہوں۔“ وہ بمشکل کہہ کر شاید پایا کو فون کرنے کے لیے مڑی تھی جب ماہ نور نے اسے کلائی سے دوچ لیا۔ اس نے اتنی شدت سے انعم کی کلائی کو اپنی گرفت میں لیا تھا کہ مارے تکلیف کے انعم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”ایسے نہیں انعم! مجھے کون سنسنگو کڑی چاہیے، یوں تو میں ساری عمر تم سے خوف زدہ ہی رہوں گی کہ نہ جانے کب تمہاری محبت کا سحر چل جائے اور وہ تمہارے زیر اثر آجائے۔“

وہ آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے قطعی انداز میں کہہ رہی تھی ”انعم روپائی ہو گئی اور بولی۔“

”اتنی کم طرف نہیں ہوں کہ اسے تم سے چھیننے

”کل۔“

”تمہارا ظرف ٹھیک سات روز بعد اپنی جسم حالت میں میرے سامنے ہو گا۔“ ماہ نور نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”زندگی کھیل نہیں ہے نور!“ انعم نے بے بسی سے کہا۔

”کھیل نہیں، مگر مقابلہ ضرور ہے اور میں تم سے یہ احسان تو کبھی نہیں لوں گی کہ تم میرے لیے میدان خالی چھوڑ جاؤ اور میں بلا مقابلہ منتخب ہوں۔ مجھے اپنا وجود منوانا ہے اپنی اہمیت تسلیم کرانی ہے تم سے بھیک نہیں لینی۔“

اس کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”نور! کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ میرا تھا ہی کب جو میں اسے تم کو بھیک دوں گی، وہ تو ہے ہی تمہارا۔ میں تو تم دونوں کے درمیان کہیں ہوں ہی نہیں۔“

”کاش تم واقعی اتنی حقیقت پسند ہو تیں انعم بی بی!“

ماہ نور نے طنز سے کہا۔

انعم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی، ماہ نور کے انداز و اطوار نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ ضدی سی نور جو ٹھان چکی ہے وہی کرے گی۔ وہ بے بسی سے لب چبانے لگی۔

دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی۔ چند لمحے اسے انتظار کرنا پڑا تھا، پھر انعم نے دروازہ کھول دیا۔

”انعم یو کمین ٹرسٹ ی۔“ غالباً وہ مٹی کی آواز سن چکا تھا۔ اگرچہ اس نے زری سے ہی کہا تھا، مگر اس کے لہجے میں جو مسکراتا تھا اس نے انعم پہ گھڑوں پانی پھیر دیا۔

”وہ۔“ اسے فوری طور پر کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

”اس اوکے۔“ سروان نے اس کی شکل آسلن کر دی۔ ”مجھے بتاؤ، اندر آجاؤں یا یہیں سے وینٹری کی طرح چائے پوے کر لوٹ جاؤں؟“ اسے دروازے سے ہٹتی ہی بنی۔

”چائے اچھی بناتا ہوں نا میں؟“ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے دوستانہ سے انداز میں پوچھا ”انعم“ نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ اثبات میں سر ہلادیا۔

”کتنا کام رہ گیا ہے تمہارا؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا ہوا کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ انعم تمام آداب بھلا کر کونے میں پڑی چیئر پر جا بیٹھی کیونکہ یہی ایک چیز تھی جو کاؤچ سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر پڑی تھی۔

”آئی نو انعم! ہم میں کزنزوالی روایتی بے تکلفی کبھی نہیں رہی، مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ ماہ نور کے جانے کے بعد تم کچھ زیادہ ہی ان ایزی ہو گئی ہو، میں تو صرف تمہیں ریلیکس کرنے کے لیے تم سے بات کرتا ہوں۔ نور تو یہاں کے ماحول سے گھبرا کر چلی گئی، مگر تمہارا یہاں ٹھہرنے رہنا تمہارے فیوچر کے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم اتنی ڈسٹرب ہو تو میں کسی ہاسٹل میں یا ہوٹل میں ایریج کرا دیتا ہوں۔“

وہ چائے کی چسکیں لیتے ہوئے آہستہ آہستہ بولتا رہا ”انعم نے جب اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کب کو سختی سے باتوں میں تھلے کسی غیر مرئی نقطے پر نظر سجمائے کا تعلق سی بیٹھی تھی۔ اسے اس سے وہ بہت گریس فل سی لگی۔ وہ یہاں پر بیٹھی اتنی بچ رہی تھی کہ اسے لگا اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو یہ کونہ اور الگ تھا وہ اتنی بے نیازی سے بیٹھی تھی کہ لگا جیسے کوئی مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو وہ کونہ جیسے اس کے وجود سے بچ گیا تھا۔

”انعم!“ اس نے اسے شریک گفتگو کرنا چاہا۔ انعم نے ذرا سا سر اوپر اٹھا کر اپنے ہمہ تن گوش ہونے کا ثبوت دیا۔

”تمہارا اور میرا مزاج بہت ملتا ہے، پسند نا پسند سنجیدگی، منانت ہر بات۔ تم اتنی پرفیکٹ لگ رہی ہو یہاں بیٹھی ہوئی کہ یوں لگ رہا ہے تم اس منظر کا سب سے اہم حصہ ہو۔ یوں لگ رہا ہے کہ تم انہیں تو یہ جگہ دیر ان ہو جائے گی۔“

وہ اپنی ہی رو میں کہے گیا یہ جانے بغیر کہ اس کے الفاظ انعم کے دل پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں اس نے

گھبرا کر سر اٹھایا، پہلے خود کو اور پھر کمرے کے در و دیوار کو دیکھا، آخر میں اس کی نظریں سروان کے چہرے پر آ گئیں، وہ اسی کی جانب متوجہ تھا۔ انعم سے نظریں چار ہونے پر اس کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ دھڑکن کی لے کیا بدلی، یکایک آنکھوں میں شوق کا اک جہان آباد ہو گیا۔

سروان کے لیے یہ لمحہ اثر تھا۔ کوئی جذبہ بہت ہی لطیف انداز میں اپنا وجود منوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب ہی اس کے وجود کو سرشاری کی چمک نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ انعم کے لیے یہ لمحہ خبر تھا جو اسے ایک ایسی فتح کی نوید دے گیا تھا جس نے اس کے جسم سے توانائی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ ان چابی جیت اس کی ذات کو آندھیوں کے حوالے کر کے اسے بے جان سا کر گئی تھی۔

”یہ جو میرے ساتھ ہو رہا ہے کیا یہ انعم نے کیا؟“ وہ ٹھنڈوں میں سردے سوچ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اضطرابی کیفیت میں بائیں ہاتھ کی انگلی میں موجود چھلے کو حرکت دے رہی تھیں۔

”شاید نہیں۔ بلکہ وہ تو اس بات سے شاید خوش بھی نہیں ہے۔“

”پھر یہ پھر کیوں یہ ہو گیا؟ سروان؟ سروان تو کبھی اتنا دل پھینک نہیں رہا اور میں؟ مجھ میں کیا کمی ہے؟“

موبائل کی ہپ نے اس کی سوچوں کا ارتکاز توڑ دیا تھا۔ سروان کی کال تھی۔

”نور! مجھے معاف کرو نا پلیز۔“ پہلی سا انداز تھا۔

”سروان! رشتے اتنے کچے تو نہیں ہوتے کہ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جائیں۔“

”آئی ٹو لٹل گرل۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، اتنا ہی جتنا کہ فیملی کا کوئی بھی اور فرد کرتا ہے، بٹ میں کیا کروں؟ میں تمہیں یہ تکلیف دینے پر مجبور ہوں۔ آئی ہو نو اسپیشل فیلنگز فار یو۔ میں تمہارے اور

اپنے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا، تم مجھے بہت عزیز ہو۔“

”پہلی عزیز سے جینے کا جواز ہی چھیننا چاہتے ہو؟“ وہ رو بہی بڑی۔

”میں میری گریا، میری دوست میری پیاری کزن، تم بہت اسپیشل ہو، آدمی اور عورتی، نئی ہوئی توجہ تمہارا مقدر کیسے بنے دلا؟ تم تو شدتوں اور وارفتگیوں کی حق دار ہو اور میں تقسیم ہو چکا ہوں۔ میں تمہیں خود سے منسوب کر کے تمہاری ذات میں خلا نہیں پیدا ہونے دیتا چاہتا۔“

وہ اسے سنبھالا دیتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنے قطعی فیصلے کا یقین دل رہا تھا۔

”سروان! مجھے ہر خلا منظور، جب تم میرے لیے اتنا سوچ سکتے ہو تو میں بھی تم سے کو آریٹ کر سکتی ہوں، میں تمہیں سپیشل ہونے کا ٹائم دوں گی۔ تمہیں واپسی کے لیے جتنا وقت چاہیے میں۔“

”ماہ نور پلیز۔“ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کی بات کالی۔ ”میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے شرمندہ ضرور ہوں، مگر تمہارے متعلق میرے دل میں اس وقت جو واحد خواہش ہے وہ یہ کہ تم مجھے معاف کرو۔ اس کے سوا میرے پاس تم سے وابستہ کوئی تمنا تک نہیں، آئی ہو فٹہنگ فار یو۔“

”ایسا بھی کیا ہو گیا اتنے سے وقت میں کہ تمہارے پاس میرے لیے کچھ بھی نہیں رہا؟“ آواز کی نمی چھپانے پر اب اس کا اختیار نہیں رہا تھا۔

”بات سالوں صدیوں کی نہیں ہوتی یہ تو کوئی ایک لمحہ ہوتا ہے جو ہمارے ارد گرد اجالا کر دیتا ہے۔“

سروان نے بڑے جذب کے عالم میں کہا۔

”اور آپ کسی کی دنیا تاریک کر دیتے ہیں۔“ ماہ نور نے تلخی سے بھر دیا۔

”وہ ٹھو ماہ نور! میں بہت اسپیشل فارورڈ بندہ ہوں۔ یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ نظر ثانی کی تجوائش نہیں ہے یا را! میں خود بہت تکلیف سے گزارا

ہوں اس بات کی وجہ سے۔ مگر غیر جانب دارانہ تجرہ کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ انعم نہ بھی ہوئی تب بھی میں اور تم خوش حال زندگی نہ گزار سکتے۔ ہم مشرق و مغرب ہیں۔ آئی نو کہ یہ باتیں مجھے بہت پہلے سوچنی چاہیے تھیں، مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ تم اس بات کو جتنی جلدی قبول کر لو گی اتنی ہی آسانی ہو گی تمہارے لیے اور پلیز آئی ریکوئسٹ ہو انعم کے خلاف کدورت مت رکھنا دل میں۔ شی رٹکی لوز یو۔“ (وہ تم سے واقعی محبت کرتی ہے)۔

سروان نے خاصا وقت صرف کر کے بڑی مہارت سے تابوت میں آخری کیل ٹھوکی۔ اب تو کوئی درز بھی نہ بچی تھی۔

کھیل تماشا اختتام پذیر ہوا۔ چاروں شانے چت سروان ہوا تھا اور شکست کا درد ماہ نور کو سہاڑا۔

انعم کا کردار خاموش تماشائی سے بھی کم متحرک رہا، مگر پھر بھی قسمت نے کسی کے دل کی رونق چھین کر اس کی مانگ میں ستارے سجادیے۔ مگر وہ جس نے یہ تماشا سجایا تھا۔ وہ ٹوٹ گئی تھی، بکھر گئی تھی۔ موم کی بنی وہ لڑکی جو جیت کے یقینی احساس سے سرشار تھی ہار کا سامنا کرنے پائی تھی۔ وہ تو ماہ نور تھی، جو جلتا جاتی ہی نہ تھی۔ لمحہ بھر ہی تو لگا تھا اور حالات کے گرم پھپھرے اسے وجود سے لاش میں بدل گئے۔ حالات کی حدت نے اسے ہلک جھپکنے میں نکل لیا۔ اس نے بساط ضرور سجائی تھی، مگر سروان پر اندھے اعتماد کے ساتھ۔ یہ اعتماد اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑا کرتا تھا، پھر بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس اعتماد کی موت کے بعد بھی وہ جیتی رہتی، وہ چلی گئی، مگر بڑی دلچسپی کے ساتھ سروان کی انگوٹھی پہنے ہوئے اس سے منسوب رہتے ہوئے اس کی منگیتر کھلاتے ہوئے ہی۔

بازی عشق کی تھی تو اسے تھوڑا حوصلہ بھی چاہیے تھا۔ اس بازی میں ہارنے والوں کو مات کہاں ہوتی ہے مگر وہ جھوٹے سے دل کی مالک حوصلہ ہی ہار گئی۔



جنا کر ڈھلوان کی طرف پھسلتی سائیکل نہیں چلائی تھی۔ اور جسے ایسی سائیکل چلانے کا تجربہ ہو، وہی جانتا ہے اس میں کتنا مزہ ہے۔

اٹے ہاتھ پر اسٹاف کالونی کے گھر جو پہاڑی کے اوپر تھے اور نیچے چٹیل میدان سے سیدھے ہاتھ پر کلج کی وسیع و عریض بلڈنگ کلج کے سامنے بڑا سا گراؤنڈ اور اس کے سامنے مل کھا نا گراؤنڈ میں اترتا رہتے۔ اس نے پیڈل پر ماؤں مار کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سائیکل ڈھلوان پر اترنے کے لیے اس سے زیادہ پر جوش تھی۔ مگر آہ اب اللہ جانے پہلے وہ ڈری یا سائیکل۔ دونوں رک گئیں۔

اس نے تیزی سے پیرجمائے مکالے گیٹ سے اندر

مسجد والی چڑھائی پر پہنچ کر اس نے سائیکل روکی اور طمانیت سے چاروں جانب نگاہ دوڑائی تو سارا کلج وسیع و عریض گراؤنڈ یا ونڈری وال اور باہر میں روڈ پر چلتی گاڑیاں سب نظروں کے سامنے سج گیا۔ احمر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ سائیکل لے کر باہر نکل آئی تھی۔ رات بھر شدید بارش ہوئی تھی اور صبح سے سورج بھی بادل اوڑھ چھپ بیٹھا تھا اس لیے کراچی کی سردی سے خائف لوگ کسبوں رضائیوں میں خود کو چھپائے سردی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہیں کوئی اکاؤ کا بندہ بشری باہر نکلا تھا۔

بڑا زمانہ ہی گزرا اس نے چڑھائی پر کھڑے ہو پیڈل پر دو چار یاؤں مار کے پھر ہاتھ سینے پر لپیٹ یاؤں پیڈل پر

مکھلنا ہائی



آتے مومن بھائی پر اسے یقین تھا کہ اتنی دور سے بھی وہ اسے دیکھ چکے ہیں۔ سیاہ جینز پر سیاہ جیکٹ کا لکڑے تھے۔ یہ کوئی سرسبز شاداب پہاڑی علاقہ تو تھا نہیں۔ کراچی کے سوکھے مٹی پہاڑ تھے جنہیں کٹ کٹ کر شہر کو پھیلاتے جا رہے تھے مگر اس وقت بارش کے بعد یہاں لگی جھاڑیاں اور خوردو ننھے پودے بھی دھل کر نکھر گئے تھے۔

اب جو ہو سو ہو۔ اس نے آگے بڑھتے مومن بھائی کو دیکھا پھر سیڈل پر تین چار پاؤں مار کے ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے اور بریک پر ہاتھ رکھا جب اگلا پتہ مومن بھائی کے گھٹنے سے ٹکرایا۔ انہوں نے اپنا اور اس کا بچاؤ کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پکڑا۔

”ہائے مومن بھائی! اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا بڑا اچھا لگا۔“

”جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔“ مومن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ تمہاری آنکھیں چغلی کھانے لگتی ہیں لڑکی!“

”کیا مطلب؟ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ بہت دنوں بعد نہیں آئے یا مجھے اچھا نہیں لگا؟“ وہ ڈھٹائی پر اتر آئی۔

”ترو نیچے۔ تمہاری شامت یقینی ہے لڑھکتے نیچے گروگی ورنہ احرار تو ہے ہی موقع کی تلاش میں۔“

وہ زور سے ہنس دی اور نیچے اتر آئی اب سائیکل ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔ ”۴ پیس گویاں اپنے پاس رکھیں۔ آپ اتنے دن سے تھے کہاں۔ ڈیڑھ مہینہ تو ہو گیا ہے آپ کو آئے ہوئے بلکہ وہ بھی بشری آئی کے ہاں، ویسے میں ملے تھے۔ صحیح ہے نا؟“

”بالکل درست مگر میں مصروف تھا، ایگرام کی تیاری میں۔ اپنے بھی اور بچوں کے بھی۔“

مومن اپنے اسٹوڈنٹس کو ہمیشہ نیچے کہتے تھے ”۴ تے عرصے بعد آتے ہیں تو گ۔ بھولنے لگتے ہیں آپ کو۔“ اس نے فو معنی بات کی۔

”تم بھول گئی ہو؟“ مومن متانت سے مسکرائے۔

”میں ”لوگ“ تھوڑی ہوں۔“ اس نے پورے دانتوں کی نمائش کی۔

مومن چلتے چلتے رک گئے۔ ”محاورہ تو سنا ہوگا جسے بیٹھا نظر نہیں آیا اسے کھڑا بھی نظر نہیں آتا۔ یاد رکھنے کے لیے سامنے ہونے کی شرط نہیں یاد ہونے کے لیے دھیان کا ہونا ضروری ہے۔ کتنی بے وقوفی بلکہ انسٹنگ بات ہے کہ میں ہاتھ ہلا ہلا کر کہوں ہیلو آئی

ایمپرو پلیرنگ ایڈیٹو بلی اسینور“

”مائی گاڈ!“ عروہ نے اپنے ماتھے پر چیت لگائی۔

”اتنی انا!“ مومن کے جیسے قطعی انداز پر وہ حیران رہ گئی۔

اپنے معیار سے گر کر تجھے کیسے چاہوں سر تو دے سکتا ہوں دستار نہیں دے سکتا مومن دھیرے سے بولے۔

”اوہ نو۔“ عروہ نے سر پکڑا۔

ایک اور بھی ہے۔“ مومن نے شرارت سے اسے دیکھا۔

تجھ کو چاہا، تیری دلہیز پہ سجدہ نہ کیا وہ میرا عشق تھا اور یہ میری خود داری ہے ”ہائے مجھے چکر آرہے ہیں ہائے میں گری۔“ عروہ نے لہر کر دکھایا۔

”آرام سے آرام سے۔“ مومن نے اسے شانے سے پکڑ حاکیا۔ ”انسان بن کر چلو۔“

”خاک انسان بنوں؟ میں تو جاندار بھی نہیں رہی۔ اتنے اٹل عرا تم اتنے سوکھے بے رونق شعر میرا تو پی پی لو ہو گیا ہے ایسی باتیں سن کر یا اللہ!“ اس نے سائیکل اسٹینڈ پر لگائی اور سر پکڑ لیا۔

”اب بس کرو بہت اور ایکٹنگ ہو گئی۔“ مومن بھائی نے اسے گھورا۔ ”بارش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔“

”اب میں آپ کو شعر سناؤں گی سمجھے“ اونہوں! میں نے تمہارا موڈ خراب کیا ہے میں ہی ٹھیک کروں گا۔“ مومن نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ وہ منہ

سے کچھ نہ بولی بس منہ پھلا کر انہیں گھورا۔

یہ بادلوں کا شور یہ گھٹنکھوڑ قزبتیں بارش میں بھیجتے یہ دو راہ گیر کون ہیں ”واہ واہ مکرر ارشاد۔“ عروہ سر دھننے لگی۔

”ایسے شعر کبھی ادھر بھی۔“ اس نے آنکھوں سے اشارہ دیا۔

مومن اس کے آنکھیں نچانے پر ہنس دیے۔

”سیدھی چلو اور اب تم یوں کرو یہ میری جیکٹ پہن لو۔“ مومن نے بڑھتی بارش اور سردی کے پیش نظر کہا۔

”کیا ہو گیا ہے۔“ عروہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

”مجھے غور سے دیکھیں میں آپ کی بہن عروہ احسان کہیں آپ مجھے علشبعہ تو نہیں سمجھ رہے۔“

”ڈرامہ بند کرو اور سیدھی چلو اور مجھے یقین ہے احرار میں نہیں ہے لڑکی لہجہ آجاؤ ان مشغلوں سے۔“ مومن بھائی کو دوبارہ سائیکل والا مسئلہ یاد آیا۔

”اوہ تو کیا اب آپ بھی سبق دیں گے یہ لڑکیوں کے لیے صحیح ہے غلط ہے۔“ اس نے پیر پٹختے۔

”بالکل نہیں میرے نزدیک یہ بے ضرر عاشق ہے مگر لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ احرار میں اتج کو چھو رہا ہے پھر اس کے دوست ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اسے ایسا ویسا کچھ کہیں گے تو وہ برواشت نہیں کرے گا۔ بروفسر صاحب کا بیٹا شہر یار کبھی نہیں کہے گا تمہاری بہن کیا کر رہی ہے مگر جہاں داد خان کا بیٹا زمان خان لازمی بولے گا۔“

”یارا تمہارا بہن سائیکل پر لڑکیوں کی طرح گھومتا ہے۔ یہ کوئی اچھا بات ہے۔ احرار نہیں ابھی دلیل سے قائل نہیں کر سکتا۔ لوگ آخری فیصلہ سنا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں دلیل یا جواب سنتے ہی نہیں۔ باہر جواب دینا آئے گا نہیں اندر تم مانوگی نہیں ایسی چویشن ایکسٹریم ازم کی طرف لے جاتی ہے۔“ وہ بہت متانت سے سمجھا رہے تھے عروہ کو ان کا انداز اچھا لگ رہا تھا۔ وہ قائل بھی ہوئی۔

باہر کی نسبت اندر رہی کا کیرا خاصا گرم تھا مگر امی کی سی سی ہائے ہائے گونج رہی تھی۔ اپنے کمرے کو پاؤں کے پاس سے ذرا اوپر اٹھایا اور مومن کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

”پیر اندر کر لو۔“ مومن نے مسکراتے ہوئے تعمیل کی۔ خالہ امی باقاعدہ کپکپا رہی تھیں۔ بیڈ کی پائنتی پر دو رضائیاں تھیں ہوتی پڑی تھیں مومن نے رضائیوں پر کہنی نکالی۔

”عروہ۔ عروہ موم بتی لے آؤ۔ لائٹ نچانے کب آئے۔ سہ پہر کا وقت ہے اور بادلوں اور اس لائٹ جانے کے بعد تو جیسے آدھی رات ہو گئی ہو۔ موسم کا بھی پتا نہیں۔ کتنے دن رہے گی سردی۔ برسوں لان کے کپڑے پہنے گھوم رہی تھی اور کج ہی گیاہ سال پہلے کا سلاویٹ کا سوٹ پہننا پڑ گیا اور گیاہ سالوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو صرف پانچ چھ بار ہی بے چارے کو یکے سے لکنا نصیب ہوا ہے۔“ امی نے ”مہمان سردی“ کے اچھے خاصے لتے لے لیے مومن دل کھول کر ہنس دیے۔

امی نے پاؤں گڑھے تو مومن نے خالہ کو تشویش سے دیکھا۔ ”آپ کو بخار وغیرہ تو نہیں چڑھ رہا کیونکہ جیسے آپ کپکپا رہی ہیں۔ سردی بہر حال اتنی نہیں ہے۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے آسہ سلیم قریشی کے 3 دگش ناول

کتاب کا نام	قیمت
دو جھٹی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو کھرا آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول نگار نے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ۔ 45/- روپے

سکوائے کا پتہ:

کتبہ مہراں ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

وہ ان کے پیروں کا لرزنا محسوس کر رہے تھے۔
 ”بخار نہیں ہے بیٹا!“ ایسی بے چارگی سے گویا
 ہوئیں۔ صبح کے کام سمیٹے تو وہ ماسی کم بخت پچھلا ہاتھ
 روم دھوئے بغیر بھاگ گئی، سوجودھونا شروع کیا تو پھر
 جنت گئی کیا فرش تو کیا دیواریں۔ باسی تو بس دھول
 جھونک کر جاتی ہے۔ اتنی دیر پانی میں رہی پاؤں
 ٹھنڈے ہو گئے۔ اب کسی طور پر گرم ہونے میں
 آ نہیں رہے۔“ ایسی نے بے بس لہجے میں کتھانائی۔
 ”تو جناب! آپ لوگوں کے لیے آگنی ہے چائے۔“
 امی کے لیے ابلے آئندے آپ کے لیے کیک جو بالکل
 ایسا ہے کہ اگر میں کبھی بتاؤں تو اتنا ہی مزے دار ہو اور
 یہ مسالے دار مونگ پھلی۔“ اب سب اٹھ جائیں
 علشبه آپلی اٹھو۔ اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ مون
 نے غیر محسوس انداز میں دروازے کی سمت دیکھا۔
 ”ارے ایسر گرم کرنے کی تو کوئی گولی بھی نہیں۔“
 امی نے کہا۔

مون نے اپنے ہاتھ اندر کیے ڈرا سا اور اندر گھسے
 اور خالہ امی کے دونوں پیر دبانے شروع کر دیے۔
 ”آپ کو اس عمر میں پانی کے کام نہیں کرنے
 چاہیے تھے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دیتا ہوں۔“ اب
 وہ ایڑی مٹھیوں میں بھر بھر کے داب رہے تھے پھر
 آہستہ آہستہ اوپر ٹانگ سے ابھی ان کا ہاتھ ٹچ ہی ہوا
 تھا۔ خالہ امی کا کبل زوردار جھٹکے سے چھت تک اوپر
 اچھل گیا۔ پھر زمین بوس ہو گیا۔ امی چوکڑی مارے
 بیٹھی تھیں اور وہ اتنی دیر سے بعد احرام لگن
 ہمدردی محبت کے ساتھ علشبه کے پیر داب رہے
 تھے۔ جب تک بات ایڑی تک رہی۔ تب تک تو۔
 دراصل پہلے تو گہری نیند کے باعث علشبه کو
 احساس نہ ہوا پھر سکون بھی ملنے لگا اور سردی کم ہونے
 لگی تو وہ شرارت پر آمادہ ہوئی۔

مون کی انگلیاں جیسے ہی ایڑی سے اوپر اٹھیں
 علشبه ڈنک کھا کر اچھلی ”یا اللہ!“ مون نے ایک نظر
 علشبه کے گورے ملائم پیر دیکھے اور ان پر جمی اپنی
 ہتھیلیاں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ گرٹ لگا

کر سیدھے کھڑے ہو گئے علشبه کو اور اس کے پیروں
 کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی اثر دھابڈ سے برآمد
 ہوا ہو۔ اور عروہ۔ وہ نیچے کارپٹ پر آلتی پالتی مار کے
 بیٹھی تھی صورتحال جب سمجھ میں آئی تو کارپٹ پر
 رول ہو گئی۔ پیٹ پکڑ کے ہنستے ہنستے اس کی سانسیں
 رکنے لگیں، آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

”آپ کو ذرا فرق نہیں معلوم میرے اور امی کے
 پیروں میں؟“ علشبه نے الٹا چور کو سوال۔ منہ بنا کر
 سارا الزام ان پر تھوپ دیا۔

”مم۔ مم۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم
 بھی اس کمرے میں۔ بلکہ اس بیڈ پر۔“ مون اٹک
 گئے۔

”بلکہ اس کبل میں ہو“ عروہ نے جملہ مکمل کیا۔
 ”اب بیٹھ جائیں کھڑے کیوں ہیں۔ کسی نے سزا تو
 نہیں دی۔“ علشبه نے منہ بگاڑ کر کہا۔ وہ اپنی کلائی پر
 چڑھا بیٹھا اپنے بالوں پر چڑھانے لگی۔

”میرے اوپر کبل ڈال دو ورنہ میں گئی۔ اور تم
 اب میرے پاؤں دباؤ۔“ امی نے مون کے اڑتے رنگ
 اور حواس باختگی کو دور کرنے کے لیے ٹارٹل لہجے میں
 کہا۔

”اور دیکھ کے امی ہی کے پیر“ عروہ نے ان کے اندر
 مچھتے ہاتھوں کو دیکھا۔ مون نے ناراضی سے عروہ کا چہرہ
 دیکھا۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس نے دونوں
 ہاتھوں صلح جو یا نہ انداز میں لہرائے۔ ”بلکہ پاؤں
 چھوڑیں یہ چائے پکڑیں آپ۔“ عروہ نے ان کی
 خجالت محسوس کرتے ہوئے خود ہی پلیٹ بنا دی۔

”میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”ویسے تو آپ بڑے خرم دکھاتی ہیں۔ شرم نہیں
 آتی اتنے بڑے ہیں وہ۔ یہ کوئی مذاق ہے۔“ عروہ نے
 مون کے ہنستے ہی لے لیے۔ ”دیکھ رہی ہیں امی
 آپ؟“

”اب میں کیا کہوں بظاہر تو شرارت ہے مگر علشبه!
 مجھے اچھی نہیں لگی۔“ امی کبھی ڈانٹتی نہیں تھیں بس

لہجے کے شرار، تیزی، سختی سے اپنی کیفیت کا اظہار
 کر دیتی تھیں۔ علشبه کو پٹنگ لگ گئے۔

”مجھے کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ ہی نے گھسایا تھا اندر
 ۔ اب خوا خواہ۔ چائے دو مجھے۔“ اس نے عروہ سے
 کہا۔ مون واپس آگئے تھے اور بیڈ کے کنارے ایسے
 بیٹھے تھے جیسے بس میں ذرا سی سیٹ ملی ہو ایک لباؤٹ
 ٹرن آیا اور بندہ نیچے۔

”صحیح طرح سے اوپر ہو کر بیٹھو۔“ امی نے کبل ان
 کے پیروں پر ڈالا۔ عروہ نے امی کے ساتھ کوئی دوسرا
 قصہ چھیڑ دیا۔ علشبه کا دھیان بھی عروہ کی طرف
 ہو گیا۔

مون نے دزیرہ نگاہوں سے علشبه کا چہرہ دیکھا۔
 وہ مجسم خوب صورتی تھی، نوک پلک سے تیار، ملائم
 ریشمی بال اور۔ مون نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ بے خبری
 ہی میں سی۔ بہت غیر محسوس سی مسکراہٹ ہونٹوں
 پر روشنی کی طرح پھیلی۔ مون نے ایک بار پھر
 ”خجوری“ کی۔ موم بیوں کی دھیمی روشنی میں اس کا چہرہ
 جھلک کر رہا تھا۔ عارض پر لرزنی پلکوں کے سائے
 جیسے دو لہسن کا کرن لگا دھس۔ جو چہرے پر تن جائے تو
 چہرہ چھپ جاتا ہے۔ پلکوں پر لگی اس کرن نے
 آنکھوں کو ان کے تاثرات کو ان کے رنگ سب کو
 چھپا لیا تھا۔ جسے گھونگھٹ اٹھانے کی اجازت ملے گی۔
 آنکھوں کی کرن اس کے لیے خود بخود اٹھ جائے گی اور
 وہ بھی امیدواروں میں سے تھے بلکہ نہیں وہ امیدوار
 نہیں، تھے وہ طلب گار تھے۔ بعد احرام بھد
 شوق بعد محبت۔



”تو پھر فائنلی آپ زمیندارنی، ٹھیکیدارنی اور وہ کیا
 کہتے ہیں سرمایہ دارنی بننے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔“
 ”اتنا بہت کچھ۔“ علشبه ہنسی۔ ”میں نے تو صرف
 گھر والی بننے کا فیصلہ کیا ہے۔“

عروہ پیروں پر کبل ڈالے کتب پڑھ رہی تھی۔
 سامنے ڈرائنگ ٹیبل پر علشبه تھی۔ وہ بڑی فرصت

سے ٹائٹ کر نیم کا مساج کر رہی تھی۔ عروہ نے بہت سارے جملے جوڑے اور توڑے۔ وہ ابھی تک علشہ کے فیصلے کے حوالے سے الجھن میں تھی۔

”پہلی بار ملتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ وہی ہے جس کی آپ کو تلاش تھی؟“

علشہ کے مساج کرتے ہاتھ ٹھہر گئے اس نے آئینے میں ہی نگاہیں اٹھا کر عروہ کو دیکھا۔ ”شاید“

”سب سے پہلے کیا چیز اچھی لگی تھی؟ بات چیت تو بہت دیر بعد ہوئی۔“

”مجھ سے اتنے سوال پوچھ رہی ہو۔ تم نے بھی تو فوراً تعریف کی تھی۔ واؤ، ٹال ہنڈ سم۔“ علشہ نے اس کے انداز کی نقل اتار کے یاد کروایا۔

”تو وہ تو میں اب بھی کہہ رہی ہوں مگر ہتا نہیں کیوں ان کو سر تپا دیکھو تو“ واؤ“ ہی نکلتا ہے، پہلا ری ایکشن پھر وہ ان کی بڑی سی گاڑی مجھے تو نام بھی نہیں معلوم۔ سیاہ شیشے اور جب گاڑی پر جھنڈا لگا ہو تو بندہ زمین سے دو فٹ اونچا ہی چلتا ہے۔ وہ خود تو بعد میں نظر آئے تھے، پہلے تو ہم جیسے گاڑی کی شو شاؤ دیکھ کر ہی الرٹ ہو گئے کہ اب اندر سے جو بھی نکلے گا اس کا احترام کرنا ہے۔ دراصل ان کی پیکنگ اتنی اعلا ہے کہ اندر کی چیز کی طرف دھیان جاتا ہی نہیں۔“ عروہ آخر میں ہنس پڑی۔

علشہ نے اسٹول موڑ لیا۔ اب وہ دو بدو تھیں۔ ”تم نے اندر کو کیسے جانچ لیا؟“ علشہ کے لہجے میں شرار تھا۔

”اندر کی بات نہیں ہے آپ! مگر مجھے وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ آئی مین۔“ عروہ الجھ گئی۔ ”مجھے وہ بہت کم علم، کم فہم سے انسان محسوس ہوئے صرف ہیڈ لائن پڑھنے والے۔ میرا نہیں خیال کہ انہوں نے کبھی کسی خبر کا بقیہ پڑھنے کے لیے صفحہ پلٹ کر نمبر ڈھونڈا ہو۔ میرا مطلب۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ علشہ زور سے ہنس پڑی۔ ”وہ تو باہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔ پہلے ایبٹ آباد کی اسکوٹنگ اور باقی ساری پڑھائی باہر کی۔ تم سے۔“

کا جملہ کاٹا اور اچھل کر بولی۔ وہ مجھے ”باہر ہی کے پڑھے لگتے ہیں۔ انہوں نے ”اندر“ سے واقعی کچھ نہیں پڑھا۔“ عروہ کا چہرہ جو شیدا ہو گیا۔ وہ اپنی سوچوں کو نام نہیں دے پارہی تھی اب جیسے سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

”یہ کیسی فضول بات ہے۔“ علشہ کو برا لگا۔ ”تم نے پہلی ملاقات میں یہ سب کیسے جان لیا کہ وہ ایسے ویسے ہیں جبکہ۔“

”اور آپ نے کیسے جان لیا کہ وہ ”ایسے ویسے“ نہیں ہیں۔“ عروہ نے بات کاٹ کر تیزی سے ہاتھ ہلائے۔

”اس کے لیے دیدہ دینا کی ضرورت ہوتی ہے۔“ علشہ بات ختم کرنے کے غرض سے دوبارہ شیشے کی سمت گھوم گئی اس نے مزاحیہ کجے میں جیسے اس کی کم عمری کو حتم کیا تھا کہ وہ اس بارے میں مزید بات نہ کرے۔

وہ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے اور بس۔ عروہ نے شیشے میں اس کے چہرے کا عکس دیکھا اور پل بھر کو خاموش ہو گئی۔

”سکندر سلیمان۔ ہوں۔ نام کا بہت اثر ہے۔“

”فورا“ دیدہ دینا فعل ہو گئی کہ ”اندر“ چھپی ہوئی باتیں بھی عیاں ہو گئیں۔ مون بھائی بڑے ہی ٹھنڈے بھاگ لے کر آئے ہیں کہ آپ نے ان کی سمت نگاہ

تک نہ کی۔“

”یہاں مون کا کیا ذکر؟“ علشہ کے مساج کرتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے گردن گھمائے بغیر گھورا۔

”مون ہی کا ذکر ہے وہی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے محض دو ملاقاتوں میں فیصلہ سنا دیا جبکہ مون بھائی جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں جانتی ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور آپ۔ آپ کو۔“ عروہ کی آواز رنج سے بوجھل ہو گئی۔

”عروہ! تم چھوٹی ہو اور تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں اور نہ میں تمہیں اجازت دوں گی۔“ علشہ نے خفگی سے بڑا ہنسنے لگا۔

میں اور مجھے سچ کہنے کے لیے اجازت کی ضرورت بھی نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے وہ دو غلے ہیں۔ ان کا انداز، لہجہ، چہرہ آنکھوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ اندر سے کچھ اور ہیں رک رک کر بولتے ہیں جیسے سوچ رہے ہوں۔“

”تو میں نے بھی انہیں انکو نہیں بنوانا کہ بر جستگی اور تیزی ہو۔“ علشہ بھنائی۔

”جھوٹ زبان سے نکلنے سے پہلے دماغ میں تیار کیا جاتا ہے۔ سنوارا جاتا ہے۔ لوک پلک درست کرنی پڑتی ہے جبکہ سچا کھرا انسان وہی بولتا ہے جو سچ ہوتا ہے کیونکہ اس کے دل دماغ میں بھی سچ ہوتا ہے سو پانی کی طرح بہتا ہے۔“

”تم صاف کہو، کہنا کیا چاہتی ہو۔“ علشہ بیڈ کی پائنٹی پر ٹپک گئی۔

”صاف بات یہ ہے کہ آپ مون بھائی کو انور نہیں کر سکتیں اور وہ بھی سکندر سلیمان کے لیے نیو۔“

”مون کا یہاں کیا ذکر؟“ علشہ چڑ گئی۔

”مون ہی کا ذکر ہے آپ! وہ اتنے پولاٹ ہے، سچے رٹیل مین ہیں۔ اتنا اچھا بولتے ہیں۔ اتنے دھیمے گتے قابل اور عمدے پیسے کو سائیڈ پر لگائیں تو سکندر سلیمان، مون بھائی کے مقابلے کچھ بھی نہیں۔“ عروہ نے نفی میں سر ہلا کر جیسے علشہ کی عقل پر ماتم کیا۔

”کیا دھیمے نرم خو، ہونہ! مرو کو دنگ ہونا چاہیے۔“

”کیوں اب کی بار دنگ ٹو آپ بتائیں گی؟“ عروہ نے جل کر کہا اور کتاب چہرے کے عین سامنے کر لی۔

علشہ کچھ کہہ نہ سکی۔

”لوگ کلاس تک کر کے بالکل اسی انداز میں درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں مگر تمہاری کہانی میں کی یہ ہے کہ تم اکیلی بیٹھی ہو۔“

سامنے رکھ کے بیٹھی تھی، جب مون بھائی کی آواز پر اچھل پڑی۔ ان پر نگاہ پڑی تو دل کھول کر مسکرائی۔

”آپ یہاں کیسے؟“

”کام سے آیا تھا بلکہ آئے تھے۔ میرے ساتھ کچھ اسٹوڈنٹس بھی ہیں۔ ابھی تھوڑا کام باقی ہے، میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔“

”اور میں مل گئی۔ کینٹین چلتے ہیں۔ برائی کھائیں گے۔“ اس نے فوراً ”پروگرام ترتیب دیا۔“

”ٹھیک سے مگر مل کون دے گا۔“ مون نے چھیڑا۔

”کو رو لگے گا۔“ آپ کی موجودگی میں میں پیسے نکالوں۔“ اس نے فوراً ”آنکھیں دکھائیں، مون، ہنس دیا۔“

”چلو پھر میرے پاس بھی تقریباً ”مہنڈ ہے۔“

برائی، ہمیشہ کی طرح لذیذ تھی۔ اس نے میرا ہونٹ کھائی۔

”پیرز کی وجہ سے میں گھر تک جا ہی نہیں سکا۔ اس سنڈے کا ارادہ ہے۔ خالو صاحب بھی کیا سوچتے ہوں گے؟“

”ابھی پیرز کی وجہ سے چکر نہیں لگائے مگر آج کل کوئی کام نہیں تھا۔ ماربل لگ گیا ہے۔ گھسائی کرنی ہے اب پھر کلر کا مرحلہ اور باقی کام۔“

اس نے اپنے زیر تعمیر گھر جس کی ساری عمرانی مون بھائی کرتے تھے کہ بارے میں تفصیلی جواب دیا۔ ”سیمنٹ، بجری کا کام ختم ہو گا تو گرل اور ووڈ کا کام شروع کر دوں گا۔ میرے ایک اسٹوڈنٹ کے فادر لکڑی کا برا اچھا کام کرتے ہیں۔“

”امی کہہ رہی تھیں پیلا سے۔ آپ تو بس خواہ مخواہ کا شور مچاتے ہیں۔ سارا کام میرے بھانجے نے کیا ہے۔ پیلا کے سر پر جوں بھی نہ رہن گئی۔ کہاں کا تمہارا بھانجا۔ میرا شاگرد اور صرف اور صرف میرا شاگرد ہے ورنہ تمہارے بھانجے تو اور بھی ہیں۔ امی کے تو سر پر لگی اور کہیں نہ بچھی۔“

”یہ تو میرا فرض بنتا ہے مگر تو میرا بھی ہے یا تم ایسا نہیں سمجھتیں۔“

”نہیں نہیں بالکل نہیں، آپ ہی کا گھر ہے اور

آپ ہی کو سب کام کرنے ہیں جیسے میرا ایڈیشن، امر کے مسئلے، پلا کے ساتھ گھر بنوانے میں اہلپ کرتا، علشہ کے مسائل، اے سی ٹیک کرنے دینا، کیزر لانا، میٹرڈ لوانا، عنقریب ضرورت پڑے گی ٹینٹ، قناتیں، دیکھیں، دھول والے بازار آنا جانا، لینا دینا، کارڈ بانٹنے۔

وہ اپنا سارا وزن کرسی کی پچھلی دو ٹانگوں پر ڈال کر جھولنے لگی۔ مون کے ہاتھ میں پریج اور کپ ہونٹوں سے لگا تھا۔ یکدم رک گئے اپنی سنجیدہ سلو نظریں عروہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”کیا مطلب ہے؟“

”مطلب کیا؟؟؟ آپ امی کارائنٹ پیٹڈ اور وہ کیا پایا کے دست راست اردو میں کہتے ہیں۔ ہمارے باہر کے سارے کام تو آپ ہی نے کرنے ہیں۔ آئنزال ہمارے بڑے بھائی ہیں آپ۔“

”صاف بات کرو۔“ مون نے کپ کھسکا کر کہنیاں ٹیبل پر لگائیں وہ کرسی کے اگلے دو بیچوں پر جھک آئے تھے عروہ چند لمحوں خاموش رہی پھر بالکل ان جیسی پوزیشن میں سامنے آرکی۔ اب وہ بغور مون کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔

”صاف بات تو یہ ہے۔“ اس نے اپنے لہجے میں سنسنی پیدا کی۔ ”سکندر ٹی فوج حملہ کرنے والی ہے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ عنقریب۔ دراصل ہماری سپاہ کے کچھ لوگ ان سے ملے ہوئے ہیں۔“ آخر کار عروہ نے بول ہی دیا۔

”ان فیکٹس ہمارا سپہ سالار بھی اور۔“

”تمہارا مطلب ہے علشہ بھی؟“

”لوں ہونہ“ عروہ نے تصحیح کی۔ ”علشہ ہی۔“

”آؤ!“ مون نے ٹھنڈی سانس لی اور کرسی سیدھی کر لی۔ بازو سینے پر لیٹے پھر اگلے مل ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ چھت پر وہ کھانچا چل رہا تھا اور موسم بہت پیارا تھا پھر یکدم گھبراہٹ کیسی۔ دونوں کے درمیان ٹیبل پر خاموشی پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ اور اتنی چوڑی اتنی موتی

کہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے سے بھی گئے۔ مون نے موبائل کو چیک کیا اپنی فائلز کو بلاوجہ ترتیب دیا۔ بیگ میں یونہی فضول جھانک کر دیکھا۔

”سب ٹھیک ہی ہے۔ مجھے دکھا رہے ہیں یا خود کو بتا رہے ہیں۔“ ان کی خود ساختہ مصروفیت کو عروہ نے جانچا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ کھڑا ہونا چاہتے تھے عروہ نے سرعت سے دونوں بائیں ٹیبل پر لٹا دیں بیگ اور فائلز نیچے کر لیے۔ یقین کریں ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔

”تم کیا چاہتی ہو عروہ!“ مون اسے نیچے ہی کی طرح ٹیٹ کر رہے تھے۔

”وہی جو آپ چاہتے ہیں، پر منہ سے کہتے نہیں۔“

”میں کیا کیوں؟“ ان کی آواز میں بے چارگی اور مایوسی کھل گئی تھی۔ عروہ کو ان پر ٹوٹ کے پیار آ گیا۔

”ظہار۔ اظہار مون بھائی، کہہ دیں جو کہنا ہے۔“

”کس سے کہوں عروہ! کہنا تو اس سے جاتا ہے جو جانتا نہیں۔“ مون کا کھویا لہجہ زخمی تھا۔

”ہائیں!“ عروہ بھونچکی رہ گئی۔ ”یومین! وہ سب کچھ جو میں اور آپ جانتے ہیں۔“ علشہ کو سب کی خبر ہے، کب سے؟“

”جب سے میں جانتا ہوں تب سے۔ تم یہ کل کی پیداوار ہو یا نہ۔“

”مائی گاڈ!“ عروہ نے سر پکڑ لیا۔ ”میں تو انہیں بے خبر سمجھ کر مار جن دیتی رہی۔ کبھی کھل کر بتا ہی نہیں پائی۔ بڑی بہن ہیں نا تو میرے منہ سے نکلا ہی نہیں کہ مون بھائی۔ آئی ایم سرپرائزڈ۔“ عروہ نے شانے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”تمہارے لیے ایک مشورہ ہے بلکہ حکم سمجھو۔ اب اور کچھ نہ کہنا نہ مجھ سے اور نہ اس سے۔“ مون نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ عروہ ہلکی۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں ان سے پوچھ کر رہوں گی، میری دوستیں تو اسکول کے زمانے سے آپ پر مرنی تھیں۔ وہ تو میں

نے انہیں سمجھا بھالک دھمکا کر باز رکھا کہ خبردار یہ میرے مون بھائی ہیں میرے ہونے والے بہنوئی۔ ورنہ وہ سب آف۔“

”تمہاری دوستوں نے ابھی تک سکندر سلیمان کو نہیں دیکھا۔“ مون نے جیسے غلطی پکڑی۔

”ارے جانے دیں میری دوستیں ایسے مردوں سے اچھا خاصا چڑنی ہیں۔ ایسے بندے کی کیا اوقات جو چار بندے ساتھ لے کر نکلتا ہو اپنی حفاظت کے لیے۔“ وہ جوش خطابت میں ہاتھ ہلا ہلا کر اونچا بولنے لگی۔ مون نے بے چارگی سے خود کو کرسی پر ڈھیلے چھوڑ دیا۔



”اس نے حمایت بھائی صاحب کو بہت مایوس کیا ہے۔ بقول ان کے ساری کارآمد اولاد میں ہی ایک لگتا ہے کچھ نہیں کرے گا۔ صاف کہہ رہے تھے نکما بنے گا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرنے والا۔ اس میں وہ جوش اور شوق ہے ہی نہیں جو باقی پانچوں میں ہے بلکہ اس سے چھوٹا والا تو بھائی صاحب کا چیتا ہے، بالکل ان کا پر تو۔ کہہ رہے تھے یہ چھوٹا ہی میرا اصل جانشین ہے۔“

انہسہ نے سولہ سترہ برس کے ساتویں رنگت اور بہت خوب صورت آنکھوں والے لڑکے کامیاب سے تعارف کروایا۔ میاں نے نا بھیجی کے عالم میں بیوی اور مصنوعی شفقت سے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکا شرمندگی کے مارے پورا سر گریبان میں گھسائے ہوئے تھا۔

”اور بیوی کیا پاگل ہو گئی ہے باپ نے مجھے کھٹو کو گھر سے نکال دیا تو اب کیا ہم رکھیں گے میرا بیٹیوں والا گھر ہے۔“ وہ بیٹیوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔

”میں نے کہہ دیا سارے شر کو سدھارنے کا ٹھیکہ تو آل ریڈی ہمارے پاس ہے ہی۔ یہ بھی شامل ہو جائے صحیح کیا نا؟“ انہسہ نے سلسلہ کلام جوڑا۔

”آپ خود پڑھائیں گے۔ میں نے کہا آپ اپنے پانچ منجھل لیں، یہ ایک مجھے دے دیں، میرا کون سا کوئی بیٹا ہے۔ بس بھائی صاحب نے خود اٹھ کر اس کا بیگ بنا

دیا۔“ وہ اپنے کارنامے پر خوش تھیں۔

”یا مالک!“ وہ بیگم کے جوش و خروش کو بس دیکھ کے رہ گئے۔

”دکھاؤ اپنے کانڈ!“ انہسہ نے شرمیلے کو اشارہ کیا۔ اتنے کم عمر کو تو تو کوری بھی نہیں ملے گی اور جب باپ اور پانچ بھائیوں سے نہیں سنبھلا تو میری کیا اوقات۔ نہ چاہتے ہوئے سرٹیفکیٹ پکڑا دو چنگیوں سے۔

”ہائیں!“ فوراً دیکھے کا پیالہ نیچے رکھا اور ماتھے پر ٹکا چشمہ ناک پر ٹھہرایا۔ ”یہ تمہارے کانڈ ہیں؟“ وہ مشکوک تھے۔

”جی۔ جی۔“ وہ ہلکایا۔

انہوں نے ابا کا نام بغور پڑھا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں یہ حد سے زیادہ۔“ وہ انہسہ کی جانب مڑے۔

”نکما ہے بھائی صاحب نے یہی کہہ کر روانہ کیا ہے۔“ انہسہ ہنس دیں اور بے فکر ہو کر چھوٹی کے ساتھ لگ گئیں۔

”اوئے! یہ سارے نمبر تمہارے ہیں؟“ وہ ابھی تک مشکوک تھے۔ شرمیلے جی بھر کے شرمندہ ہو گیا۔ سر بمشکل اثبات میں ہلا۔

”تم کہہ رہی تھیں یہ نکما اور باپ کا ناخلف ہے۔“ وہ منہ کھول اور آنکھیں پھاڑے بیوی کا چہرہ دیکھنے لگے جو چھوٹی بیٹی کو میتھ کا کام کروا رہی تھیں۔

”بھائی صاحب کے لیے نکما ہی ہے۔ ان کے بڑے پانچوں ماشاء اللہ پندرہ پندرہ برس کی عمری سے باپ کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوئے اور بیس بیس برس تک اپنی دکانوں کے مالک ہو گئے۔ مین بازار میں پوری بارہ دکانیں بن گئیں اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ گز بڑا ہوتا ہے یا میٹر اور برزیاہ ہو تو موٹ کے لیے کتنا کپڑا دینا ہو گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔ گز کم ہوتا ہے۔ میٹر زیادہ اور بر کو کیلکولیٹ کر سکتے ہیں۔“

وہ اتنی دیر سے اپنی ذات کا پوسٹ مارٹم ہوتا دیکھ رہا تھا، چانک بول پڑا۔ انہسہ ایک بار پھر ہنس دیں۔

”تمہارے ہتا ہونے اور ایک دکاندار کے ہتا ہونے

میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

”ایک سال ضائع کیوں کیا؟“ وہ اب پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔

”وہاں ہمارے ایریا میں ویسا کوئی اسکول نہیں ہے جیسا میں چاہتا ہوں اور کالج تو بالکل مجھے پسند نہیں۔ پہلے تو ابانے توجہ نہیں دی اور میں نے کراچی آنے کی بات کی تو کوئی راضی نہیں ہوا لیکن میں نے سال ضائع نہیں کیا لیکن کچھ کورس کیا اور کمپیوٹر وغیرہ۔ اب بھی خالہ امی نے ابا کو راضی کیا ہے بلکہ ڈانٹا ہے تو ابابان گئے۔“

وہ بہت تیزی سے صفائی دینے لگا۔

پروفیسر احسان دل کھول کر مسکرائے۔ یہ تھانویب حمایت علی کا عروہ کے گھر میں تعارف۔

آج سے پندرہ سال پہلے سترہ برس کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد کراچی آکر پڑھنے لکھنے اور اب لیکچرر شپ کرنے والا نوبت حمایت علی۔ عروہ نے اول روز اسے مون بھائی کہا۔ اس کے لیے ساری دنیا ایک طرف اور مون کی محبت ایک طرف۔

انہسہ کو اللہ نے بہت دعاؤں کے بعد اولاد سے نوازا تھا۔ شادی کے تین سال بعد علشبا اور علشبا سے آٹھ سال بعد عروہ اور مون کے گھر آنے کے محض آٹھ ماہ بعد احمر۔

سو مون کو بغیر کسی قانونی کارروائی اس گھر کے بڑے بیٹے کا رتبہ حاصل ہو گیا۔ سب کے درمیان خلوص اور محبت قائم ہو گیا۔ انہسہ کا وہ بھانجا تھا۔ احسان صاحب کے لیے اس کی ذہانت، شرافت، فرماں برداری، محبت کا باعث تھی۔ احمر نے ہوش سنبھالتے ہی مان لیا کہ اس کی دو بہنیں اور ایک بڑے بھائی جان ہیں۔ رہی عروہ اور علشبا۔

عروہ کے لیے دنیا چند لوگوں کے گرد سمٹی ہوئی تھی۔ امی، ابا، بہن، چھوٹا بھائی، تھوڑے سے فریڈ، نیچر ز اور مون بھائی، بھائی بھائی پیارے مون بھائی۔ اور وہ گئی علشبا تو بات دراصل یہ ہوئی۔

سرورات آگ کے پھول جیسی تھی۔ خوش رنگ، خوشبودار، مگر کڑوی، چبھتی ہوئی۔ وہ کھلے آنگن میں کین کی کرسی پر خود کو کبل میں لپیٹے پیروی کو سونگھ رہی تھی۔ رات کی رانی، امروہ کے پتوں کی کٹھی پاس، بیکر اور آگ کے پھولوں کی خوشبو سرو ہوا میں مدغم ہو کر نتھوں سے فکراتی تھی۔ وہ ساری کبل میں چھپی تھی، صرف تھوڑا سا چہرہ اور انگلیاں باہر تھیں۔ اندر عروہ سے منہ ماری ہو گئی تھی۔ وہ بڑی دعاؤں کے بعد انہسہ اور احسان کی زندگی کا حصہ بنی تھی۔ آٹھ سال تک اس نے اپنی اس حیثیت کا خوب فائدہ اٹھایا پھر عروہ کے بعد اس نے بہت مشکل سے اسے اپنی زندگی کا حصہ تسلیم کیا۔ وہ پیاری بھی لگتی تھی مگر اس کی موجودگی میں انجمن بھی ہوتی تھی۔ ایک بل اسے دیکھ خوش ہوتی تو اگلے منٹ ماں کی گود میں دیکھ جھنجھلا جاتی۔ ابھی عروہ کی جگہ بنائی تھی کہ فیض حمایت علی گھر میں کھس آیا۔ پاپا کی ساری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ مون کی بے حد اچھی فطرت اس سے لگاؤ پر اکساتی تھی۔ وہ بے حد بے ضرر، خاموش، پڑھا کو اور سیدھا سادا لڑکا تھا۔ علشبا پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ پہلی بات یہ تھی کہ مون اس سے بہت زیادہ اچھا تھا۔ پہلے انہسہ اسے رات کے کھانے کے بعد گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کروانے کے لیے کچن میں بلاتی تھیں تو وہ بہانہ بنا کر ”پاپا کے ساتھ نیوز سن رہی ہوں“ بیچ نکلتی۔ پاپا بھی آوازیں دیتے ”اوہ علشبا! ادھر میرے ساتھ بیٹھو، وہ بڑے صوفے پر پاپا کے ساتھ براجمان ہو جاتی۔

پھر یوں ہوا کہ پاپا نے آوازیں دیتا بند کر دیں۔ صوفے پر اس کی نشست پر مون پاپا کے ساتھ چائے کے گھونٹ لیتا اور دھیسے لہجے میں بھرے کر تاپا کے تو مانو مزے ہو گئے۔ وہ اچھا سامع تھا مگر جب بولتا تو بہت جھجھکاؤ اور بر محل۔ علشبا کچن کی کھڑکی سے بیچ بیچ کر برتن دھوتے ہوئے اسے گھورتی اور پتیلیاں یوں مائجتی جیسے مون کا منہ کھرتا چاہتی ہو۔ سب سے بڑی معصیت سر پر یہ پڑی کہ اسے وہٹا پنپنے کا حکم مل گیا۔

علشبا کی تو مانو جان عذاب میں آگئی۔ اسکول میں وی اور اسکا راف تھا۔ گھر میں ایسے ہی کھومتی پیپا کے آنے پر شائے پر کچھ بھی دھرتی۔ اب یہ پورا وہٹا۔ گرتی پڑتی اگلی۔ نہ یہ معصیت گھر آتی نہ یہ ”معصیت“ گلے پڑتی وہ بڑبڑاتی۔

”اوہوں!“ انہسہ خفگی سے ہنکارا بھرتی۔

”ایسے نہیں کہتے بھائی ہے۔“

”ہو نہ بھائی۔ خواجوا ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ خالہ کا بیٹا بولیں۔“ وہ پیر پختی۔

پھر گھر میں تبدیلی یہ آئی کہ انہیں اللہ نے اپنا چھوٹا سا بھائی دے دیا۔

مون اپنا فارغ وقت عروہ کو کندھوں اور احمر کو گود میں بٹھائے گزارتا اس کے دو کام تھے۔ یا پڑھ رہا ہے یا پھر دونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

وہ گئی علشبا تو گھر کے اندر کبھی یہ ماحول نہیں رہا تھا کہ وہ ہم عمر کزن کے ساتھ کھل مل جائے۔ پاپا کے سامنے قطعاً نہیں اور امی بھی پاپا کے مزاج اور احکامات سے متفق تھیں۔ احسان صاحب بڑی ہوتی بیٹی کی موجودگی میں جوان لڑکے کو گھر میں رکھنے کے قطعاً حق میں نہیں تھے۔ اس بات پر بحث بھی ہوئی۔ ”آب تھوڑے دن مہمان سمجھ کر رکھ لیں، نہیں مناسب لگے گا تو ہاسٹل میں جگہ دیو اور بجے گا۔“ انہسہ بہت مان سے ہنوتی سے لڑکر لائی تھیں۔

”اتنا پڑھا کو نیک بچہ۔“ احسان صاحب طوطا ”کہا“ راضی ہوئے اور پھر مون کی دل موہ لینے والی فطرت و عادات نے انہیں اس کا گردیدہ کر دیا مگر ان کی سوچیں اندر سے وہی تھیں۔ بوائز کالج کے استاد تھے نئی پود میں بڑھتی بد اعمالیاں انہیں خوفزدہ کرتی تھیں۔

اور دوسری جانب انہسہ نے مون کو بھی شاید بہت کچھ سکھایا سمجھایا تھا کہ وہ بہت محتاط رہتا۔ علشبا سے قصداً دور رہتا علشبا میٹرک کی اسٹوڈنٹ۔ لاڈلی لاپرواہی۔ مگر اس کی سہیلیاں آفت کی پرکالہ۔

”ایک ہی گھر میں رہتا۔ اکٹھے چوبیس کھٹے کا ساتھ“

یاروہ کچھ تو کھٹائی ہو گا۔ ”حرا بہت طرار تھی۔“ ”کون سے چوبیس کھٹے۔“ آٹھ سے دوکان شام کو کوچنگ رات کو پاپا کے ساتھ گوسپ اور گھر میں میں اور وہ اکیلے نہیں میرے امی پاپا اور بہن بھائی بھی رہتے ہیں قاریو کا نڈ انفارمیشن۔ ”وہ تپ کر لہجہ کرتی۔“

”ارے نادان! کہنے والوں کے لیے موقع ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔“

”ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے۔ وہ پڑھنے آیا ہے اور بس۔“

”تو کیا جو لکھتے پڑھتے ہیں، وہ محبت نہیں کرتے۔“ حرا بھنا کر بولی۔

”محبت؟ کون سی محبت؟“ علشبا چھل پڑی۔

”کتنی پیاری ہو گوری جی! یہ بڑی بڑی آنکھیں، یہ لمبے بال اور“ حرا کھوسی گئی۔

”یعنی وہ اس لیے محبت کرے گا کہ میں پیاری ہوں اور اگر میں پیاری نہ ہوں تو۔“

”پھر بھی کرے گا۔“ ثمو جو خامشی سے استاد و شاگرد کا مباحثہ سن رہی تھی بول پڑی۔

”ساتھ رہنے سے نزدیک ہونے سے محبت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ اب تک ہوئی کیوں نہیں۔ وہ دو سال سے تمہارے گھر رہا ہے یا۔“

کچھ دوستوں کی باتیں، کچھ عمر کا تقاضا نہ جانے کب دل کی زمین پر خود بخود ایک پودا اگ آیا۔ اس خوش رنگ پودے نے دل کے اندر رنگ جڑیں پکڑ لیں جو کھیتے میں بدل گئیں اور سارا وجود کسا گیا۔ اسے کن اکھیوں سے دیکھنا اور خود کو ٹوٹ کر دوانے کا احساس امرنیل بن گیا۔ ساری ہیرا پالی غائب ہو گئی اور جڑ سے سرے تک پہلے بے فیض رنگ بکھر گئے۔

پہلے دوستوں نے بھول پن میں بتایا، وہ حسین ہے اور چند نشانیاں دس رنگ، بال، آنکھیں پھر آئینہ بولنے لگا جو سچائی کا علمبردار تھا، جو دیکھا سن و عن بیان کر دیا۔ راستے بولنے لگے راہ گیر بھی۔ دوست کہنے لگے

دشمن بھی ماننے لگے۔ مگر اس سب کا کیا فائدہ؟ جب وہ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتا۔

وہ خود میں مگن فیض حمایت علی کو سب سے چھپ کر ایک گہری نگاہ سے دیکھتی۔ پہلے حیرانی، پھر حسرت اور بعد میں ہتک۔ وہ جلدیلا کر رہ گئی۔ محبت نفرت میں بدل سکتی ہے۔ حسرت ختم ہو سکتی ہے خواہش پوری ہونے پر مگر ہتک۔ ہتک کا احساس پیدا نہیں عیب کی طرح ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی نہیں جاتا۔ وہ کہنے تو زنگاہوں سے اس کا چہرہ جانتی۔ اسکول ختم ہوا کالج۔ کالج سے یونیورسٹی۔ وہ اتنے لوگوں سے ملتی پھرتی رہی۔ اتھے لوگ بڑے لوگ۔ ایسے دیے لوگ مگر دل کے اندر اک شجر تھا محبت کا جس کی دیدگی کبھی کم نہ ہوئی۔ کبھی دل چاہتا وہ دل کھول کر رکھ دے

محبت میں ”پہلے آپ“ نہیں ہوتا لیکن تب جب محبت دونوں جانب ہو اور یہاں تو بس۔ اور شاید وہ کہہ بھی دیتی۔ نتیجے بے پروا ہو کر جو ایک روز وہ سب نہ ہوا ہوتا۔ جلتے توے پر پانی کے چھینٹے گرے۔ توے کو تو کوئی فرق نہ پڑا قطروں نے زندگی کھودی۔



”میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ سب جو تماشا اینڈ آل ویٹ۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اسے کیسے برداشت کر رہی ہیں بلکہ اس کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔“ اس نے شوکیس میں برتن رکھتی انیسہ سے پوچھا۔ اتنی بڑی دعوت تھی اور اس نے سچ سچ تنکا بھی الٹ کر نہ رکھا تھا۔ ناراضی سارے گھر سے سب سے ”تماشا مطلب۔ تمہاری بہن کا رشتہ طے کرنے میں کیا تماشا؟“ امی نے مصنوعی بھول پن سے مگن انداز میں کہا۔

”امی! آپ کو سب معلوم ہی ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ وہ لٹھ مار انداز میں بولی۔ امی کچھ نہ بولیں ”خنگ کپڑے سے پٹیں رگڑتی رہیں۔“ ”ستا میں اٹھا میں برس کی ہو گئیں آپ! کوئی

رشتہ دشتہ نہیں اب اچانک سارے کام کرنے یاد آ گئے۔ رشتہ پیدا بھی ہو گیا۔ کیا کسی نے حکم دیا ہے؟ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ بس جو کرنا ابھی کر لو۔“ وہ تپتی بیٹھی تھی۔

”سب تو معلوم ہے تمہیں۔ تمہارے پیلا کی ساری پروفیسری ایک طرف۔ پہلے خاندان میں تلاشتے رہے۔ کنوؤں میں ہائس ڈال دیے۔ اول لڑکے کم ان میں سے آوے تھے، آوے آجھے۔ آجھے۔ آجھے رہنے کس نے دیے۔ لگتا ہے ماں کے پیٹوں میں ہی بک ہو گئے۔ ہم سے ہوئیں نہیں ایسی مکاریاں کچھ کو ماؤں نے پھنسا دیا کچھ خود ہی۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئے کہ چلو اب باہر دیکھو مگر اس میں بھی شرط لگا دی اپنی ذات برادری کوئی کھو دیا تو نہیں۔ ورنہ یہیں اپنے ارد گرد کتنوں نے میرے آگے دامن پھیلا دیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہنگامی نہیں ہماری ذات کے نہیں تھے تو اب تو شکر ادا کرو خاندان کے اندر سے ہی رشتہ مل گیا۔“

اسے تفصیلی بتاتے بتاتے اخیر میں لہجہ خود کلامی میں بدل گیا۔

”ارے یہ سب معلوم ہے مجھے۔“ وہ آکتائی۔ ”وہ بتائیں جو پوچھنے بیٹھی ہوں۔ مون بھائی کو کون سا گھن لگا ہے؟ آخر ایسا کون سا راز ہے۔ کون سا مسئلہ ہے۔ سامنے لڑکا موجود ہے، آپ کو نظر کیوں نہیں آتا؟“ وہ ٹیبل پر ہاتھ مار کے بولی۔

امی کے ہاتھ رک گئے۔ انہیں خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کی بات میں اور پہلے بھی بحث ہو چکی تھی۔ لا حاصل۔

”کیسے وہ ہمارے گئے بھائی تو نہیں؟ ابابا کی خفیہ شادی کوئی ادھر ادھر۔“ امی کی پیشانی پر سوچوں کی لکیریں اور گہیرا تھی۔ زور سے ہنسی نکل گئی۔

”یا پھر آپ نے کہیں۔“ وہ کیا کہتے ہیں، کہیں وہ ہمارے دودھ شریک وغیرہ بھائی تو نہیں ہیں۔“ وہ جل کر وجہ ڈھونڈ رہی تھی۔

”پاگل ہو تم۔ جب وہ پیدا ہوا تو میری تو شادی بھی

نہیں ہوئی تھی۔ اب باتیں بند کرو اور کچن دیکھ لو۔“ نہیں کام نہ کرنے کا بہانہ چاہیے۔“ بالکل نہیں، ایک غلط کام میں میری کسی قسم کی کوئی دہش شامل نہیں ہوگی اور میں نے مون بھائی کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔“ وہ حتی انداز سے بولی۔

”بس کرو عروہ۔! امی کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ کرسی پر بندھال سی بیٹھ گئی تھیں۔ ”میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ جب سے سکندر سلیمان کی رحمت کا ٹٹا اٹھا تھا۔ وہ منہ پر ماسک لگائے گھوم رہی تھیں جسے اب اتار پھینکا عروہ نے امی کے ہاتھ پر اپنا اٹھ رکھ دیا۔“

”میرے خیال میں ہمیں سنجیدگی سے وجہ معلوم کرنی پڑے گی۔ پیلا سے پوچھو دنیا کا سب سے بہترین لہو جان ان کی نظر میں؟ ترنت کہیں گے فیض۔ احمر کے لیے ایک ہی آئیڈل، مون بھائی۔ میں مون بھائی کے لیے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ تک نہیں۔ بلکہ مجھے لگتا ہے میں علشہ کی بہن نہیں ہوں، مون بھائی کی ہوں اور اپنے لیے علشہ کو بھابھی چنا ہے اور آپ کے تو وہ بھانجے ہیں۔ ساری دنیا سے پیارے مون بھائی سے پوچھو بلکہ پوچھنے کی ضرورت کیا۔ اندھے کو بھی نظر آتا۔ وہ علشہ کے لیے کیا سوچتے ہیں اور یہی علشہ آتی۔ وہ بھی مون بھائی کو پسند کرتی ہیں ہمیں جب پوچھو، منہ کیا کر لیں گی اب بند۔“

”کیا کہا تم نے علشہ بھی پسند کرتی ہے، تمہیں کیسے پتا؟“ اس نے چونکنے کے انداز میں اسے ٹوکا۔ ”میرا اندازہ ہے امی! بس مجھے مگن ہوتا ہے۔ وہ ان سے قصداً کتراتی ہیں۔“

”جب مون نے مجھ سے کہا تو میں نے اسے کہہ دیا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس اپنے ابابا کو لانے کی تیاری کرو، کہنے لگا آپ ایک بار پوچھ ضرور لیں میں۔“

”کیا مون بھائی نے ڈائریکٹ آپ سے کہا؟ کب کب کی بات ہے یہ؟“ عروہ مانوا چھل پڑی۔

”ہو گئے ہیں کوئی تین سال۔“ وہ ٹوکے جانے پر بد مزہ ہوئی تھیں۔

”پھر پھر آئی کیا بولیں؟“ اس پر غجلت سوار ہو گئی۔ ”صاف منع کر دیا۔ بلکہ مجھے اپنی ماں کو جھاڑ دیا۔ میں بڑے ارادے لے کر تمہارے پیلا کے پاس گئی۔ انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ مون کا ذکر ہوا اور وہ شروع نہ ہوں۔ اتنا اچھا فریض ہوا۔ خاندانی پردھا لکھا سرکاری ملازمت۔ ترقی کے چانسز۔ واہ۔ واہ۔ جھومنے لگے۔“

”انکار کر دیا آپ کی بیٹی نے۔“ میں نے جیسے دھماکہ کیا۔ اور جل کے خاک بھی خود ہی ہوئی۔ آرام سے فرمایا۔ ”بڑھی لکھی، عاقل بالغ، سمجھ دار لڑکی ہے۔ جیسے اس کی مرضی۔“ بیٹی کا انکار، باپ طرفدار اب بڑھی لکھی، عاقل بالغ، سمجھ دار نے اس سکندر جانی کو پسند کر لیا ہے تو مجھے کیا۔ اچھا ہے ٹھیک ہے تمہارے پیلا خوش ہیں ذات برادری مل گئی۔ علشہ بی بی کو خوابوں کی تعبیر۔“ امی نے غصہ کو تباہ کیا۔

”اور۔ اور مون بھائی کیا بولے۔ آپ نے بتایا انہیں۔“ عروہ کو اپنی عقل و نظر پر برا گھمنڈ تھا، اب حیرانی و صدمہ مواتھا۔

”حیران ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔“ امی کے چہرے پر مون کا چہرہ یاد کر کے تاسف بکھر گیا۔ ”پھر شرمندہ ہو گیا بعد میں پتا نہیں کیا سوچ کر چلا گیا تھا۔ ایک دن علشہ کے کالج پوچھنے کے لیے۔ صفا جواب دے دیا ملکہ وکٹوریہ نے۔“

”ہائیں!“ عروہ ریریل کی طرح اچھلی۔ ”مون بھائی اور علشہ روبرو۔ نہیں نہیں۔ پھر ہوا کیا۔ بولیں امی؟“ اس نے ان کا شانہ زور سے ہلایا۔



”اب تو خیر کوئی بات نہیں کرنا۔ گڑے مودے کون اکھاڑے۔ نئی نسل ہر معاملے میں ”آئی ڈونٹ کیئر“ کا موٹو اپنائے رہتی ہے۔“

وہ دونوں میکرو سے واپسی پر بہت ڈھیلے قدموں سے گھر کی طرف روانہ تھیں۔
کالج کے اندر بنے گھر پرانے تھے ٹوٹے پھوٹے مگر لوگوں کی زندگیاں یہاں گزر گئی تھیں۔ عروہ کو ماضی و ہرانا بہت پسند تھا۔ ابھی بھی بہت پرانا قصہ چھیڑے بیٹھے تھی۔

”پہلے جوائنٹ فیملی سسٹم ہی ہوتا تھا۔ الگ فیملی بہت کم۔ تمہارے پاپا کی مائی اپنے اچانک فوت ہونے والے بھائی کے گھر کے معاشی حالات سے بڑی پریشان رہیں۔ ہر ممکن مدد کرتیں مگر یہ۔۔۔ شہر میں رہتے تھے اور وہ کسی دور دراز علاقے میں۔۔۔ بڑا مشکل وقت تھا، میکہ بھی سفید پوشی کی زندگی گزارتا تھا۔ ایک بڑا اور پانچ بچوں کی کلی ذمہ داری لینا بہت مشکل تھا بلکہ ناممکن۔ مائی اہل ہی معاشی طور پر مضبوط تھیں۔ تایا کہنے لگے ایسی مالی مدد کا کوئی فائدہ نہیں ہے کوئی اور حل ڈھونڈو۔ بڑی سوچوں کے بعد مائی انیس سالہ بھانجے کو اپنے یہاں لے آئیں کہ تایا کے ساتھ رہے گا۔ کام سمجھے گا تو یہ دیر یا مستقل حل اور مدد ہوگی۔

لڑکا تیز طرار تھا بڑی جلدی کام سمجھ میں آئے لگا تو گھر پر بے سہجے لگا۔ چرب زبان تھا پھر جوان جہان خبری نہیں ہوئی۔ چھوٹے چچا کی بیٹی۔ کب ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے۔ اگلی نے بچپن کی منگنی توڑ ڈالی۔ چچا چچی نے فوری حل کے طور پر شادی کا اعلان کیا۔ بھانجے کو گھر سے نکالا۔

”ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا بھابھی۔ آپ کا لڑکا اس قابل کر دیا ہے اب ہمیں کہیں کام کر لے گا۔ میں ہمدردی میں لے گئی۔ میرا تو اپنا کھرواؤ پر لگ گیا۔“ مائی رد تکمی ہو رہی تھیں۔

بھابھی ہاتھ جوڑتی ہیں۔ بھانجا بھی شرمندہ ہو گیا۔ معافی تلاتی ہو گئی۔ تم وہاں خوش اور ہم۔۔۔ یہاں لڑکی بل کھائی ناگن بن گئی۔ عین نکاح کے وقت چیخ کر انکار کر دیا۔ تمہارے پیلا کہتے ہیں۔ میں چھوٹا ہی تھا مگر آج بھی وہ قیامت جیسا دن پوری جزئیات

سے یاد ہے۔ پردے کا زمانہ تھا۔ سارے واقعہ کے بعد جو مشترکہ ٹولہ فیکشن جاری ہوا وہ یہ تھا کہ ”یہ سب باہر سے لڑکا گھر میں گھسانے کا نتیجہ ہے۔ سو آج کے بعد کبھی ایسی ہمدردی یا مدد نہیں کی جائے گی۔“

تمہارے پاپا کے کچے ذہن میں واضح ہو گیا کہ گھر میں کوئی لڑکا نہیں رکھنا۔ وقت گزرنے کے بعد لڑکے پیدا ہو ہی جاتی ہے مگر ہم جب شادی ہو کر آئے۔ ابھی کالج میں گھر نہیں ملا تھا۔ وہاں ہمارے پڑوسی تھے۔ تین بھائی مل کر رہتے تھے۔ الگ الگ پوریشن تھے۔ میرا گھر تیسری منزل پر تھا کھلی کھڑکی سے ان کا سارا گھر اور کمرے وغیرہ دکھائی دیتے۔

ایک روز تمہارے پاپا نے خود دیکھا بس نہ پوچھو چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ فیصلہ سنا دیا کہ وہ کبھی جوائنٹ فیملی سسٹم کا حصہ نہیں بنیں گے۔

”مکان کھول کر سن لو انیسہ ہمارے گھر میں کبھی ایسا ماحول نہیں ہو گا۔ میں تم اور ہمارے بچے بس۔“ ان کا قطعی فیصلہ تھا تو مجھے کیا پڑی تھی کہ۔۔۔

عروہ بہت پہلے کا قصہ مزے سے سن رہی تھی ”ای کے رکنے پر ہنس دی۔“

”اور آپ لے آئیں مون بھائی کو زبردست۔۔۔ پھر پاپا کیسے مانے؟“

”مانا کیا تھا۔ میں نے پہلے دن کہہ دیا۔ ایڈیشن کروائیں پھر ہاسٹل بھیج دیں اور علشہ بہت چھوٹی تھی تیسو چودہ برس کی مون بہت سیدھا ڈرا سہا بچہ تھا۔ میں نے شعوری کوشش سے دونوں کو کبھی اس طرح سے ٹھٹھلنے ملنے دیا ہی نہیں اور پھر جب مجھے ایک دن شک ہوا تو۔۔۔ اس سے پہلے پھیلی خالی ہوتی میں نے منہ میچھائی۔“



”آپ اس کمرے میں بیٹھیں گی اور اس وقت تک باہر آنے کا سوچیں بھی مت کہ جب تک میں خود نہ آؤں۔“ وہ علشہ کو ہاتھ پکڑ کے باہر والے کمرے

لگ لائی اور کھڑکی کے پاس صوفے پر شانوں پر دباؤ دے کر بٹھادیا۔
”مگر بات کیا ہے؟“ علشہ نا سنجھی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

”یہ رہیں آپ کی کاپیاں جو آپ چیک کر رہی تھیں اور چائے کا کپ بسکٹ بھی ہیں۔“ اگلے منٹ میں باقی ہندوستان بھی گھر کے عروہ بی بی باہر سے کنڈی چڑھا لگیں۔

”یا اللہ! علشہ کاپیاں کھول کر چیک کرنے کے بجائے یونہی ورق پلٹنے لگی جب ہی عروہ کی زور وار ہنسی کی آواز آئی اس نے گردن موڑ پیچھے کھڑکی کی طرف دیکھا تو پردے گرے تھے مگر کھڑکی کھلی تھی وہ تیزی سے پردہ ہٹانے والی تھی کہ کھڑکی کے بالکل ساتھ بلاسٹک کی کرسیوں پر مون اور عروہ براجمان تھے۔ مون کی پشت تھی۔ نیمل پر خوب اچھی سی شام کی چائے سرو کی گئی تھی۔

”وہ اتنی گوری چٹی نرم ملائم دکھتی تھی کہ جب خاموش بیٹھتی وی دیکھ رہی ہوتی تو میرا دل چاہتا ہلا جلا کر دیکھوں گوشت پوست سے بنی لڑکی ہے یا خالہ نے کوئی گڑیا سجا کر رکھی ہے۔ تھوڑی مولی بھولا بھالا چو۔“

علشہ آبی اور مولی۔۔۔! عروہ نے حیرانی ظاہر کی۔ ”مولی نہیں بس اب جیسی تکی نہیں تھی۔“ مون کی آنکھوں میں نازک علشہ کا سر لپا گھوم گیا۔

”آپ کو مولی بیوی پسند ہے؟“ عروہ نے پوچھا۔ ”نہیں نہیں۔“ مون چائے کا کپ رکھ کے ہنس دیے۔ ”ایک لطیفہ سنا تا ہوں، دلی پتی عورت کا شوہر کے گا میرے پاس بس ایک بیوی ہے جبکہ مولی بارہ من کی دھوئن کا میاں۔ جناب میرے پاس بہت لڑکا بیوی ہے۔“

عروہ کے منہ سے فوارہ پھوٹا کھڑکی میں کھڑی علشہ بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر پائی۔
”اچھا چھوڑیں بیویوں کی قسمیں۔ آپ وہ بتائیں اور میں پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”مجھے آتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ علشہ کو میرا اس گھر میں آنا ناگوار گزرا ہے وہ خالو صاحب کی سہیلی جیسی لاڈلی تھی۔ اب خالو صاحب میرے ساتھ رہنے لگے۔ تم ایک چڑچڑی، دلی پتی بچی تھیں۔ خالہ ہمہ وقت تمہیں اٹھائے پھرتیں۔ علشہ کچھ خاموش، سب سے کٹی کٹی، خفا سی رہتی۔ میں بھی برا لگتا اور تم بھی۔“ مون کی آنکھوں میں ماضی جھلکد کھلا رہا تھا۔
”آپ کو سب سے پہلے آپ کی کس بات نے متاثر کیا؟“

”آبی کی کس بات نے۔۔۔ رنگ نے۔ میں نے کبھی اتنی گوری رنگت بالکل سامنے اتنے قریب سے نہیں دیکھی تھی۔“

”اور ہمارے پورے خاندان میں سے کبھی کسی نے کونسلے کی دلالی نہیں کی مگر رنگت شب و بچور کو شرماتی ہے۔“ مون نے بڑے دلچسپ پیرائے میں اپنے سانولے رنگ کو بیان کیا۔ عروہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”اچھا اچھا آگے۔ وہ ای دالی بات بتائیں نا۔۔۔“

”میں گھر میں صرف علشہ ہی سے ڈرتا تھا۔ اس کی موجودگی میں کمرے میں بیٹھنا مشکل لگتا اتنے بچے تاثرات کر کے تمہاری آبی بیٹھتی تھی کہ کیا بتاؤں۔“

”بتانے کی کیا ضرورت ہے وہ اب بھی اتنا ہی پکا منہ کر کے بیٹھی ہیں عروہ نے خفگی ظاہر کی۔
”اس کی موجودگی میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ بتا نہیں چلا کہ کب اس کا چہرہ کتنا بھی عادت بن گیا۔ وہ ایک نظر بھی نہیں ڈالتی۔ سکاری و نیاسے بلکہ خو سے بھی چھپائے کن اکھیوں سے دیکھنا جاری رہتا کہ کسے خبر ہے۔“

مون پل بھر کور کے اور ہنس دیے۔
”خالہ بی نے ایک دن جالیا۔ خالو صاحب کا نظریہ سوچیں وجوہات بتائیں۔“

”مجھے شرمندہ نہ کروانا بیٹے! تم کہیں اور جا کر رہ لو گے پڑھ لکھ جاؤ گے اپنے حصے کی ہر چیز مل جائے گی۔ مگر تمہارے خالو صاحب اپنے صبح غلط ملے جلتے

نظریہ پر اور قائم ہو جائیں گے۔ ایک غلط روایت اور فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ وہ تو پہلے ہی شدید مخالف تھے مگر تم نے اپنی اچھی فطرت کے باعث ان کے دل میں جگہ بنائی۔ اب اپنے مقام سے گرے تو تمہیں بھی چوٹ لگے گی اور میرا ہاتھ بھی تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں بھی گر جاؤں گی، چکنا چور بکھر جاؤں گی۔ ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ ابھی بس پڑھو لکھو اور میرا نہیں خیال مجھے دوبارہ کہنا ہو گا۔ تم میرے بھائی ہو اور اپنے بچوں سے پہلے تمہارے ہی لاڈ اٹھاتی تھی۔ تو تم پہلے بچے ہوئے تھے۔“

خالہ نے میری پیشانی چومی جو عرقِ ندامت سے تر تھی۔ سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا۔ آنے جانے کے لیے یہ ڈرائنگ روم کا دروازہ یوز کرنے لگا۔ کوشش ہوتی کہ دسترخوان پر بھی کم سے کم جاؤں۔ پروفیسر صاحب مجھ سے بہت پیار کرنے لگے تھے، ہم دوستوں کی طرح رہتے اور اگر ان کی نظروں سے گر جاتا تو پھر۔“

مون نے ٹھنڈی چائے کے آخری گھونٹ سے حلق تر کیا۔ عروہ کو ہمیشہ سے مون بہت عظیم لگا کر اس کی پلکیں لرز گئیں۔

”اچھا وہ تو بتائیں میں۔ جب آپ ان کے کالج گئے تھے تو کیا بولیں۔“ عروہ کا تجسس ابھی تک قائم تھا۔ ”کچھ نہیں۔۔۔ حیران، حیران اور بہت زیادہ حیران ہوئی۔ بہت دیر تک خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی میں نے ایسے کبھی سوچا نہیں۔“

”تو اب سوچ لو۔“ میں نے کہا۔ پھر طویل خاموشی ”سوری نیب! آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ مگر ایسا ہونا آئی مین۔۔۔ آئی ایم سوری میں سوچ سکتی بھی نہیں اب۔“

”تو آپ کیا اسٹوڈنٹ بن کر گئے تھے؟ وہ اپنے جذبِ دل کی شدت میں۔۔۔ آنکھوں کی منکاریاں بے چینیوں کچھ تو بتاتے۔“ عروہ کو اس کی شرافت نہ بھائی۔

”یہ باتیں بتانے کی نہیں محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔“ ”آپ نے تو عرصہ ہوا ان کا چہرہ کھنایا چھوڑ دیا تھا۔“ عروہ نے جل بھن کر کہا۔

”کس نے کیا چھوڑ دیا تھا؟“ مون نے شرارت سے عروہ کو دکھا۔

”پھر ہم محتاط ہو گئے تھے۔ بہت ہمت دکھاتے اگر خالہ عین موقع پر ٹوک نہ دیتیں۔۔۔ ہم تو فراز کے ماننے والے ہیں۔“

پہلے پہل کا عشق ابھی یاو ہے فراز دلِ خود یہ چاہتا تھا رسوائیاں بھی ہوں ”یا اللہ!“ عروہ بیٹ پکڑے دہری ہو گئی۔

”میں نے تمہیں کوئی مزاحیہ شاعری سنائی ہے۔“ مون مصنوعی خفگی سے بولے۔

”نہی شعر نہیں آئی آپ پر آئی۔ باتیں اتنی بڑی بڑی اور اتنی اہم نہیں سے کہ جا کر ہاتھ پکڑ لیں اور کہہ دیں۔ علشبا ایسا مت کرو بلکہ تم کچھ نہ کرو۔ مجھے کرنے دو خاموش تماشا دیکھو۔۔۔ بلکہ ہاتھ بھی کیا پکڑنے۔۔۔ آپ پیر پکڑ لیتے۔۔۔ تجربہ تو خیر ہے۔“

عروہ کی شرارت حد پر پہنچی۔ خفگی سے گھورتے مون کا بے ساختہ قہقہہ اموود کے پیڑ کی چڑیوں کو سہا گیا۔ اندر سانس روک کر کھڑکی علشبا پر وہ چھوڑ کر صوفے پر جا بیٹھی اور چہرہ ہتھیلیوں سے چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اب بی بی عروہ! آپ نے اپنی عمر اور حیثیت سے بڑھ کر باتیں کر لیں، وہ بھی لا حاصل۔۔۔ اس ٹاپک کو ہمیں ختم کریں۔ کسی نئے سرے کو مت ڈھونڈو۔ دھاگہ الجھ گیا تو کاٹنا پڑے گا سمجھیں تم۔“ مون نے اپنے چہرے پر سنجیدگی تھوپ لی۔ عروہ نے سنی ان سنی کر دی۔

”سب کی باتیں قصے سچ جھوٹ اپنی جگہ مگر میرا دل کہتا ہے کہ ابھی بھی کوئی پہلو ہے جو میری نگاہ سے پوشیدہ ہے اور نتیجہ کچھ بھی ہو میں معلوم تو کر کے رہوں گی۔“ وہ پختہ لہجے میں بولی۔

”اونہوں!“ مون نے تلوخی اٹھائی۔ ”چھوڑیں چھوڑیں“ آپ سے کون پوچھ رہا ہے۔“ عروہ نے ذرا لفٹ نہ دی۔ ”ہمیشہ آپ سناتے ہیں اب میں کچھ سناؤں۔“ وہ مون کا چہرہ غور دیکھنے لگی۔ ”وہی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا۔ اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے۔“



”تم چھوٹی تھیں۔ تائی نسیم کے ہاں گئے تھے میں اور پاپا۔۔۔ میں نے انٹر پاس کیا تھا۔ فاروق اور شارق بھائی کی شادی تھی۔ پہلی بار لاہور جا رہی تھی۔ ہر چیز بڑی دلچسپ اور مزے دار تھی۔ ان کا بڑا سا گھر بہت سارے لوگ چار بیٹے، تین بیٹیاں۔ اوپر سے سارا خاندان موجود تھا۔ بڑی والی رخسانہ باجی ای کی ہم عمر تھیں۔ پی آئی اے میں خوب زیر دست پوسٹ پرفارم تھیں۔ پھر وہ بھائی شادی شدہ پھر فرزانہ آپلی میں سسل کی تھیں اور شائدانہ ان سے بڑی کسی پرائیویٹ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ رخسانہ باجی کے صرف دو بچے ایک دم ماڈ کاؤنٹ میں پڑھنے والے۔ ان دونوں کے تو انداز ہی جدا تھے ایک سے ایک اسٹائلش کپڑے، فل کٹ میں رہتیں اپنے آپ میں مگن پرائیڈ۔ اپنے حسن اور عمدے کے زعم میں مبتلا۔ بڑے چھوٹے آئے گئے کی کچھ خبر نہیں اور سب سے چھوٹی نمبر چار کی روشنائی اخبار میں کام کرتی تھیں۔ وہ تو سب سے الگ خود کو ماورائی مخلوق سمجھتی تھیں۔

ولیمہ کے اگلے روز جب دونوں جوڑے، ہنی مون کے لیے روانہ ہوئے تو بڑے سے ہل کمرے میں سارا خاندان جمع تھا۔ تائی جی نے ماسیوں کو حکم جاری کیا۔ بہت اچھی چائے پیش کی جائے اور سارا پھیلاوا سمیٹ دیا جائے۔

”اتنے عرصے بعد سب سکون سے مل بیٹھے ہیں۔ ایسے موقعے کوئی روز روز تھوڑی آتے ہیں۔ وہ حاضرین محفل کو دیکھ کر مسکرائیں۔“ علشبا پاپا کے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ تائی تایا۔۔۔

رخسانہ باجی: وہ میاں۔ سالوں بعد ملنے والی کزنز کے جھرمٹ میں پاپا بہت خوش تھے۔ علشبا کو ان کی خوشی اور مگن انداز بہت اچھا لگا رہا تھا۔

”فاروق دلہن لے کر وئی چلا جائے گا۔ مجھے اپنی نوکری نہیں کروانی جس میں وہاں بیوی۔۔۔ شارق چاہے تو یہیں رہے ورنہ سرگودھا لے جائے۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ ہم تو بھی بچوں کی سہولت دیکھتے ہیں اور ہماری کون سی ان پڑھ جاہل مل کلاس لڑکیاں ہیں جو ایسے قضیوں میں ٹائم خراب کریں گی۔ جن کے نہیں بس رہے نہ بیس۔ دو سروں کو لا حاصل انتظار میں کیوں ڈالیں۔“

تائی پاپا کے جھجکے سوال کے جواب میں شروع ہو چکی تھیں۔ پاپا نے شادی کے کارڈ بڑھنے سے لے کر اب تک نجانے کیسے اس سوال کو روک رکھا تھا۔

”وہ بڑی بہنیں کنواری اور چھوٹے بھائیوں کی شادی؟“ احسان صاحب لڑکیوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ پھونک پھونک کر سوچنے والے کہنے والے۔ اتنی عمریں ہو گئیں، وہ تینوں نہ لڑکیاں لگتیں نہ عورتیں، چلنے انداز بول چال سب کنواریوں جیسی مگر آنکھوں کے اندر تھکاوٹ اور مایوسی کی لکیریں جو گھرے کا جل سے دیانی جاتیں پلاسٹک کی گڑیاں۔

”میں خدا نخواستہ بچیوں کو کچھ نہیں کہہ رہا۔ میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا آپ پہلے فرزانہ اور شائدانہ کا کرتیں۔ روشنائی تو خیر فاروق اور شارق سے چھوٹی ہے۔“

”ارے کیا خاک چھوٹے ہیں۔ تمہیں تمہیں سے لوہے کے ہو گئے دونوں۔ سر میں سفید پل آگئے۔“ تائی کا مزاج بگڑ گیا۔ آواز اونچی ہوئی تو سب متوجہ ہو گئے۔ ”میں نے کیا جان بوجھ کر کیا یہ سب۔۔۔“ تائی کی آواز پھٹ پڑی۔ ”دونوں کی مہولی کہ خاموشی سے ماں کا منہ دیکھتے رہے کہ اہل ہی کریں گی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں جو بیٹیوں کے لیے بیٹیوں کی حق تلفی کر دیں۔ فاروق نے بچپن سے پسند کر لی تھی خالہ کی بیٹی۔ اب اس کی ماں صاف کہہ رہی تھی۔ بہن کرنا ہے تو کرو

میری بیٹی کے لئے رشتے بہت۔۔۔ چپ چپ رہنے والا فاروق جیسے راکٹ کی طرح اچھلا۔۔۔ میں اسے کیا کہتی بیٹے! پہلے بہنوں کا ڈھونڈو پھر اپنا سوچو۔۔۔

”سوری بھابی جان! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ وہ کہتے ہیں دراصل بڑے بزرگوں سے سنا ہے نا۔۔۔“

پاپا سٹپٹا گئے۔ ”گھر میں بیٹیوں کی موجودگی میں۔۔۔ دراصل۔۔۔“

ہوں بیٹیوں کے لئے بیٹے روک رکھے ہیں۔ ارے دنیا کی وہ مثال ہے، آئے گوند حتی اور ہتی کیوں۔۔۔ مگر بھیا تم سے یہ امید نہ تھی۔ مگر ہاں بھی ہمارا تماشکا ہے۔ خود بھی دیکھو اور جن چوہڑے کو بھی دکھاؤ۔“

تائی جی دوپٹہ منہ پر رکھ کے رونے لگیں۔ پاپا کے ہاتھ پر پھول گئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر تائی جی کے صوفے پر چلے گئے۔ ان کے پیروں کو انگلیوں سے چھوا۔

”ارے جانے دو احسان! تمہاری پروفیسری۔“ تائی جی نے ہاتھ نچایا۔ ”وہ بڑے بزرگ گزر گئے اب۔۔۔ اب خود ہی بنتا پڑتا ہے اپنا بڑا بزرگ۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں بڑی بہنوں کے لئے رشتے۔“ تائی جی ہا کر بڑی ہنسی بولیں۔

”میرا قطعاً“ آپ کی دل آزاری کا ارادہ نہیں تھا۔ سوال جبھا تو کر لیا۔ میں آپ کا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھے بھابی کے آگے ہاتھ باندھ گئے۔

”اب خاندان میں کوئی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ جوتے وہ پہلے ہی یک ہو گئے یا پھر نکمہوں کا ڈھیر ہے۔ اب یہ اتنی پڑھی لکھی لڑکیں۔ یہ مجھلی فرزانہ۔۔۔ وہ کیا کام کرتی ہے بول لڑکی۔“

”میرا مطلب۔۔۔ مجھے اپنی بہنیاں جان سے بڑھ کر پیاری ہیں۔ جو بھی کہایا سوچا ان کی محبت ہی ہیں۔ پلیز بھابی جان!“ پاپا بس رو دینے والے تھے دل میں جیسے مرضی خیالات ہوں مگر سب اس وقت احسان صاحب کو ملامت بھری نگاہوں سے اور تائی جی فرزانہ شائدانہ اور روشانہ کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔

”پی ٹرانسلیٹر ترجمان۔۔۔“ فرزانہ نے فوراً جواب دیا۔ ”سفارت خانے میں کام کرتی ہے۔ دوسری یونیورسٹی میں اپنے سے بڑے نکمہوں کو پڑھاتی ہے۔ صغراں کیا اپنے اسکول باسٹریٹے کا رشتہ لے آئیں۔ باہر سے ڈھونڈا رشتہ والی کے ذریعے تو استانی صاحبہ کا شکر و نکل آیا۔ یہ کیا انکار کرتی۔ اگلا سر پر پیر رکھ کے بھاگا۔“ استاد تو والدین کے رتبے کا ہوتا ہے جی۔“ تو بھیا! ٹھیک ہے ناں جو کنارے لگ رہے ہیں۔ انہیں تو جانے دو کہ نہیں۔

”ارے میاں! جانے دو۔۔۔ اب ہر کوئی تمہاری طرح منصوبہ بندی تو کر نہیں سکتا۔ ہمیں بھی خبر ہوتی تو ایسا کچھ کر لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ تائی نے پاپا کا ہاتھ چھپے کرتے ہوئے چمک کر کہا۔

اس اخبار والی کا رشتہ آیا بڑا ہے۔ نہ زبان مل رہی ہے نہ ذات اور رنگ۔ اب گرنے کو تو کروں تو کل کو ٹم یونہی بیٹھ جانا میری گوشالی کے لئے ایسے کیوں نہ کیا۔ دیسے کیوں کر لیا۔۔۔ ہاں نہیں تو۔“

”میں نے۔۔۔ پاپا نے اچھے سے اپنی شہادت کی انگلی اپنے سینے کے سامنے کی۔۔۔“ بھابی جان میں نے کیا کیا۔ مطلب۔۔۔ پاپا گڑبھا گئے۔

تائی جی اندر سے خود ابھی ہوئی تھیں پاپا کے جیلے نے جیسے راستہ دیا بولتی چلی گئیں۔

”ہونہ۔“ تائی جی نے جواب نہ دیتے ہوئے منہ موڑ لیا۔ پاپا نے ساتھ بیٹھی رخسانہ کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہاں بھی طنز بھری مسکراہٹ تھی۔ پاپا نے حاضرین محفل کو حیرت بھری سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب ان کی منصوبہ بندی سے واقف ہیں اور تائی کے اس جیلے سے خوب حظ اٹھایا گیا ہے۔ عجیب سا احساس۔۔۔ وہ بے چین ہو گئے۔

”اور تمہارا کیا خیال ہے۔“ تائی جی کو دھیان آیا۔ ”میں لڑکیوں کے واسطے لڑکے بٹھا کر رکھتی تو تم جیسے حقوق کے علمبردار ڈنڈا برساتے کہ کتنی خود غرض

”کیا کہنا سنتا۔۔۔ ہم بھی لے آتے کوئی دسویں بار ہویں کالز کا گھر۔ اپنی مرضی سے پڑھاتے لکھاتے

جیسے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ڈھال لیتے۔ اب جیسے تم اپنی مرضی پسند کا دایا بنا رہے ہو۔ اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اپنے ماحول کے اندر۔۔۔ آج الویسٹ کرو کل سو سمیت ملے گا۔ سانچہ تمہارے پاس ہے جیسے مرضی بنا لو۔ اپنی پسند کے رنگ ڈالو۔ اپنی سوچیں، اپنے نظریات نہ خاندان ڈھونڈنا بڑے گانہ زبان اور ذات برادری۔۔۔ شکل و صورت کا بھی بھلا۔ خوب چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔ راستہ تم نے دے دیا۔ اب بگٹش یہ دونوں دوڑیں گے۔“

تائی جی نے حیران و پریشان علشبعہ کو دیکھا۔ پاپا بیٹھے سے کھڑے ہو گئے اور پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔

علشبعہ کو چار جانب گھومتا نظر آنے لگا۔ جو سمجھ میں آرہا تھا وہی گما گیا تھا یا کچھ اور۔۔۔

”میں۔۔۔ میں نے۔۔۔“ پاپا کی ہکلاتی گلو کیر آواز نکلی۔

”میں نے ایسا کبھی سوچا تک نہیں۔ میں۔۔۔“

”ارے تم نہیں تو تمہاری بیٹی سوچ لے گی۔“ یہ پچھو کی آواز تھی۔ قین جوان بیٹیوں کی والدہ ماجدہ۔

ان کا انداز ٹھٹھا اڑاتا ہوا تھا۔ آنکھیں نچاتی وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھیں۔

پاپا نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ان نگاہوں میں کیا نہیں تھا۔ زخمی نظریں، التجا، رحم کی بھیک۔

”بس آپ۔۔۔ آپ!“ پاپا کی آواز تھرا گئی۔ نجانے کیا کہنا چاہتے تھے۔ علشبعہ یکدم کمرے سے باہر نکلی۔ واپس لوٹی تو ہاتھ میں بیگ تھے جن میں سامان ٹھوسا گیا تھا۔ کپڑے نظر آ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے اور آنکھیں ضبط کر رہی تھیں۔

”چلے پاپا!“ وہ بولی تو آواز مستحکم تھی۔ احسان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ عرق ندامت نے سارے جسم کو غم کر دیا تھا۔

”ارے کدھر۔۔۔ یہ بیگ کیوں اٹھلا میں ارے!“

فرزانہ نے بیگ پکڑنا چاہا اور باقی سب نے ارادہ حیرت کا مظاہرہ کیا۔ جب ہم کسی عزت دار کا لباس

دھجی دھجی کرتے ہیں اسے برہنہ دیکھتے ہیں تو یقیناً“

بھول جاتے ہیں کہ ننگے ہوں تو سب ایک سے ہوتے ہیں۔

علشبعہ نے ہاتھ بڑھایا مگر تاپا جی نے پہلے احسان صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انہوں نے بڑے بھائی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ بہت احترام سے الگ کر لیا۔ ایک کندھے پر بیگ ”بیچھے زمین پر ٹھینٹے آگے چلتی علشبعہ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ تھا اور وہ یوں چلتے تھے جیسے پیروں سے گیلی روٹی کے بورے بندھے ہوں۔ نظریں مجرم کی طرح جھکی تھیں اور شانے بھی۔

انہیں اگلے دن صبح کی کیٹرین پکڑنی تھیں پر دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لگا ہیں خیر۔ بے ساری رات اسٹیشن پر لکڑی کی بیچ پر بیٹھے رہے۔

”وہ میری زندگی کی سب سے خراب رات تھی۔ ایسی کالی بدبودار، بد شکل رات۔ میں روٹی رہی اور پاپا چپ رہے، بدنامی کی ایسی صورت تو مجھے معلوم ہی نہیں تھی۔ پاپا نے مجھے اپنی کزن کا قصہ اس رات سنایا۔ وہ بہت آزرہ تھے۔ کبھی بھڑک جاتے، کبھی ٹھنڈے ہو جاتے۔

”میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ تمہاری ماں کا پھیلا یا گند میرے منہ پر آکر گرا ہے۔ میں اسے نہیں چھوؤں گا۔ میں کبھی ڈر جاتی کبھی انہیں سمجھاتی اور کبھی رو پڑتی۔

”کان کھول کر سن لو علشبعہ!“ پاپا نے کسی ڈرے کولا کی طرح مجھے گھورا۔ آنکھیں نکال کر روانت کی کچا کے ”اگر تم نے کبھی مون کے بارے میں۔۔۔“

”نن۔۔۔ نن نہیں پاپا۔۔۔ گگ، کبھی نہیں میرے منہ سے بمشکل نکلا“ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔“

میں نے اپنے دل پر پیر رکھ دیا اور آگے بڑھ آئی، میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے میں نے ہر لمحہ خدا سے یہی ایک دعا مانگی ہے۔“

عروہ بری طرح چونک گئی یہ آخری جملہ۔ علشہ کہنیوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
”یعنی آپ بھی مون بھائی کو۔۔۔ آپ بھی انہیں پسند کرتی ہیں؟“
”اسے ناپسند کیسے کیا جاسکتا ہے۔“ علشہ نے الٹا پوچھ لیا۔

”تو۔۔۔ تو آپ اپنی معمولی سی بات پر آپ۔۔۔ عروہ کی آواز پھٹ گئی۔
”یہ معمولی بات ہے؟ پاپا نے تائی جی سے کہا تھا۔ اس سے اچھا تھا آپ غلاظت بھرا جو آٹھ مار دیتیں۔ کمر کا پانی حلق میں اترتا تو ٹھکانا مشکل نہ لگتا۔ جتنی غلیظ اور گندی بات آپ نے میرے خون میں انجیکٹ کر دی ہے۔“

”یہ چھ نہیں آپ یہ بتائیں آپ کو کب سے مون بھائی پسند ہیں۔“

”ہمیشہ سے جب سے انہیں دیکھا۔ علشہ کے چہرے پر الوہی مسکراہٹ آرکی۔

”مون نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا اور ہاسٹل چلے گئے۔“ پاپا نے یہ کیا کہ رشتے داروں سے کٹ گئے اور مجھ سے کہا۔ اپنی ماں سے کچھ مت کہنا اور اپنا عہد یاد رکھنا۔ مون اب کم آتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رخسانہ باجی تین چار سال پہلے کراچی آئی تھیں۔ پاپا کو فون کیا کہ ملنے آنا چاہتی ہیں پاپا نے صاف منع کر دیا میرے گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”تو اتنے سال ضائع کس کے لیے کئے۔۔۔ جب پاپا برادری سے باہر جانے کو معیوب نہیں سمجھتے تو آپ کز لیتیں شادی۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتے آئے اس سکندر سلیمان سے تو بہتر تھے ہزار درجے۔“ عروہ کو اپنا مسئلہ یاد آیا۔

”یقیناً بہتر تھے۔ مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جو پاپا کو کسی بھی حوالے سے لیٹ و آؤن کر سکے۔ سو سکندر سلیمان بہت بہتر ہے۔ پاپا کے ماں و مرتبے کے سامنے۔“ علشہ بات ختم کر کے نیمہ راز ہو گئی۔

”آپ دنیا کے لیے اپنی زندگی خراب کر لیں گی چہ۔۔۔ اس نے از حد تاسف سے پوچھا۔
”اور تم کیا چاہتی ہو لوگوں کے قیافے الزام تراشیں مجسم ہو کر سامنے آجائیں؟“ علشہ نے اپنے تئیں بڑا زبردست جواب دیا مگر سامنے عروہ تھی۔ اسے پر سوچ نگاہوں سے دیکھنے لگی پھر مسکرائی۔
”خلق تو فنکار ہے اس درجہ کہ بل میں سبک در کعبہ سے اضافہ تراشے تو کون ہے اور کیا ہے تیرا داغ قبا بھی دنیا نے تو موم بھی الزام تراشے وہ رکوع کی حالت میں تجھکی علشہ کی ٹھوڑی چھو کر پکار رہی تھی۔ جو سن رہی تھی۔“

ابھی تو اپنے تئیں اس نے آغاز ہی لیا تھا کہ پاپا نے انگلی اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا حکم دے دیا۔

”پاپا! میری بات تو پوری ہونے دیں۔“ وہ ہکلا اٹھی۔

”ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی۔“

”اور کچھ کہنا بھی مت جاؤ۔ اپنا کام کرو۔“

”پاپا پلیز ایک بار بس میری۔۔۔ دو جملے۔“ وہ ہلتی

لبجے میں گڑ گڑانے لگی۔ ”چار زندگیاں خراب ہو جائیں گی۔“

”چار کون سی؟“

”مون بھائی اور جو بھی ان کی زندگی میں آئے گی اور علشہ آپلی اور وہ سکندر پاپا۔ آپ میری بات۔“

پاپا نے ہتھیلی سیدھی گھڑی کر کے اس کے جملوں کا گلا گھونٹا اور انگلی کے اشارے سے دروازہ دکھایا۔ وہ

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ گھور رہے تھے عروہ کے لیے گھڑا رہا ممکن نہ رہا۔ وہ لٹے قدموں باہر لپکی۔

پاپا بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ سپاٹ آنکھیں

لیے اپنے روز موم کے کام کرتے دکھائی دیے۔ اسی کے

چہرے پر فکر کی لکیریں صحرا کی چٹنی زمین کی طرح

پھیل گئیں۔ جب سکندر سلیمان کے گھر والوں نے

رشتے میں پڑنے والی آپا سے ان کے عندیہ کے بارے

میں دریافت کیا اور فیصلہ چاہا۔ علشہ کی کم گوئی، نالے اور آنکھوں کی ویرانی مرنی میں ڈھل گئی۔ وہ بے حد گوری تھی مگر عروہ کو لگا وہ سفید ہو رہی ہے جیسے ہمسے قطرہ قطرہ خون ضائع ہو رہا ہو۔

”آپا پوچھ رہی تھیں۔ ہاں کہلوادوں پھر۔“ رات

کھانے پرانی نے سرسری انداز میں پاپا سے پوچھا۔

”رسم وغیرہ کے لیے گھر کی شفٹنگ کے بعد۔“

انہوں نے جملہ قصداً ”ادھور اچھوڑا اور حاضرین کو

دیکھا۔ احسان صاحب کا ہاتھ بدستور کھانے میں مگن

رہا۔ علشہ لقمہ بنا رہی تھی آنکھیاں چنگیر میں جڑی رہ

گئیں اور چہرہ جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

عروہ نے اپنا فطری ری ایکشن ظاہر کیا۔ اس نے

جھٹکے سے کھانے کے برتن آگے اور کرسی پیچھے

کھسکائی۔ سب کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور

چچ ٹیبل پر بہت بدتمیزی سے پھینک کر پیر پختی

دروازے سے نکل گئی۔ اسی نے دزدیدہ نگاہوں سے

پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ جہاں بے حد سکون اور

لا پرواہی تھی۔ جیسے کچھ ہی نہیں ہوا۔ احمر کے لیے

سب نا سمجھ میں آنے والا تھا۔ وہ حیرانی سے سب کے

چہرے تک رہا تھا۔

بھوک سے آنتیں قل ہوا لہ پڑھ رہی تھیں۔

نزلے نے سر میں درد پیدا کر دیا تھا۔ پیروں کو جاگرز

کاٹ رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتی چڑھائی

چڑھ رہی تھی۔ جب موڑ مڑتے ہی پاپا پر نگاہ پڑی۔ عروہ

نے بغور دیکھا۔ قدموں میں خود بخود تیزی آ گئی۔ وہ

جست بھر کے ان کے روبرو تھی۔ پاپا کے ماتھے پر پسینہ

اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر سات آٹھ

درجن کینوؤں کا پلاسٹک بیک احتیاط سے پیچھے شانے

سے اتار زمین پر رکھ دیا۔ پھر قریبی بڑے پتھر پر کتابیں

اور فائل ٹکا کر خود دوسرے پتھر پر سانس لینے لگے۔

گھر بھر کا پسندیدہ پھل کینو تھا۔ کالج کے اندر ریڑھی

والے نہیں آسکتے تھے۔ اللہ جلنے یہ کینو کہاں سے

لے گئے تھے اور انہیں شانے پر اٹھائے گھر کو جارہے

تھے۔ عروہ نے اپنا بیک اور فائل کتابوں کے ساتھ جمایا

اور آگے بڑھ کے پاپا کے کندھے کو دونوں ہاتھوں سے

دبایا۔ پھر گردن کو نرم انگلیوں سے مسلتے ہوئے سہلایا۔

”یہ اتنے بہت سارے بٹے کٹے گھوم رہے ہیں“

کسی کو بھی کہہ دیتے۔ خود اتنی مشقت کرنے کی کیا

ضرورت تھی۔“ اس کا انداز خفگی بھرا تھا۔

”یہاں گیٹ تک تو اصغر چھوڑ گیا تھا۔ اندر لڑکے

کب آسکتے ہیں۔“ پاپا نے سانس بحال کرتے ہوئے

بتایا۔

”تو گھر فون کر دیتے احمر آجا تا سائیکل پر۔“ عروہ

ان کے سر پر کھڑی تھی۔ ان کا بازو اور اٹھا کر اپنے

شانے پر ہاتھ رکھا اور دونوں ہاتھوں سے کلائی سے لے کر

بازو کے جوڑ تک ماہر مالشیوں کی طرح تیز تیز دبائے

لگی۔

”نس چڑھ گئی ہے شاید۔“ اس نے قیاس آرائی کی

”تمہاری ماں احمر کے ساتھ ڈاکٹر تک گئی ہے۔ گھر پر

تالا ہے۔“

”او آئی سی۔“ عروہ نے ہونٹ سکڑے۔

”تو ایسا ہے کہ میں سائیکل لے آئی ہوں تو یہ سارا

مال ڈھو دوں گی۔“

”چالی ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں تو۔۔۔ وہ تو آپ دیں ناں۔“ اس نے ہتھیلی

آگے برعکاسی۔

”میں اپنی چالی گھر ہی بھول گیا تھا۔“ پاپا نے

جھپٹے ہوئے انداز میں غلطی بیان کی۔

”مائی گاڈ۔ تو اب کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔“

پاپا کچھ نہ بولے۔ پانی کی بوتل کے آخری گھونٹ

حلق سے اتارے۔ دفعتاً عروہ کی آنکھیں چمکیں

اس نے پر سوچ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا بڑے

دونوں بعد وہ رو بہ ہوئے تھے۔ ٹھوڑی سی گفتگو ہوئی

تھی۔

”اہم! مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس

نے اعلان کے ساتھ ہی تھیلے کا منہ کھول کر دو کیونٹے نکالے پھلکا اتار کر گھما کے دو نیچے پھینکا پھر کیونٹے کے چار حصے کیے۔ دو پیلا اور دو اپنے منہ میں۔ پھر دوسرا پھر تیسرا۔

”کیا سارے ابھی کھا لینے ہیں؟“ اسے چوتھے اور پانچویں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ پیلا نے ٹوکا۔

”کھا تھوڑی رہی ہوں۔ وزن کم کر رہی ہوں مگر تک کیسے لے کر جائیں گے۔ اتنا وزن ہے ان کا۔“

اس نے اطمینان سے تو جھڑکی۔

”تم اس طرح وزن کم کر دو گی شام ہو جائے گی مگر یہ ختم نہیں ہوں گے۔“

”پیلا! مجھے چیلنج نہ کریں میں انہیں ختم کر کے دکھا سکتی ہوں۔“ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”بہر حال!“ اس نے منہ میں بھرے بیج پھو کر کے دور اڑائے!“ میں جا رہی ہوں نہرت آنٹی کے گھر بیٹھوں گی۔ ان کے ہاتھ کے دال چاول کھاؤں گی اور نیند آگئی۔ جو کہ لازمی آئے گی تو وہیں سو جاؤں گی۔ اور یہ ایک کیونٹا اور۔ آپ یہاں بیٹھے رہیں۔ کوئی بندہ گزرا تو لفٹ لے لیں۔ یا کچھ بھی کر لیں۔“

اس نے طوطا چٹشی کی حد کرتے ہوئے بیگ کندھے پر ڈالا۔ کتابیں سینے سے لگالیں اور چلنے کو قدم اٹھائے۔ پیلا نے حق دیکھ اس کا منہ دیکھا۔

”ارے تو وہاں جا کر کسی کو بھیجو۔ میں یہاں کب تک بیٹھوں گی۔“ ایسی بے مروتی۔

”وہ تو میں بھیجوں گی ہی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”تو یار! مل کے اٹھا لیتے ہیں تیل اور دھڑ سے تم پکڑو اور اوھر سے میں۔“ پیلا نے بڑے دوستانہ انداز میں غلٹ سے کھڑے ہو کر کہا۔ عروہ کے قدم رک گئے۔ اس نے فقط گردن گھما کر پہلے پیلا کو پھر تھیلے کو دیکھا۔ وہ واپس پلٹی بیگ اور کتابیں پتھر پر رکھیں پھر سینے پر بانو لپیٹ کر بڑی جتنی نظروں اور بتلاتی مسکراہٹ سے بغور پیلا کی آنکھوں میں جھانکا۔

”دش داپوائنٹ۔ مل کر اٹھا لینے سے بوجھ ہلکا جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ یوں۔“

اس نے آنکھ کے اشارے سے پیلا کو آگے بڑھنے اور تھیلہ اٹھانے کو کہا۔ نتیجہ حسب خواہش تھا۔ آرام سے گھر تک جا سکتے تھے۔ عروہ نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑے اور روڈ پر پھسکر مار کے بیٹھ گئی۔

”آپ یہاں بیٹھئے۔“ دوبارہ پتھر کی جانب اشارہ کیا۔ پیلا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیٹھ گئے۔

”یو نو پیلا!“ وہ بہت تسلی سے گویا ہوئی۔ ”آپ پانی میں پڑی لکڑی کی طرح ہیں۔ بھگی وزن اٹھانا چاہو تو اٹھائی نہ جائے۔ جلاتا چاہو تو اول تو جلے گی ہی نہیں۔“

اس نے آگ ہی نہیں پکڑنی اور جو بھی جلاتے کی مشقت جھیلے گا۔ اس کی آنکھوں سے ٹاک سے پانی نکلے لگا۔ آنکھیں جلیں گی سانسیں ابھیں گی۔ کئی لکڑی کی کڑواہٹ حلق اور آنکھوں میں بلیڈ جلنے جیسی ہوتی ہے اور آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اس لکڑی کو علشبا آبی جلاتا چاہتی ہیں۔ ”وہ ڈرائی انداز میں رکی۔“ اپنی زندگی بھسم کرنے کے لیے۔

پیلا کی آنکھیں حیرت سے جیسے پھٹ پڑیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کو سمجھ رہے تھے۔

”آؤ مل کر اٹھاتے ہیں۔“ پیلا نے تھیلہ دیکھا۔ ”اونہوں۔“ عروہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ ”بوجھ پیلا!“ وہ خطرناکوں سے انہیں اکسار ہی تھی۔

”میں آپ کو منانا چاہتی ہوں پیلا۔ قائل کرنا۔ لیکن پیلا! میں آپ کو سنتا بھی چاہتی ہوں۔ آپ بولیں۔“

”میں سنوں گی۔ آپ کو آپ نے فیصلہ سنایا تھا۔ باقی سب ان کے سامنے ہوا تھا۔ مگر پیلا! آپ مجھے بتائیے آپ نے کیا سنا“ آپ نے کیا محسوس کیا، آپ کیا سوچتے ہیں۔ آپ کیا سوچتے رہے ہیں۔ اتنے سال۔“

پلیر پیلا۔

اس نے ان کا ہاتھ اپنے ٹھپوں میں پکڑ کر جوم لیا۔ ”امی کو بھی نہیں بتایا حالانکہ۔ میں حیران ہوں۔“

”میں اس سارے قصے کی خبر نہ ہوئی جبکہ۔“ ”ہب ہم کسی بات کو چھپانے کا سوچ لیں تو وہ پھپ بھی سکتی ہے کوئی اچھنبنا نہیں۔ ہاں میں نے اے ما ضرور کی تھی کہ جس اذیت و ذلت کو میں نے جھیلا اہ میرے کسی اور عزیز تر کے حصے میں نہ آئے۔ بس۔“

پیلا نے شکست خورہ انداز میں اپنے ایمان کا اظہار کیا۔ عروہ نے دوبارہ بوسہ دیا اور یہ بوسہ چالی جیسا تھا۔

”ہاں بولنا شروع ہو گئے۔ ایک ایک لفظ ایک ایک منظر۔“

”جذبات کے ساتھ یادداشت کے پردے پر تیزیاں تھیں۔ سردی میں نرم گرم ملائم شال کی طرح لپٹی دھوپ اچانک جیسے ساحلی علاقے میں طوفان سے پہلے والی دھوپ اور تپش میں بدل گئی۔

عروہ کو تن من جھلس جانے کا احساس ہوا۔

”جب پیلا نے بیان کیا تو وہ اپنی سوچوں میں ارادے میں حق بجانب تھے۔ وہ ان کی عینک سے منظر دیکھنے لگی۔ معاملہ سنبھلنے کے بجائے الجھ گیا۔ پیلا جیسے طویل سفر کے بعد اب سانس لینے کو چپ بیٹھے تھے۔ عروہ کو بھی چپ لگ گئی۔

”تو کیا جو ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے۔“ اس کی نگاہوں میں علشبا کا بیجا چہرہ گھوم گیا۔ ”اور مون بھائی۔“

”اب تم کو کیا میرا فیصلہ غلط تھا؟“ پیلا نے فیصلے کا اختیار اسے دے دیا۔

”ہیلو ہیلو! کیا باپ بیٹی کا بزنس کا ارادہ ہے تو بھی جگہ بہت اچھی چیز ہے۔“ پروفیسر عتیق الرحمن ہوا سے اڑتی ٹائی کو بمشکل سیدھا کرتے چڑھائی چڑھنے آ رہے تھے۔ ان کا سانس انجن کی طرح چھک چھک کرتا تھا۔

”اچھی ہے ٹال۔“ عروہ بڑے جوش سے مڑی۔

”آپ ہمارے پہلے کسٹمر ہیں کیا کیجئے گا؟“ اس نے شاپ سے مین کیونٹر آمد کیے۔

”میسے کتنے؟“

”ہوں!“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”کوئی اچھی سی بات۔“

دل کو ٹھک سے لگنے والی۔ ”عروہ نے ہتھیلی پھیلائی۔ ”بہت خوب!“ پروفیسر صاحب جھوم گئے۔ ”ابھی آج ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ بات تو پرانی ہے مگر بس دل کو لگ گئی۔“

”ایک داتا سے کسی نے پوچھا۔“

”ہم ایسا کیا کریں کہ سب کی نظروں میں اچھے بن جائیں؟“

دانا نے جواب دیا۔

”اس دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی بن جائے تب بھی اسے برا کہنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔“

اور دوسرا یہ کہ۔

”ولسن کی تصویر کا بیک گراؤنڈ جتنا مرضی سیاہ ہو ولسن کی چمک جھل مل ماند نہیں پڑتی۔ سیاہ جتنا گہرا ہو گا۔ تصویر اتنی اجاگر ہو کر سامنے آئے گی۔“

”دش داپوائنٹ۔“ عروہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”سو آپ یہ کہیں گے کہ تصویر کے دوسرے رخ ہوتے ہیں لہذا۔“

”تصویر کے ہمیشہ دوسرے رخ ہی ہوتے ہیں یہ دیکھنے والے پر ڈھینڈ کرتا ہے وہ اپنی ہتھیلیوں میں کس منظر کو زیادہ جگہ دیتا ہے۔“ پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے عروہ کی بات کاٹی۔

”تم اتنے نڈھال کیوں لگ رہے ہو۔ کیا بھابھی نے گھر سے نکال دیا۔“ وہ اب احسان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

”نہیں وہ خود گھر سے نکل گئیں۔ تم جانو اور تمہارا گھر میں چلی۔“ احسان صاحب نے سرعت سے چہرے ماسک چڑھایا۔

”اوہ یار! بیویاں تیس سال بعد ایسی ہی ہو جاتی ہیں مگر تم کئی ہو۔ ایسی پھلجھڑی جیسی بیٹی ہے تمہاری۔“

ہمیں دیکھو پانچ گدھے گھر میں بندھے ہیں۔ ہائے ڈیڈ اینڈ ہائے ڈیڈ کے علاوہ۔ اگر کبھی بولیں گے تو ایک ہی لفظ ”وائے ڈیڈ۔“ کبھی جو پاس مل بھر کو بیٹھے ہوں اور بیٹھنا کیا؟ خود سے چل کر آتے نہیں میں ڈھیسڈ بن کر ان کے درمیان پسپوں تو بھی بھاگ جاتے ہیں۔ میری

تو زبان تھک گئی خاموش رہ کر۔“
عروہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ان کے پانچوں بیٹے بے حد پڑھا کو ذہین اور کام سے کام رکھنے والے لڑکے تھے۔

”اور سارے ایک ہی فطرت کے، کوئی جو ذرا الگ ہو۔ اب یہ دیکھو علشبا، سنجیدہ، خاموش، طبع، کم مسم لڑکی ہے مگر کوئی بات نہیں۔ یہ عروہ ہے ناں اس کا الٹ سیار! بیکنس رہنا چاہیے۔ ہمارے پانچوں تو۔“
پاپا کے کان جیسے بند ہو گئے۔ ہاں علشبا، عروہ سے بہت مختلف تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھیں۔ کیوں۔۔۔ کیسے ”ہمارے گھر آکر بیٹھو۔ خوب باتیں کریں گے۔“

وہ عروہ سے کہہ رہے تھے ”تمہاری آنٹی مٹیلاؤ بننے کا کہہ رہی تھیں۔ تمہیں دیکھیں گی تو کباب بھی فرائی کریں گی۔ ایک مزے دار بیچ واہ۔“
”نوا نکل تھینک یو۔۔۔ آپ بس اتنا کریں اپنے پانچوں گدھوں میں سے۔۔۔ او!“

اس نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبایا۔ پروفیسر صاحب کے قہقہے سے جھاڑی پر بیٹھی چڑیاں پھر ہو گئیں۔

”آئی مین! اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بھیجئے، تو یہ بورا اٹھالیں۔“

”بالکل بالکل بلکہ میں فون کرتا ہوں۔“ وہ نمبر ہشی کرنے لگے۔ ”بھئی وہ تمہاری آنٹی کہہ رہی ہیں، ابھی تک کوئی نہیں آیا اور دوسرے تمہارے گھر کی چابی ان کے پاس ہے۔“

”ویری گڈ!“ عروہ خوش ہو گئی۔
”تو پاپا! آپ یہاں رکیے۔ میں سائیکل لاتی ہوں۔ بس دس منٹ لگیں گے۔“



ایک عجیب سی خاموشی اور پراسراریت نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بظاہر ہولتے مگر اپنی اپنی سوچوں میں گم۔

”اتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے مگر ہتا نہیں کیوں دل بچھا بچھا سا ہے۔ اتنی بار آناؤں کر چکی ہیں۔ ان سے ادھر ادھر کی ہزار باتیں کر لیتی ہوں مگر بس ایک لفظ ہاں نہیں نکل پاتا۔“ امی الجھن میں تھیں۔

پاپا یوں بیٹھے تھے جیسے جسم۔ علشبا کے چہرے کی سپیدی بہت نمایاں ہو گئی۔ عروہ نے پہلو بدلا۔ امی بڑبڑاتی پن میں گھسی تھیں اور علشبا نے بہت دھیرے سے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تو عروہ کھسک کے پیانے نزدیک ہو گئی۔

”ایک بات تو بتائیے کیا آپ نے تائی اماں وغیرہ کو معاف کر دیا؟“

پاپا نے طویل سانس لی۔
”ہاں۔۔۔ شاید۔“

”اونہ! میں نہیں مانتی۔ اگر انہیں معاف کر دیا تھا تو سزا آپ کی کو کیوں دے رہے ہیں؟“

”میں کسی کو سزا نہیں دے رہا ایسا الزام۔“ وہ ترنت بولے۔

”کانڈر پر لکھتی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ بس عمل در آمد ہوتا ہے۔ آپ کو پتا ہے پاپا! اگر آپ کی آپنی سے اور۔۔۔ آپنی کی آپ سے محبت کسی ترازو میں تولی جائے تو معلوم ہے۔ آپنی جیت جائیں گی۔ وہ آپ کی محبت میں، آپ کی فرماں برداری میں ان چاہے راستے پر دوڑنے کو تیار ہیں ایسا راستہ جو خار خار ہے، جہاں کہیں سایہ نہیں۔ خشک ہونٹ اکثر تی زبان۔ ساری زندگی کے لیے ایک سزا۔۔۔ اور اب جو میں بات کہوں گی کوئی سنے تو بہت بری لگے۔ لوگ تھو تھو کریں مگر پاپا حقیقت تو حقیقت ہی ہے اف یو ڈونٹ مائنڈ۔“

اس نے تھوک نگلا اور قصداً ”بل بھر کو رکی پاپا بہت سکون سے اسے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا مگر عروہ کو لگا کہ اسے سننا چاہتے تھے۔

”دراصل آپ دونوں سی سا پر بیٹھے ہیں۔ ایک اوپر ہو گا تو دوسرا لانا“ نیچے۔۔۔ زندگی کے اگلے بل کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ خبر نہیں میں اپنا جملہ بھی مکمل کر پاؤں گی یا نہیں۔ یہ جو سانس اندر لی ہے باہر نکالنے کا

موقع ملے گا یا نہیں۔ موت برحق ہے ناں پاپا۔ آئی ام سوری پاپا جو۔۔۔ میں کہنے لگی ہوں۔“
وہ انکی اور بمشکل ان کی نگاہوں کو سہارا۔۔۔ پہلے ہاں بوجھ کر ٹھنڈے کر تول تول کر بول رہی تھی۔ اب بلکے انک گئی۔

”کہو بات جاری رکھو۔ جو بھی کہنا ہے۔“ پاپا نے پٹمہ صاف کر کے دوبارہ ٹاک پر نکایا۔ ان کا انداز است بندھاتا ہوا تھا۔

عروہ نے بہت لمبا سانس کھینچا۔

”آپ کی ریٹائرمنٹ میں اب کچھ ہی عرصہ پڑا ہے۔ ہمارے یہاں ایورٹیج عمر یہی ہے ساٹھ یا سینٹھ یا کچھ تھوڑی اور زیادہ۔۔۔ آپ دس سال سے ان جملوں کو جمیل رہے ہیں۔ اب میں جب سوچتی ہوں تو ہر دن سو سے شرمندگی غصہ بے بسی بہہ نکلتی ہے۔ پر پاپا!“

وہ خاموش ہو گئی اور اس بار یہ وقفہ بہت طویل تھا۔
”آپنی کی ماں لیں۔ آپ کو پتا ہے وہ اٹھائیس برس کی ہیں۔ ایورٹیج عمر کو دیکھیں تو معلوم ہے کتنے سال سزا جھیلیں گی شاید پینتیس سال، چالیس سال یا اس سے بھی زیادہ۔۔۔ اتنی لمبی سزا؟ آپ دس سال سے کٹ رہے ہیں کتنا مشکل ہوتا ہے ناں سزا بھیلنا جبکہ آپ مجرم بھی نہ ہوں۔ یونہی الزام میں بھگتتے ہوں۔ سکندر سلیمان کا ساتھ دنیا کی نظر میں خوش نصیبی ہو گا مگر خوشی واحد چیز ہے جو بتاتی نہیں جاتی کہ تم خوش ہو، یہ تول کے اندر سے نیل کی طرح پھوٹی ہے اور مارے وجود کو ہرا بھرا کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، دن بدن بے رنگ ہوتی جا رہی ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ دلائل اور جھمی تھے مگر پاپا کا سپاٹ ہوا اس نے ڈھیٹ بن کے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ انجام سے بے بردا ہو کر مگر نتیجہ۔۔۔ ”جاؤ تمہاری ماں اکیلی ماں میں لگی ہے۔ میرے لیے ایک کپ چائے دے ہا۔۔۔“

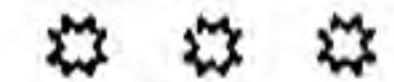
عروہ کی آنکھیں یک بیک بھرا آئیں۔ اس نے ٹاک ٹکڑی۔

میں رو رہی ہوں پاپا کو پتا تو چلے ناں۔

وہ چائے بناتے ہوئے بھی ادھیڑوں میں تھی۔
”ایک۔۔۔ ایک آخری بات کہہ دوں۔“ جب وہ چائے لے کر آئی تو احسان صاحب کے چہرے کی لمبھیر تاسے گھبرا گئی۔ مگر اب نہ کہا تو پھر کب؟

”بھی وہ۔۔۔ امی آپا سے بات کرنے لگی تھیں فون پر، آپ کے موبائل کی چارنگ ختم تھی تو کھٹنے بعد فون کرنے کا بولا ہے۔ یہی ایک گھنٹہ گزرے گا۔ امی ہاں کہہ دیں گی بات طے۔۔۔ پاپا! آپنی نے حکم عدولی نہیں کی، جو آپ نے کہا ماں لیا۔ ماں چکی ہیں وہ اپنی محبت میں پوری اتریں۔ پاپا آپ بھی تو اپنی محبت۔۔۔“

”باس۔۔۔ بس جاؤ پھلی جاؤ بس۔“ پاپا نے بے حد شرے لہجے میں کپ میز پر رکھ کے دروازہ دکھایا۔ عروہ کی ساری ہمداری ہوا ہوتی۔ وہ سرپٹ دوڑی۔



منگنی کی تقریب میں وہ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہ جواب دے دے تھک گئی۔ چوبیس کلیوں والے گاجر رنگ کے فراک کے ساتھ جوڑی وار باجامہ کی بس جھلک ہی دکھائی پڑتی تھی۔ لمبی پنسل ہیل۔ بال کھلے چھوڑے تھے اسے دیکھتے ہی بڑی تراوٹ اور خوشی کا تاثر ابھرتا تھا مگر۔

مگر دور سے نزدیک سے شکل کا خوب حشر بگڑا تھا۔ رو رو کر سوچی آنکھیں ٹاک سرخ پکڑا۔ گلا بیٹھ چکا تھا۔ احمر نے کہا۔

”یوں لگتا ہے جیسے شد کی کھیلوں نے دھاوا بولا ہو چہرے پر۔“ رونے سے ایسی سو جن تھی کہ نقش کچھ کچھ جاپانی اور کچھ تائیوانی لگتے تھے۔ یہی عالم علشبا کا تھا۔ عروہ نے کھیرے رکھے، آلو کے قتلے ٹھنڈے پانی میں ڈبو ڈبو کر آنکھوں کو سہلایا مگر۔۔۔ نتیجہ کیسے اچھا ملا۔ وہ جب کرتے کرتے پھر رو پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ انکو تھی پہنتے اور پہناتے وقت بھی ہسٹلی کی پشت پر آنسو پٹ پٹ کرتے رہے۔ کہاں تو یہ طے ہوا تھا کہ گھر کی شفٹنگ کے بعد رسم کی جائے گی اور کہاں آنا“ فانا“ تین دن کے اندر باقاعدہ فنکشن ارج کر لیا گیا۔

یہاں تصویر بنانے کا مقابلہ تھا۔ شامت عروہ کی تھی۔ سب اسے لازمی شامل کرنا چاہتے تھے۔ اب وہ علشہ کی طرح گھونگھٹ نکال کر تو بیٹھنے سے رہی۔ اس کی تصویر تو اچھی آئی جانی تھی۔

تیز گاجر رنگ کی لمبی قمیص اور کھلے رٹاؤز کے ساتھ تیز نیلے کنٹراسٹ کا خوب کام سے بوجھل دپٹہ بہت لمبے گھونگھٹ کی صورت چہرے پر گرا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سوٹ کی ہم رنگ چوڑیاں نکالی کو چھپائے ہوئے تھیں۔ ہاں سب سے زیادہ خوب صورتی اس کے ہاتھوں کی تھی جن کی صرف پہلی پوروں کو مندی سے رنگا گیا تھا اور وہ دھک رہی تھیں۔ اتنا سرخ شوخ امتگوں بھرا رنگ تھا کہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا۔

”منگنی پر انہوں نے اتنے نیرمادیے آپ کہیں تو بارات ہم بولیں پر لے آئیں۔ عروہ نے بھد احترام منگیتر صاحب کو کولڈ ڈرنک سردی تو موصوف خوش دلی سے بولے۔

”دراصل یہ اس منگنی پر راضی نہیں تھیں۔ آئی میں ہیں۔“ عروہ نے وانت چکچکا کر مگر اسی احترام سے کہا۔

”او آئی سی۔ چرچہ“ افسوس کا اظہار۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ صبر کے گھونٹ پیئیں عروہ نے باقاعدہ بد تمیزی سے ہاتھ پکڑ کے اس میں گلاس تھمایا۔

”دیے سب مہمان تو چلے گئے۔ آپ کب صوفے کی جان چھوڑیں گے؟“

”اتنی مشکل سے تو بیٹھنے کی اجازت ملی ہے اور ہم تو داغ کے ماننے والے ہیں“ حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے۔

”منگیتر صاحب کی ڈھنالی عروج پر تھی۔ نظروں ہی نظروں میں اسے تول رہے تھے۔

”عروہ! عروہ! امی اسے پکارتی آئیں۔“ اپنے بابا کو بلاؤ۔ وہ کہاں چلے گئے۔ کھو کہاں ہیں وہ۔“

”ارے!“ عروہ نے بہت مطمئن بیٹھے دو لہا کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور بابا کی تلاش میں اندر گئی۔

اس نے اندر جھانکا تو بابا بہت ڈھیلے سے کرسی کی پشت پر گردن گرائے بیٹھے تھے۔ وہ چند لمحے رک کر

دبے قدموں ان کے پیچھے آکر رک گئی۔

”اس وقت ایسے اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟“ اس نے دونوں بازو ان کی گردن میں حائل کر دیے اور گل سے

گل جوڑتے ہوئے بہت پیار سے پوچھا۔

”اور مجھے لگتا ہے میرے بابا دور ہے ہیں۔“ اس نے اپنا گل بابا کی آنکھ سے مس کیا۔

”اور مجھے لگتا ہے میری بیٹی بھی دور ہی ہے۔“ بابا نے چہرہ اور اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں کو بغور دیکھا

اور ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

”جیرانی کی بات رونا نہیں ہے۔“ عروہ شوخی سے گویا ہوئی۔ اس نے اپنی تین انگلیاں بابا کے چہرے کے

سامنے کیں۔ ”یہ آنسو ہیں۔ اس نے نمی کی جانب اشارہ کیا بتائیے کون سے میرے ہیں۔“ اس کی آواز میں نمی تھی۔

”دونوں میرے۔“ بابا نے انگلیوں کو بوسہ دیا۔ عروہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”چلیں باہر چلتے ہیں برا مزہ آئے گا۔“

”بابا!“ وہ پکار کر چپ ہو گئی۔

”مبوتو بھی!“

”آپ“ آپ۔۔۔ ابانہ بنیں تو کچھ پوچھوں۔“

”میں پہلے کب ابابنا ہوں۔“ وہ ہار ماننے والے انداز میں بولے۔

”میں جاتے ہیں کبھی کبھی۔“ وہ سوری۔

”عروہ! عروہ! اوھر آؤ۔۔۔“ امی اسے پکارتی آئیں۔

”جی امی!“ وہ سرعت سے کھڑی ہوئی۔

”اوھر کیا کر رہی ہو۔ وہاں نسیم آپا جانے والی ہیں۔ ایک تھیلا بریانی تو ڈال دو۔ اچھا نہیں لگتا۔ ایسے ہی

بیچتے ہوئے۔ اور آپ بھی آکر خدا حافظ کہیں۔ جلدی سونا عادت ہے مگر ابھی تو مہمان ہیں۔ آئے آپ بھی

باہر آئیے۔“ امی تیز تیز ہدایات دیتی باہر نکلیں۔ عروہ پیچھے پیچھے۔

ہم کسی بھی معاملے کی کوئی سی بھی تو جہد دے کر سامنے والے کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ سچی وجہ بھجھو لی وجہ

ہم جواب دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں مگر اصل جواز وہ جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں جب ہم خود سے

ہمکلام ہوتے ہیں۔ جب ہمیں خود کو تانا ہوتا ہے خود کو سمجھانا ہوتا ہے۔ دوسروں کو مطمئن کرنا آسان ہوتا

ہے مگر اپنی روح کی طمانیت۔ ہم اسے قائل کریں تو بات ہے۔

عروہ نے ہر طریقے سے منانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس دلیل بھی عقل بھی۔ جوش تھا ہوش

تھا۔ وہ رو کر نہیں کر لاؤ سے خفا ہو کر ہر طریقے سے انہیں منا چکی تھی مگر وہ اپنی ہٹ کے کپے تھے۔

عروہ ہار کر ان کے قدم پیچھے کر چکی تھی۔ مگر چلتے چلتے وہ ایک جملہ وہ ایک منظر نگاہی بس بات ختم اس نے

کہا۔ ”آپ اپنی زندگی جی چکے ہیں۔ آپ اپنی سزا جھیل چکے ہیں۔ اگر مزید امتحان میں پڑتے ہیں دنیا کا

سامنا کرنا پڑے گا تو کتنے سال دو سال دس سال۔ مگر علشہ کے سامنے پوری زندگی ہے۔

بڑی بھانک تصویر کشی تھی۔ دل کو کچھ ہوا ڈوب سا گیا مگر کئی گھبراہٹ۔ وہ باپ کی محبت احترام اور عزت کے معاملے میں اتنی ٹٹلی ہے۔ جان سے چلی جائے گی

مگر انہیں جھٹکا برداشت نہیں کر سکتی۔ سینہ چوڑا ہو گیا۔ تقاضے سے گردن اکڑ گئی مگر۔ وہی ڈھاک کے تین بات۔

”عزتراض کرنے والے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں اتنے ملل تک لڑکا اپنے گھر میں رکھا۔ کیسے ہو سکتا ہے کوئی

چکر نہ ہو۔ اور تو اور میاں صاحب ہی پوچھ لیں گے۔

مولن جیسے بندے کے ہوتے تمہارے گھروالوں کو کسی اور سے رشتہ کیوں کرنا پڑا؟ مولن سے کیوں نہ کیا؟“

طعنہ نیزے کی لہی کی طرح چبھا مگر سر جھٹک دیا۔

انہیں نے فون کھما دیا تھا۔ وہ اونچے لمبے میں آیا سے بات کر رہی تھیں۔ عروہ صوفے پر گھٹن گود میں

بیٹھے بیٹھی ناخن کتر رہی تھی۔ تب ہی چھٹا کے سے کچھ کرنے کی آواز آئی علشہ کے ہاتھ سے گلاس

چھوٹ گیا۔ وہ لہرا گئی تھی۔ انہوں نے گہری نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”سوری لہو گلاس پھسل گیا۔ ایسے ہی چکر آ گیا تھا۔“ وہ بدقت مسکرائی اور ”سب ٹھیک ہے“ کا

اشتہار منہ پر چسپاں کر دیا۔

سب ٹھیک نہیں تھا۔ انہیں کی فون پر بات اوھوری رہ گئی عروہ نے چیک کیا۔ اس کا بی پی خطرناک

حد تک لوہو گیا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ وہ تسلیاں دینے لگی۔

فون کی نیل بج رہی تھی۔ عروہ پیر پختی فون کی سمت بڑھی۔ دوسری طرف آیا تھیں۔ امی نے اشارے سے

کہا بعد میں بات کریں گی۔ وہ فون بند کرنے لگی تب ہی بابا نے ہاتھ بڑھا کر فون لے لیا۔

”تم جاؤ میں آپا سے بات کرتا ہوں۔“ ان کے لمبے

میں قطعیت تھی۔ عروہ کا سانس خشک ہو گیا۔ وہ جم سی گئی۔

”تم جاؤ۔۔۔ یہاں سے۔“

عروہ کمرے سے نکلی۔ بابا نے اسی فون پر علشہ کی منگنی کا دن طے کر لیا تین دن بعد۔

☆ ☆ ☆

”آپ نے یہ بتا کر اپنی بہن کے لیے گڑھا نہیں کھود لیا کہ وہ اس منگنی پر راضی نہیں تھیں۔“

عروہ آلتی پالتی مارے دو لہا دو لہن کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ دو لہا نے کب سے مچھلا سوال کر دیا۔

”کیا مطلب؟“ عروہ ٹھنکی۔ ”آپ میری بہن کو

جانتے نہیں۔
 ”ہم تو ڈوبے ہیں منہ منہ کو بھی لے ڈوبیں گے۔“
 علشبتہ نے کن اکھیوں سے دو لہا کو دیکھا جس کی
 شوخی و شرارت عروج پر تھی۔ ”اور تم آبی! کب تک
 یہیں بیٹھو گی چلو کمرے میں چلتے ہیں چلو اٹھو۔“ اس
 نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

”نہیں اٹھ سکتی۔“ علشبتہ منمنائی۔

”کیوں بھلا؟“ علشبتہ چیپ۔

”تو آپ اچھے پھر“ وہ دو لہا کی طرف مڑی۔

”نہیں اٹھ سکتا۔“ وہاں بھی عذر۔

”آخر آپ دونوں کو کیا مسئلہ ہے؟“ وہ غصہ ہوئی
 بلکہ۔ ”او آئی سی! آپ دونوں کے ایک ایک ہاتھ
 غائب ہیں کہاں ہیں۔“

”ایک دوسرے کے ہاتھ میں۔“ دو لہا نے اپنا ہاتھ
 اونچا کیا تو لہن کا ہاتھ بھی سامنے آگیا۔

”یہ دیدہ دلیری! اتنی ڈھٹائی۔“ عروہ کی آنکھیں
 پھٹ پڑیں۔

”ہم ہمت والے لوگ ہیں۔ اب چھوڑیں گے
 نہیں۔“ دو لہا نے ہاتھ پیچھے کیے اور اپنی جھولی میں رکھ
 لیے۔

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب جو ہوا آپ کی ہمت
 کا نتیجہ ہے؟“ عروہ نے کڑے توروں سے گھورا۔

دو لہا لا جواب ہو گیا۔ عروہ کے چہرے کو بغور دیکھا
 پھر اپنی گود میں سرخ مہندی والے ہاتھ کو۔

”ہمت نہ سہی محبت سہی۔“ وہ بہت دھیمے سروں
 میں بولے۔

”کیوں علشبتہ؟“ لہن سے تائید چاہی۔

”محبت۔“ عروہ نے دانت پیسے۔ ”ایک بات میں بتا
 دوں۔ یہ محبت کا نتیجہ تو ہے مگر آپ دونوں کی محبت
 نہیں۔ ایک تیسری محبت میری محبت جو مجھے آپ

سے ہے آپ دونوں سے ہے۔ آپ دونوں کی محبت
 جو میرے جسم میں خون کی جگہ دوڑتی ہے۔ آپ دونوں

کی ایک دوسرے سے محبت آپ کے کام نہیں آئی۔ یہ
 یاد رکھیے گا۔ یہ تیسری محبت ہے جس کی کارگزاری

ہے۔ اس تیسری محبت نے جان پر کھیل کے شیر کی
 کچھار میں ہاتھ ڈال کے۔ دکیل راتوں کو جاگ کر
 نظریہ ضرورت کا کیس ایسے نہیں بناتے ہوں گے
 جیسے میں نے دولا کل تیار کیے۔“

اس کے لہجے میں خوشی اور طمانیت تھی۔

”لیکن اب میں یہ سوچتی ہوں کیا یہ بھی میں بتاؤں
 گی کہ آپلی فیب احمد سے کتنی محبت کرتی ہیں اور فیب
 احمد آپلی سے کتنی۔ کیا یہ کام بھی مجھے کرنا ہو گا۔“

شرر ہوئی۔

”نہیں، نہیں۔“ مون نے سرعت سے اس کی
 بات کاٹی۔ ”تمہارا کام یہیں تک تھا۔ آگے میں خود

۔“

”مون بھائی!“ وہ پوری طاقت سے چیخی۔
 ”آہستہ آہستہ۔“ علشبتہ نے اس کے منہ پر ہاتھ

رکھا۔

”اول اول۔“ اس نے سروا میں بائیں، شیخ کر کے
 خود کو چھڑایا۔ ”یہ واحد فلم ہے جس کی ہیروئن نے

شروع سے آخر تک ایک لفظ نہیں کہا اور پھر بھی جیت
 گئی واہ!“

میرا دکیل جو اتنا اچھا تھا۔“ علشبتہ نے دوپٹہ ماتھے
 تک اوپر کر کے پیار سے عروہ کی ٹھوڑی چھولی۔ عروہ

نے ایک بل کو علشبتہ کا جگمگا تا چہرہ دیکھا۔

”آبی!“ وہ اس سے لپٹ گئی۔

”میں بھی بہت خوش ہوں۔“

”تو کیا میں۔۔۔ بھی۔“ مون بھائی نے جیسے
 جھجھکتے ہوئے اپنا آپ پیش کیا۔

”کوئی نہیں۔“ عروہ نے ان کا برہا ہاتھ جھٹکا۔ ”یہ
 سے ڈر نہیں لگ رہا۔ کیسے چپک کر بیٹھے ہیں چلے

جائے اب۔“

”جار رہے ہیں جار رہے ہیں۔ ہم دونوں جارہے
 ہیں۔“

”دونوں۔۔۔ اور پیلا۔۔۔ ان کی اجازت کے بغیر کبھی
 کچھ ہوا ہے؟ سارا خاندان اکٹھا ہے۔“ اس نے

ڈرایا۔

”سارا خاندان ہمیں اکٹھا دیکھنے کے لیے ہی اکٹھا
 ہوا ہے۔“ مون نے بہت مزے سے کہا۔

”ارے!“ عروہ کو سن کر بہت مزا آیا۔ وہ ہنسی

سارے مہمانوں کے لیے بڑی گھر کے کمرے میں بستر

بچا کر عروہ لونی تو تھا کاوٹ انگ انگ سے پھوٹ رہی

تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی۔ کرسی پر

جھول جھول کر چائے پیتے ہوئے سارے دن کو سوچتا

بہت دلچسپ تھا مگر وہ دروازے پر ٹھنک گئی پیلا بھی یہی

کر رہے تھے۔

”آپ نے بتایا نہیں کیسے مان گئے۔“ دونوں اپنی

جگہ خاموش تھے۔ وہ چائے پیتے ہوئے یہ اپنا کپ

بناتے ہوئے۔ پیلا بہت گہری سوچ میں تھے۔ اس نے

بہت سوچ سمجھ کر پکارا۔

”تم نے منایا جو تھا۔“

”اونہوں! اصل بات کیسے پیلا! مجھے تو جھاڑ کر نکال
 دیا تھا۔“

”تمہارے دلا کل دل غ پر ہتھوڑے کی طرح لگ
 رہے تھے۔ میں نے ان ضرروں کو برداشت کرنے کا

فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر۔“ پردیسر صاحب کی آواز بھرا

گئی۔

”اس کی فرماں برداری تابع داری اور اس پر بے
 چارگی جب وہ کہہ رہی تھی۔ میں ٹھیک ہوں اور اس

پر آنسوؤں سے بھری آنکھیں۔ وہ بہت سالوں کی
 دعاؤں کے بعد ملی تھی۔ گڑیا جیسی صابر شاکر خاموش

میں نے سب رشتے فراموش کر دیے، صرف باپ بن
 گیا۔ اس کی آنکھوں کی بے بسی اور ٹوٹنے کا بیج سالجہ

”میں ٹھیک ہوں۔“ ایسا گاسیہ پھل کر سماعتوں میں
 اندل دیا ہو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور وہ اس دن

عشق بھی تو کہہ رہا تھا۔ فرشتے بھی تہمت سے نہیں بچ
 پائے اور دوسرے میں تو حقیقت سے واقف ہوں ناں

بس اتنا کافی ہے۔“

”واہ!“ وہ ٹھنکی۔ آپ نے سارا کریڈٹ تابع
 داری کے خاتمے میں ڈال دیا اور میں۔۔۔ میرا کیا دھرا!“

”تابع داری کے بارے میں تم ہی نے بتایا تھا اور نہ

۔۔۔

مجھ سے تو ظلم ہو ہی رہا تھا۔ دراصل بات یہ ہے عروہ
 احسان۔ ”پیلا نے شوخی کا مظاہرہ کیا۔ ”ابھی تم وہاں
 کہہ رہی تھیں میں مون اور علشبتہ سے یہ سب
 تیسری محبت کا کارنامہ ہے جو تمہیں ان سے تھی جو
 مجھے تم سب سے ہے۔“

پیلا نے قصہ سمیٹ دیا۔

”پیلا! زندہ رہنے کے لیے محبت بہت ضروری ہے
 ناں؟ بہت دیر کی خاموشی کے بعد عروہ بولی۔

”ہاں بہت ضروری ہے میری تم سے۔ تمہاری ان
 سے۔ انسان کی انسان سے محبت بہت ضروری ہے۔“

پیلا نے تائید کی عروہ ہولے سے ہنس دی۔ باہر
 سردی تھی۔ خوشبو تھی اور چاند اپنے جومن پر۔

☆



فطرت میں ہٹ دھرمی ہے۔ وہ کھڑی کھڑی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔
صبا نے ایک نظریاں کو دیکھا۔ جانے وہ کیا سوچنے لگی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ چوم کے چھوڑ دیا۔
دو قدم آگے بڑھ کے دوبارہ وہ پٹی اور ماں کے پاس رک کے ایک بار پھر اس کے گلے سے لگ گئی۔ گال پر پیار کیا اور آنکھوں کی نمی چھپاتی باہر بھاگ گئی۔ پیچھے کھڑی آمنہ پیچھے ہی کہیں بہت دور نکل گئی۔

”جاؤ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔“
اس نے ایک نظر صبا کو دیکھا۔ سیاہ کڑھالی والی چادر میں اس کا چہرہ دیک رہا تھا۔ کچھ اندرونی خوشی اور کچھ قدرتی خوبصورتی تھی پھر جب وہ اسے پہلے نہیں روک سکی اپنے شوہر کو نہ مناسکی تو اب کیا کرتی؟
وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔ ایسے میں وہ اسے بھلا کیا سمجھاتی کہ تم اس اپنے تھاپتی لکڑیاں جلاتی عورت کو نہ نرم کر سکتی ہو اور نہ مناسکتی ہو۔ اس عورت کی

بھوکی تھوڑی رہی ہوں۔ ماشاء اللہ تینوں وقت تم نے اتنے اچھے اچھے کھانے کھائے ہیں۔ تازہ اور ذائقے دار۔ اب بندہ ساری زندگی اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے در پر تو نہیں بڑا رہ سکتا۔“
انہوں نے ایک سالس میں شکریہ مہربانی قدر شناسی اور مجبوری کا اظہار کر دیا۔
”چلیں بی جان!“ اندر سے آتی صبا نے ان ہی کے انداز میں چادر ماتھے تک کھینچ کے برابر کی پھر پاؤں خوبصورت ایرانی چپل میں گھسائے اور چھوٹا سا سفری بیگ لٹے ہاتھ میں متعل کیا اور پھر ڈرتے ڈرتے ماں کو دیکھا۔

”اللہ حافظ۔“ بی جان نے امی کو گلے لگایا سر پر بوسہ دیا پھر اسے باہر آنے کا اشارہ کر کے جالی دار دروازے سے نکل گئیں۔
”میں جلدی آجاؤں گی امی!“ وہ جھجکتے ہوئے ماں کے نزدیک آئی۔ پھر اپنا سیدھا ہاتھ زبردستی ماں کے ہاتھ کے ساتھ ملایا اور ان کے گلے لگ گئی۔
”تو آخر تم جارہی ہو؟“ آمنہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔
”آپ سے پوچھ کے جارہی ہوں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ماں کو دیکھا۔
”پوچھ کے نہیں اطلاع دے کر۔“ اس نے سر دلبے میں اس کی بات کاٹی۔
”امی! اب جاتے جاتے بھی آپ۔“ ماں کا سر دوساٹ انداز سے رلانے کو کافی تھا مگر سفر پر جانے سے پہلے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

کوئی تیسری مرتبہ اس نے نخوت سے ناک سکوڑی۔ اور گرد کا جائزہ لیا پھر کھٹی کھٹی سانس لی۔
”کتنی بدلو ہے بی جان!“ واضح الفاظ میں اس نے قدرے سچی آواز میں بھروسہ کیا۔
”بیٹی! ابھی بجلی آجاتی ہے پھر میں پنکھا چلا دوں گی تو تمہیں اتنی بدلو محسوس نہیں ہوگی۔ ویسے بھی ابھی بتول فاطمہ مرغیوں کو باہر نکال کر ڈربہ صاف کرے گی تو کچھ کمی ہو جائے گی۔ میں تو عادی ہو گئی ہوں۔ تم ابھی تک شاید نہیں ہو سکی ہو۔“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”جی ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔“ اس نے خود ہی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ بھلا یہاں مرغیوں کے ڈربے کی بدلو بجو اس کا دماغ تک سزا چکی تھی اس میں ان کا کیا قصور تھا۔
اس کی ماں کا خیال تھا وہ شادی پسند محبت جیسے الفاظ محض انہیں تنگ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے مگر جب ٹھیک دو دن بعد بی جان واپس جارہی تھیں تو۔
”اچھا آمنہ! بہت شکریہ۔ تم نے میرا بڑا خیال رکھا۔“
وہ چادر کو ماتھے تک کھینچ کے برابر کرتے ہوئے اس کی امی سے بولیں۔
”ارے کہاں بی جان! آپ اتنی جلدی جارہی ہیں۔ میں تو ٹھیک سے آپ کی تواضع بھی نہیں کر سکی۔“ وہ انکساری سے بولی۔
”نہ بابا۔ تواضع کیسی؟ سات دن رات صبح دہر



”اماں! آمنہ کو ایک مرتبہ دیکھ تو لو۔ یہ اچھی بہن کے دکھائے گی۔“

ابرار نے ایک مرتبہ پھر مایوسی سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اماں کے آنسو نہ رکے۔

”تم ایک نظر دیکھو تو سہی۔ وہ بچاری تھکی ہاری ابھی ابھی آئی ہے۔ آگے سے تم نے یہ سب شروع کر دیا۔“

ابرار جھل جھل سا کبھی ماں کو تو کبھی اپنی نئی نیلی دامن کو دیکھتا۔

”اماں! تھک کے ابرار اٹھا اور اندر چلا گیا۔ بہت سارے لینے کے بعد اماں انھیں پلو کے کونے سے آنسو صاف کیے پھر اسے سر پر جمایا۔ کنکھیوں سے اسے دیکھا پھر دائیں جانب غائب ہو گئیں۔

صبح کے وسط میں کھڑی زر تار کھڑی نے ایک مرتبہ پھر حیرت دکھ اور مایوسی سے سر جھکا لیا۔ بہت سے ممکنہ پالی سے اس کا گریبان اور دوشا بھگنے لگا۔

یہاں کے حالات اور اس کے استقبال کے بارے میں ابرار نے بہت اچھی طرح اسے بتا دیا تھا پھر بھی وہ ایک ابرار کے بھروسے چلی آئی تھی۔

دراصل ابرار نے بچپن سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور چونکہ یہاں کوئٹہ سے تقریباً ایک سو پچھتر کلومیٹر کے فاصلے پر رہنے بنے والے تقریباً سارے خاندان ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے پھر ہر وقت کا ذکر آنکھوں دیکھا حال۔

ابھی ابرار کا شعور پختہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے عہد کر لیا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس بات کا وہ اکثر برملا اظہار بھی کرتا تھا۔ اس کی ”بغاوت“ کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی سو ایسے میں اس کی اکلوتی بہن کا شوہر وقتاً فوقتاً اسے بہن سے شادی نہ کرنے کی صورت میں اس کی بہن کو طلاق کی دھمکی دیتا رہتا تھا۔

ابرار کی بہن لاکھ اپنے خیر و پڑھے لکھے بھائی پر تار کرے اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی مولیٰ اور توے کی رنگت والی منہ کو اپنے بھائی کے پہلو میں دامن

تھا۔

ابرار کی بہن لاکھ اپنے خیر و پڑھے لکھے بھائی پر تار کرے اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی مولیٰ اور توے کی رنگت والی منہ کو اپنے بھائی کے پہلو میں دامن

تھا۔

ابرار کی بہن لاکھ اپنے خیر و پڑھے لکھے بھائی پر تار کرے اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی مولیٰ اور توے کی رنگت والی منہ کو اپنے بھائی کے پہلو میں دامن

تھا۔

ابرار کی بہن لاکھ اپنے خیر و پڑھے لکھے بھائی پر تار کرے اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی مولیٰ اور توے کی رنگت والی منہ کو اپنے بھائی کے پہلو میں دامن

تھا۔

”بی جان! پھو اماں مان جائیں گی نا۔؟“ اس کا لہجہ آس و نراس سے بیگنا ہوا تھا۔ بی جان کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دانہ چلتی مرغیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سوال کو سنا نہیں یا شاید جان بوجھ کر ان سا کر گئیں۔

”بی جان! اب کے صبا بھی ان کے ساتھ آگے کھڑی ہو گئی۔

”صبا بچے! انہوں نے آہستگی سے ہونٹ

واکیے۔

بولتے ہوئے وہ یقیناً ”سوچ بھی رہی تھیں تب ہی ان کی نگاہیں غیر مرنی نقطے پر مرکوز تھیں۔ صبا سر تپا سماعت تھی۔ وہ ناراض یاں کو چھوڑ کے آئی تھی اور جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی مگر یہاں۔؟

”یہ جو بتول ہے ناں یہ اپنی ضد کی بڑی پکی ہے۔ تو کوشش کر لے آگے اللہ کی مرضی۔“

وہ اسے یہ سب بتا کے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سوتل میں سوچتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ”اللہ کی مرضی۔“ پھر اس کی طرف گھومیں۔ ”اور رہ گئی بات تیری ماں کی تو اس کی فکر نہ کر میں اسے منالوں گی۔ اسے منانا کون سا مشکل کام ہے۔“ انہوں نے سادہ لہجے میں کہا پھر ایک نظر اسے دیکھ کر ہار نکل گئیں۔

صبا نے کھڑکی سے دکھائی دیتی اپنی مستقبل کی ”سائس اور حال کی پھپھو“ کو دیکھا پھر طویل سانس لیتے ہوئے سوچا۔ ”واقعی امی کو منانا آسان ہے۔“

صبح کے عین وسط میں سرخ زر تار جوڑے میں کھڑی لڑکی نے پہلے حیرت پھر دکھ اور آخر میں مایوسی سے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتی اور میڑ عمر عورت کو دیکھا جس کے رونے کی اصل وجہ سے وہ تاحال ناواقف تھی۔

”اماں! شادی کرنا گناہ ہے؟“

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

ابرار نے ماں کے سامنے دوڑا نو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

کے روپ میں کھڑا برداشت نہ کرے مگر یہ بھی ماننے والی بات تھی کہ یہ سب نہ ہونے کی صورت میں اسے اپنے باپ کے گھر جانا پڑتا اور وہ بھی مطلقہ کی حیثیت سے۔

سو وہ آتے جاتے ماں کو باور کرانا نہ بھولتی۔

شہر سے فون آنے پر ماں حرف بہ حرف ابرار کے گوش گزار کر دیتی۔ بہن کی خاطر وہ ماں بھی جاتا اگر جو اس نے اپنی کلاس فیلو آمنہ کے لیے دل نہ ہارا ہوتا۔

بے شک بہن مطلقہ کی حیثیت سے گھر آگے بیٹھ جائے۔

وہ مجبور تھا۔ پتا نہیں وہ مجبور تھا یا پھر خود غرض۔

آمنہ کی آمد کے ٹھیک چار دن بعد۔

دروازے سے بہن کرتے اپنے تین سالہ بیٹے کو گود میں اٹھائے ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس اور ختم ہوتی امید کے سارے وہ آگئی۔

وہ جسے سب بتول فاطمہ کہتے تھے۔

اسے یہاں آئے پورا ایک دن ہو چکا تھا۔ دو سرائون شروع ہوئے بھی کافی وقت ہو چکا مگر پھر بھی وہ دکھائی نہ دیا۔ نہ اس سے ملاقات ہوئی سو جھنجھلا ہٹ بڑی فطری سی بات تھی۔

گھر کے کیٹھن، مرغیوں کی بدلو اور اپنی لالیعنی سوچوں سے پیچھا چھڑاتی وہ آگیا کر گھر سے باہر نکلی کہ پل بھر میں اس کی آگاہیٹ دھواں ہو گئی آنکھوں میں ڈھیروں ستارے، جگنو مچنے لگے، کیونکہ نظروں کے عین سامنے وہ تھا جس کی خاطر وہ اپنے گھر سے دور ”ایک سو پچھتر“ کلومیٹر کے فاصلے پر آئی تھی تھی۔

”کیسی ہو؟“ بدر نے آنکھوں کے راستے اسے دل میں اتارا پھر سامنے کھڑے میلے برتن دھوتی ماں کا لحاظ کر کے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”تم سناؤ کہدھر غائب ہو؟ آج دکھائی دے رہے ہو۔“

بدر کی نسبت اس نے اطمینان اور اعتماد سے

پوچھا۔

”میں نے کدھر جانا ہے؟ سارے راستے تو یہاں سے شروع ہو کے اب یہیں پر ختم ہوتے ہیں۔“

بدر نے خوبصورت مسکراہٹ لبوں سے سما کے نظر بھر کے اسے دیکھا پھر دیوار سے ٹیک لگا کر سکون سے کھڑا ہو گیا۔

صبا نے ایک نظر کھرا صاف کرتی اپنی پھپھو اماں بتول فاطمہ کو دیکھا۔ وہ تمام برتن دھو لینے کے فوراً بعد کھرا صاف کرتیں پھر اسی کھڑے پر بیٹھ کے اپنی گلابی پھٹی اڑیاں رگڑتیں اور ہاتھوں کو سارے پانی سے صاف کرنے کے بعد انھیں مگر آج کھرا صاف کرتے ہی وہ انھیں برتنوں کی نوکری اٹھائی اور ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلی گئیں۔

صبا نے دکھ اور مایوسی سے انہیں جاتے دیکھا۔ اس کا دل چاہا وہ ہاتھ برصا کے پھپھو اماں سے نوکری لے لے پھر انہیں اپنا نیت سے اپنے ساتھ بٹھائے مگر نہ جانے کیا تھا۔ ان کے بچ ان دیکھی اجنبیت کی دیوار حائل تھی وہ کیسے کوشش کرتی؟ کہ دوسری جانب پھپھو اماں کی سرد مہری اور لا تعلقی اول روز کی طرح جوں کی توں تھی۔ جس دن وہ آئی تھی پھپھو اماں نے سلام کے جواب میں سر پر سرسری سا ہاتھ پھیرنے کے بعد بس اتنا پوچھا۔

”مسفر آرام سے تو کھاناں۔ خوش رہو۔“

اور وہ جو بہت جوش سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھی تھی اتنا سرد انداز دیکھ کے مایوس ہو گئی۔

”کہاں کھو گئی ہیں محترمہ!“ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بدر نے پوچھا۔

”بدر! پھو اماں میرے یہاں آنے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ تو ضرورت کے علاوہ مجھ سے بات تک نہیں کرتیں۔ وہ مان جائیں گی؟ میں بہت پر امید ہو کے آئی ہوں۔“ اس نے ایک سانس میں ساری شکایت اس تک پہنچائی۔

”بات تو وہ مجھ سے بھی ضرور تا ہی کرتی ہیں۔“ اس نے سوچا۔

”یار! اتنے عرصے تمہارے سے ان کی عادت ہو گئی ہے۔ وہ میری موجودگی میں بھی اکثر خاموش ہی رہتی ہیں۔“

”مگر بدر! میں ان کی خاموشی سے وہ مطلب نہیں نکال سکتی جو تم سمجھتے ہو، یعنی تنہائی کی وجہ سے۔ میں یہاں یہ سالوں کی خاموشیاں، لا تعلقی ہی تو ختم کرنے آئی ہوں۔“

وہ بول چکی تو بدر کو دکھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلاکی شرارت تھی۔ ایک قدم آگے بڑھ کے بدر نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا واقعی تمہارے آنے کی وجہ صرف سالوں کی خاموشیاں اور لا تعلقی ختم کرنا ہی ہے۔ میں تو سمجھا تمہیں۔“ اس نے جان کے بات ادھوری بچھوڑ دی۔ صبا کے لیے بدر کا انداز بہت پیارا اور کچھ کچھ خوبصورتی لیے ہوئے تھا۔

”ہاں! ظاہر ہے میں اتنی دور اور کیوں آئی ہوں۔ تم ایسے ہی اپنے اندازے مت لگاتے رہا کرو۔“ وہ کچھ نروس ہو کے بولی۔

”ٹھیک ہے، اتم اتنے سالوں کی لا تعلقی اور خاموشیاں ختم کرنے کی کوشش کرو میں ذرا باہر کا شور شرابا دیکھ آؤں۔“

بدر نے مسکراہٹ دبائی۔ آنکھوں کی شرارت چھپائی اور ناک کی سیدھ میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

صبا نے اسے دور جاتے دیکھا۔ جوں کے بہت قریب تھا، پھر سوچا یہ خاموشی ختم ہو گئی تو ہم دونوں۔ اس نے مسکراہٹ دبائی۔ آنکھوں کی حیا چھپائی اور پھر اندر کمرے میں چلی گئی۔

ابرار واقعی اس کے لیے ڈھال بنا ہوا تھا۔ اس نے شادی کے دوسرے دن سے مرے دل سے گھر کے کام کاج سنبھال لیے تھے۔ ٹھنڈے بج کمروں کی صفائی، چکنائی سے اٹے برتنوں کی دھلائی، اینٹوں سے بنے

کچے صحن کی صفائی البتہ کھانا پکانا ابھی شروع نہیں کیا تھا۔ دراصل کیس نہ ہونے کی وجہ سے یہاں لکڑیوں کا چولہا جلانے کا رواج تھا۔ آمنہ کو اس چولہے پر پکانے کا تجربہ نہ تھا ابھی۔ سو وہ خود دل ہی دل میں ساس کی شکر گزار تھی جو اس کے باہر کا کام ختم کر کے آنے تک چولہے میں لکڑیاں جلا کے کھانا پکانے کی ابتدائی تیاری تو کر رہی تھی مگر شادی کے چوتھے دن بتول فاطمہ کی آمد نے تھوڑی تبدیلی کر دی تھی۔ اب وہ چکنائی سے اٹے برتن اور کچے صحن کی صفائی سے بچ گئی تھی۔

بتول فاطمہ بھی عجیب تھی بلکہ شاید نفسیاتی۔ یہ آمنہ کو لگتا تھا۔ طلاق کے بعد ظاہر ہے اسے بیس آنا تھا مگر آمنہ کی حیرت اس وقت دو گنی ہو گئی جب اس نے اسے اگلے دن سے ہی گھر کے کام کاج میں جتا دیکھا۔ اسے دیکھ کے لگتا جیسے کسی مطمئن اور سہاگن بیٹی نے چند روز کے لیے ماں کے گھر قیام کے دوران ماں کو آرام پہنچانے کی خاطر یہ سب کام اپنے ذمے لیے ہوں۔

پہلے دن کے علاوہ اسے دوبارہ بتول فاطمہ کی آنکھوں یا انداز سے معمولی سا شائبہ تک نہ ہوا کہ وہ اپنی طلاق یا گھر اچھڑنے سے دکھی یا غمگین ہوئی ہے۔ آمنہ اسے دیکھ دیکھ کے ہولتی رہتی مگر اس کے لبوں کی چپ اور اس کی آنکھوں کی دیرانی بتاتی کہ وہ کسی حد تک ٹوٹ کے بکھر چکی ہے۔

”گھر میں کتنی خاموشی ہے۔“ آمنہ نے جالی دار دروازے سے ڈھلتی شام کو دیکھا۔ صحن میں زرد نارنجی رنگ بکھر کے عجب لواسی بھرا ماحول بنا رہا ہے۔ آمنہ نے سوچا پھر سامنے بیٹھے ابرار کو دکھا۔

”آپ اسے فون کر کے کیوں نہیں بلا لیتے؟“ آمنہ جھنجھلا گئے بولی۔ ”کو تم بلاؤ۔“ ابرار نے جیب سے موبائل نکال کر

آمنہ کی طرف بڑھاپا۔ وہ بہت دیر سے خود کوئی وی میں مگن ظاہر کر رہا تھا۔ دیر اکلوتی لاڈلی بیٹی اتنے دنوں سے نظروں سے دور تھی یاد تو اسے بھی آ رہی تھی۔ ”جیسے میرے بلائے پر تو وہ آجائے گی؟“ آمنہ نے روٹھے لہجے میں کہا۔

”میرے بلائے پر بھی نہیں آئے گی۔“ ابرار نے اطمینان سے موبائل واپس جیب میں ڈالا پھر پی وی دیکھنے لگا۔

”آپ اسے کیوں نہیں سمجھاتے؟ وہ کیوں وہاں گھر سے اتنی دور اس لیے تھا پتی لکڑیاں جلاتی عورت کے قدموں میں جا کے بیٹھ گئی ہے۔“ آمنہ نے کلستے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

ابرار نے تاسف سے اپنی بیوی کو دکھا۔ اس نے بہن کا گھر اجاڑا وہ چپ رہی۔ اس کا اکلوتا بھائی جو باپ کی وفات کے بعد اس کا سرپرست بھی تھا اسے وہاں اکیلا چھوڑ کے اس کے ساتھ یہاں آبا اس نے معمولی شکوہ بھی نہ کیا۔ ابرار نے شہر میں بدر کی تعلیم کی وجہ سے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اس کی بہن چاہتی تو اپنے بیٹے کو روک لیتی پر اس نے ایسا کچھ نہ کیا، پھر بھی۔ پھر بھی اس عورت کا شکوہ ختم ہی نہیں ہوا کہ وہ اپنے تھانے اور لکڑیاں جلانے والی عورت ہے حالانکہ اسی لکڑیاں جلانے والی عورت نے اپنا گھر جلا کے راکھ سمیٹی اور بہت خاموشی سے وہیں آ بیٹھی، جہاں سے چلی گئی۔

”تم ہر وقت نفرت کے زہر میں بجھے تیر کیوں پھینکتی رہتی ہو؟ آخر ایسا کونسا تمہارا گلہ ہے جو اتنے سالوں کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا؟ اس لکڑیاں جلانے والی عورت نے تمہارا کچھ جھینا ہے؟ کچھ چرایا ہے؟ کچھ بگاڑا ہے؟“ ابرار نے ریموٹ پٹخ کے آمنہ کو گھورا۔ اس کا لہجہ دکھ اور تاسف میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ہاں! جھینا ہے میری بیٹی کو۔ وہ مجھے اپنی ماں کو چھوڑ کے وہاں چلی گئی ہے۔ آپ کی بہن کے پاس۔“ آمنہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہوتی تب بھی وہ ایسے ہی سنجیدہ ہوتی جبکہ صبا تو

اس کی اکلوتی اولاد ہے۔

”میری بہن نے نہ اسے بلایا تھا نہ خود لینے آئی تھی بلکہ تمہاری لاڈلی خود گئی ہے وہاں اور اگر چلی گئی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کی سکی پھوپھی کا گھر ہے۔“ اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

آمنہ نے حیرت سے اپنے شوہر کو دکھا۔ ایک عرصے سے وہ ابرار کو اپنے اشاروں پر بچا رہی تھی۔ آج برسوں بعد وہ اس طرح بھڑک کر بولا تھا۔ آمنہ نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

زندگی ایسے ہی گھٹ گھٹ کے گزر جاتی اگر اس کی زندگی میں اس کی بیٹی صبا نہ آتی۔ اتنے عرصے میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی اور وہ یہ کہ بی جان جو اس سے بالکل مخاطب نہ ہوتی تھیں اب اس سے بات کرنے لگی تھیں۔ شاید بیوی کی محبت تھی۔ اگرچہ شہر کی ایک بڑھی لکھی لڑکی دور گاؤں میں رہنے والی عورت سے کیا باتیں کر سکتی تھی پر یہ بھی بہت تھا۔ اسے ماں کی خود سے لا تعلقی اور بہن کی زندگی اجاڑنے کا دکھ اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ ماں کو منا کے، معافی مانگ مانگ کے تھک گیا تو بہن کی طرف پلٹا۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کی بہن دوبارہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے مگر جس دن اس کا سسرالی رشتے دار ایک سارہ کانڈ اس خبر کے ساتھ لایا کہ ”اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے اور بیٹے کو کانڈ پہ لکھ کے ہمیشہ کے لیے اس کے حوالے کر دیا ہے۔ ابرار نے دیکھا کہ بتول نے سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ کانڈ وصول کیا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں وہ شادی سے قبل رہا کرتی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا وہ سجدے میں پڑی ہے۔ معلوم نہیں کب تک وہ سجدے میں گری رہی مگر دوسری سب ابرار نے یہ بھی دیکھا کہ وہ معمول کی طرح گھر کے کاموں میں جتی ہوئی ہے۔ بے تاثر چہرے اور خاموش آنکھوں کے

بتول فاطمہ کے لئے بنائی جانے والی بنی تھی۔

سالوں سے تعلقات میں آئی سرورہی جوں کی توں تھی۔ اسے نہ آبا کی موت توڑ سکی نہ ابرار کی آمنہ اور صامیت شہر منتقلی اور نہ ابرار کے آنسو جو اس نے ایک رات پہلے بتول سے معافی مانگتے ہوئے بہائے تھے۔ اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش بھی کی۔ مگر بتول کے نکلے سے جواب نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔

”ایسے میں آپ یہاں کیا کمال کرنے آئی ہیں صبا بی بی۔“ ابو کی بتائی ساری تفصیل نئے سرے سے ذہن میں دوہراتے ہوئے صبا نے گویا خود سے پوچھا۔ وہ اس وقت کھرے پہ بیٹھی برتن دھورہی تھی۔ اپنے خیالات میں الجھتے اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بدر داخلی دروازے سے اندر آتے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔ ”تم کام کرتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔“ بدر نے اس کے سر پہ پہنچ کے کہا تو وہ چونکی۔

اس نے اپنی سیاہ بڑی ابرویوں اور کرخت ہوتے ہاتھوں کو دیکھا پھر سر جھٹک کے دوبارہ سابقہ کام کرنے لگی مگر خاموش رہی۔ ابھی وہ سارے گھر کی جاڑو لگا کے آئی تھی۔ بتول فاطمہ کا بخار دوا دارو کے باوجود ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

”یار! میرے خیال میں تم اپنی متوقع ساس کو متاثر کرنے کے چکر میں ہو۔“

کھرے سے تھوڑی دور دیوار سے ٹیک لگائے وہ اطمینان سے ہاتھ باندھے بری فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان کا رشتہ بھی بڑا عجیب تھا۔ نہ مکمل اظہار نہ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہ لمبی لمبی فون کالز اور نہ لمبے لمبے خط۔ بس بہت خاموشی اور سچے دل سے صرف ایک دوسرے کو اپنانے اور ساتھ رہنے کی سچی خواہش تھی اور اس خواہش پر زیادہ عمل اور اس کے پورا ہونے کا یقین تو انہیں ابرار نے دلایا تھا۔

ساتھ۔ اسے دل میں کچھ جھین سی محسوس ہوئی تھی۔ پھر ابرار کے شہر منتقل ہو جانے پر لی جانے جب بتول فاطمہ کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا تو بتول فاطمہ جیسے بے ضرر وجود نے صرف اتنا پوچھا تھا۔

”چھوڑ تو نہیں جائیں گی؟“ اس کے لہجے میں تنہائی اور اکیلے پن کا کرب تھا۔ لی جان نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگایا۔ بتول فاطمہ نے کچھ آنسو لی جان کے دوپٹے میں جذب کر دیے۔

اس نے ساری کچی لکڑیاں توڑ کے لکڑی کے بڑے اور موٹے ٹکڑوں کے ارد گرد رکھیں پھر ہلکا سا تیل چھڑک کے کانڈ سے آگ لگائی اور توار کھا۔ پھر بہت سلیقے سے پیڑا بنایا۔ روٹی بنانے والے لکڑی کے چپے اور سیدھے برتن پہ بیلن سے روٹی بنانے لگی۔ گول روٹی تو بے پراچی طرح سینک کے اتاری اور رومل میں بند کر کے رکھ دی پھر دوسرا پیڑا بنانے لگی۔

بتول فاطمہ بہت غور سے صبا کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔ اندر آتے بدر نے بھی بہت دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھا اور اچانک اند آنے والی خوشی کو اندر دباتے ہوئے سنجیدگی سے دواؤں کا شمار لا کر بتول فاطمہ کے پاس رکھا۔

چھلے دو دن سے بتول فاطمہ کو بخار تھا لی جان سارا کام کر لیتیں اگر صبا کرنے دیتی تو۔ اسے اپنی موجودگی میں دو بیمار عورتوں کو گھر کے کاموں میں کچھ دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ ابتدا میں وہ پھو اماں کی گہری خاموشی اور لا تعلقی سے ڈرتی تھی مگر جب وہ خلوص و اپنائیت سے آگے بڑھی تو بتول فاطمہ نے بھی خوشی خوشی اسے اپنی راجدھانی سونپ دی، پھلے مستقل نہ سہی۔

روٹی پکانے کے بعد اس نے جھٹے سے راکھ اڑھر اڑھر کی۔ آگ ہلکی ہلکی سلگ رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کے لی جان سے پتلی لی جس میں دھلی مرغی پیاز اور باریک کٹے لہسن تھے۔ ڈھکن لگا کے اسے چولہے پہ رکھا۔ یہ

”بات سنو! اگر ایسا ہے تو ایک خوشخبری سناؤں؟“ وہ مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا مگر صبا نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا بلکہ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”یار! چپ کی مار تو نہ مارو۔“ وہ دل گرفتگی سے بولا۔ بہت دیر سے خود کو بے نیاز ظاہر کرنی صبا نے چونک کے اسے دیکھا۔ واقعی وہ اتنے دنوں سے اسے چپ کی ماری تو مار رہی تھی۔

”بدر! اب بولنے کی باری اس کی تھی۔“ میں کیا کروں؟ ادھر ای نہیں مان رہیں! ادھر پھو ماں نہیں مان رہیں۔ میں۔۔۔“ وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کے رہ گئی۔

”تو تم مان جاؤ نہیں۔ تم یہاں آ جاؤ مجھ سے شادی کر کے۔“

گھر اصاف کرتی صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

”میں کیا مان جاؤں؟“ پھنسی پھنسی آواز میں وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں کما کے شہر میں رہائش کا بندوبست کر لوں گا“ پھر ماں اور تم کو لے جاؤں گا۔“ بدر نے اطمینان سے اپنی پلاننگ بتائی۔ وہ بھی اتنے دنوں کی آنکھ پھولی سے تنگ آ گیا تھا۔ نہ اس کی ماں بتول فاطمہ کچھ کہتی سنتی تھی نہ اس کی ممانی آمنہ نرم پڑی تھی۔ بدر صبا اور ابرار ان دونوں کے درمیان سینڈویچ بنے ہوئے تھے۔ سو آپار سہی!

صبا نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی تعلیم و تربیت شہر میں رہائش بغیر سوچے سمجھے اتنے دنوں سے اس کا یہاں قیام یہ سب باتیں مل کے بھی اس کے دل میں اس کی ماں کے دل میں گنجائش پیدا نہ کر سکیں۔ ”میں دیکھ رہا ہوں یہاں تم اتنی مشکل میں بھی نہیں ہو۔“

بدر نے نظریں چرا کے بمشکل کہا۔ وہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ صبا نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے وہ شخص کھڑا تھا جسے وہ بہت چاہتی تھی اور جس کی خاطر

وہ یہاں اپنی پھپھو کو منانے آئی تھی۔

”بدر! ہماری ماؤں کے دلوں پر سالوں پرانے ایک ایسے جھگڑے کی برف جمی ہے جس کے کڑواہٹوں میں سے آدھے تو مر کھ چکے ہیں۔ میں نے اپنی پوری محبت، خلوص اور سچائی سے پھو ماں کو راضی کرنے کے لیے وہ سب کیا جو شاید عام حالات میں ممکن نہ تھا مگر۔“ تھوڑی دیر کو وہ کمزور پڑی۔ اس کی آواز بھی لرزی۔ شاید آنکھوں میں پانی بھی چھلکا۔ مگر جب دوبارہ بولی تو آواز ہموار تھی اور لہجہ سہاگن تھا۔

بدر نے بدقت اس گلابی پیراہن میں نکھرے گلاب پر سے نظر ہٹائی تو نعلین کی گھڑی آگئی۔

”ابو مجھے لینے آرہے ہیں۔ میں کل واپس چلی جاؤں گی۔“

”میں تم سے کل بھی محبت کرتا تھا“ آج بھی کرتا ہوں۔ تمہارا ساتھ آج بھی میری خوشی ہے اور کل بھی تھا مگر میری ماں۔۔۔“ وہ کچھ دیر کو رکا۔ سارے دکھ اور غم صبا نے اس کی آنکھوں میں دیکھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میری ماں نے یہ سب جانتے بوجھتے مجھے آزاد چھوڑے رکھا۔ ماموں کے گھرانے کی بیٹی سے محبت پر میری ماں نے مجھے نہ روکا۔ ممانی کا احترام کرنے پر میری ماں نے مجھے منع نہ کیا۔ بی جان نے میرا تمہارا رشتہ پکا کرنے سے پہلے اور بعد میں دونوں دفعہ میری ماں کو بتایا، پوچھا انہوں نے بغیر اعتراض کیے خاموشی سے مجھے میری خوشی دے دی۔ میں تو ٹھیک طرح سے حیران بھی نہ ہو سکا حالانکہ ماں چاہتیں تو برسوں پرانا بدلہ لے سکتی تھیں۔“

وہ شاید تھک کے چپ ہو گیا تھا۔ حیرت سے کھڑی صبا نے اسے دیکھا اور پشیمانی میں گھر گئی۔

بھلا ماں کی محبت کے آگے اس کی محبت کی کیا اوقات تھیں؟

”اب اگر میں تم سے شادی کر کے شہر جا کے رہوں تو شاید ماں بین بھی نہ ڈالیں جیسے بی اماں نے کیا تھا۔“

وہ اسے دیکھ دیکھ کے رک رک کر کہہ رہا تھا۔ وہ اسے چاہتا تھا، یہ سچ تھا۔ مگر وہ اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ دو سراج تھا۔

”مگر اس سب کے باوجود میں ابرار ماموں نہیں ہوں۔ میں اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کے اپنے دل کی دنیا آباد نہیں کر سکتا۔ ہماری شادی شہر جا کے رہنے کی بات ان دونوں چیزوں پر اگر میری ماں راضی ہو گئی تو تمہاری قسمت اور اگر انہیں یہ پسند نہیں تو تم کسی اور سے شادی کر لینا۔ اور میں یہ سوچ لوں گا کہ تم میرے نصیب میں نہیں تھیں۔“

اپنے اندر کا تمام دکھ اور تکلیف اس نے قطرہ قطرہ صبا کے کانوں میں اندھا بنا۔ پھر بہت ضبط سے ایک نظر اس پر ڈالی۔ صبا نے بدر کو دیکھا۔

”بس اتنی مدت تھی میری محبت کی؟“ اس کی آنکھوں میں فریاد تھی۔

”بس اتنی ہی حقیقت تھی ہماری محبت کی۔“ بدر کی آنکھوں میں دم توڑتی امید تھی۔

وہ دونوں گم سم گھڑے تھے۔ ان کی تازہ محبت نوحہ بڑھ رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر کا سارا منظر اور اپنے کانوں سے ساری بات سنتی بتول فاطمہ نے سوچا۔

”نہ صبا آمنہ ہے نہ بدر ابرار ہے۔“

نہ میں بین ڈالنے والی بی اماں ہوں۔ پھر اتنے سالوں کی تنہائی نے مجھے کیا دیا۔

اتنے سالوں کی بے رخی نے آمنہ کو کیا دیا اور۔۔۔ سالوں سے منانے کے لیے آتے ابرار کو کیا ملا؟

اس نے بدر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے بھائی نے اسے بدر دیا۔ وہ بدر جو یہاں رہتا تو شاید نہ پڑھ لکھ سکتا نہ کمانے کے قابل ہو سکتا نہ مجھے اتنا مان دے سکتا تھا جو یہ اب دیتا ہے۔

لاکھ طلاق وہ داغ تھا جس نے اس کی زندگی کے تمام روشن چراغ بجھا دیے مگر اس کے بدلے اس کا بھائی بھی عمل سکھی نہ تھا۔ برسوں پرانی غلطی کی تلافی کے بدلے اس کے بھائی نے بغیر جتنائے بغیر بتائے اس

کے بیٹے کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پھر اس کی اتنے عرصے کی خاموشی نے اسے کتنا مستحضر بنا دیا تھا کہ اس کی اکلوتی بیٹی اپنی ماں باپ کو چھوڑے، یہاں تھی اس کے پاس۔

اس کا بیٹا بدر اس کے پاس تھا۔ اس کی منشا کے خلاف کچھ بھی نہ کرنے والا۔!

ابرار اس کا بھائی تھا اس کا ماں جایا۔ وہ اسے معاف کر چکی تھی۔

صبا اس کا خون تھی جو صرف اس کی خاطر اس کے بیٹے کی خاطر شہر چھوڑ کے یہاں سخت زندگی گزارنے آئی تھی۔ وہ اسے بھانپتی تھی۔

آمنہ۔۔۔ ہاں اس سے اس کا خون کا رشتہ نہ تھا۔ مگر۔۔۔

”آمنہ! میں نے تمہیں بھی معاف کیا۔“ اس نے کھڑکی کی جالی سے پیشانی ٹکاتے ہوئے

ہولے سے کہا۔ آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں اور دل اطمینان سے۔

اس نے صبا کو دیکھا وہ اس کا خون تھی۔ اس نے بدر کو دیکھا وہ اس کی جان تھا۔

اس نے سوچا الگ تو وہ رہ لیں گے مگر خوش نہیں رہیں گے۔ پھر یہاں دوبارہ سے شاید ایسی ہی کوئی کہانی دہرائی جائے۔ ایسے ہی کوئی بتول فاطمہ گھرا جڑ جلنے پر روئی آئے۔ ایسے ہی کسی ابرار کو اپنی ماں سے رو رو کے معافیاں مانگیں پڑیں۔

”نہیں۔۔۔ میں اب ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے دل میں پکا ارادہ کیا، پھر سکون سے آنکھیں موند لیں۔

وہاں شہر کی حدود میں آمنہ فون کان سے لگائے بی جان سے پوچھ رہی تھی۔

”بی جان! بتول فاطمہ مجھے معاف کر دے گی نا۔۔۔! ہے نا بی جان! اگر میں معافی مانگ لوں تو۔۔۔؟“

بی جان چپکے سے مسکرا دیں۔

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لہزیں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کلچ ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا تو وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جویریہ کے نانے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔

جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر جاتا ہے تو راستے میں جویریہ سے ملنے کے لیے راہوالی اتر جاتا ہے۔ وہاں

ندیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ حذیفہ انہیں اسپتال لے کر جاتا ہے۔ وہ جویریہ کے حوالے سے پریشان

ہوتے ہیں کیونکہ ادھیڑ عمر اور عیاش مختار و زاہد جویریہ کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ ندیم صاحب حذیفہ کی رضامندی سے

ایمر جنسی میں حذیفہ اور جویریہ کا نکاح بڑھوا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ حذیفہ اپنے باپ دانش کو آگاہ

کرتا ہے۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں مگر اچانک انتقال کر جاتے ہیں۔ حذیفہ جویریہ کو راہوالی چھوڑ کر لندن سے دانش کی

میت لانا ہے اور اسمارہ کو شادی کا بتاتا ہے۔ اسمارہ اور رعنا بہت تھکا ہوتی ہیں عرشی تیمپاگل ہو جاتی ہے۔

مختار و زاہد حذیفہ کی غیر موجودگی میں جویریہ پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے۔ وہ عزت بچا کر تول خالہ کے گھر نہایتی ہے۔ بتول خالہ کا بیٹا میر جویریہ کو لاہور میں حذیفہ کے گھر لے کر آتا ہے۔

سکالوٹ

سَوْنِیَ لَوِیڈ

سَہی پَروَی



Saba

رعنا اور اسارہ گاڑی میں گھر سے باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ جویریہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ حذیفہ کی بیوی ہے۔ وہ دونوں اس کو سخت ست کہہ کر گھر میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔ جویریہ مایوس ہو کر پلٹ آتی ہے۔ حذیفہ جویریہ کو تلاش کرتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ رعنا اسے بتاتی ہے کہ جویریہ گھر آئی تھی اور وہ حذیفہ سے جڑے رشتہ کی قیمت لے کر چلی گئی ہے۔ اب واپس نہیں آئے گی۔ اسارہ بہت شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ حذیفہ ان کی خوشی کی خاطر عرش سے شادی کر لیتا ہے۔

مرنے سے پہلے اسارہ حذیفہ کو جویریہ کے بارے میں سچ بتا دیتی ہے۔ جویریہ کو بتا چلتا ہے کہ بتول خالہ اور ان کا بیٹا منیر رعنا سے ملا ہوا ہے اور ان سے پیسہ لیتا ہے تو وہ گھر چھوڑ دیتی ہے اور ایک حادثے کے نتیجہ میں پروفیسر صاحب کے پاس پہنچ جاتی ہے جو ایک فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں۔ وہ ماں بننے والی ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

عام طور پر حذیفہ بھی عرش کو کہیں آئے جانے سے نہیں روکتا تھا مگر جب سے وہ امید سے ہوئی تھی وہ بھی اسے زیادہ تھکا دینے والے کاموں سے منع کرنے لگا تھا۔

”ناراض تو وہ تب ہو گا جب اسے پتا چلے گا۔ وہ تو اسلام آباد گیا ہوا ہے۔“ عرش نے رعنا کا کمزور سا احتجاج ایک سیکنڈ میں رو کر دیا۔

”مگر عرش! رعنا اب بھی متذبذب تھیں۔“ پلیز می! پلیز۔“ عرش کی ضد کے آگے رعنا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میوزیکل ایوننگ کے سارے انتظام کی ذمہ داری رعنا کے ہاتھ میں تھی۔ شو دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آرہے تھے۔

عرش کے لیے رعنا نے سامنے والی قطار میں ایک آرام دہ کرسی رکھوا دی تھی جہاں سے وہ اسٹیج پر ہونے والے پروگرام سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ رات اچھی خاصی گزر چکی تھی اور ابھی تک کسی ڈھنگ کے سٹگرے پر فارم نہیں کیا تھا۔ ابھی تک مختلف اور چھوٹے موٹے صداکار و گلوکار ہی اسٹیج پر خانہ بری میں مصروف تھے۔ عرش اب بیٹھے بیٹھے ٹھکنے لگی تھی۔ رات کے بارہ بجے مشہور بینڈ کی آمد ہوئی تو مجمع میں شور مچ گیا۔

رعنا کی مصروفیات کا دائرہ ہمیشہ کی طرح وسیع تھا۔ آج کل وہ ایک چیریٹی شو منعقد کروانے کے سلسلے میں مصروف تھیں جس سے ہونے والی آمدنی کو یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔

شو کا اہتمام کافی بڑے پیمانے پر کیا جا رہا تھا۔ پبلسٹی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میوزک کی دنیا کے بڑے بڑے ناموں کو اسٹیج پر فارم کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ عرش کو جب پتا چلا کہ اس کا فیورٹ بینڈ بھی اس کانسرٹ میں پر فارم کرنے والا ہے تو وہ جانے کے لیے چل گئی۔ ”میرا خیال ہے تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔“ رعنا نے اس سے کہا۔

یوں تو رعنا کو عرش کو کبھی بھی کہیں لے کر جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا مگر اس بار اس کی حالت کے پیش نظر وہ تھوڑا تذبذب کا شکار تھیں۔

”آپ خواہ مخواہ کیوں فکر کرتی رہتی ہیں؟ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور پھر آپ بھی تو وہاں ہوں گی نامیرا خیال رکھنے کے لیے۔“ عرش نے لاڈ سے کہا۔

”حذیفہ کو پتا چلے گا تو وہ ناراض ہوگا۔“ رعنا ہمیشہ کی طرح عرش کی ضد کے آگے کمزور پڑنے لگیں تو حذیفہ کا نام لے کر اسے باز رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

بینڈ کو پسند کرنے والوں میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی جن کا جوش و خروش قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

اس شو کو ٹی وی کے کسی مقامی چینل سے بھی ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ جگہ جگہ اسٹیج پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کے لیے اسٹینڈز کے اوپر لائٹس اور کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ اسٹیج کے سامنے زمین پر بے شمار تاروں کے گچھے بکھرے پڑے تھے۔

بینڈ نے اپنے دو مشہور مگر لمبی تان والے گانوں کے بعد بھنگدا کا آغاز کیا۔

جوم کو جوش آیا۔ لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تیز میوزک کی دھن پر کچھ مینچلے نوجوان پچھلی سیٹوں سے اٹھ کر اسٹیج کے سامنے آکر ناچنے لگے۔ بینڈ کے پیش کیے ہر نئے آئٹم پر میوزک پہلے سے بھی زیادہ تیز ہونا گیا اور اسٹیج کے سامنے رش ٹھکنے کے بجائے بڑھتا گیا۔

عرش سب سے آگے والی نشست پر بیٹھی تھی مگر ان بے ہنگم طریقے سے اچھلتے کودتے لڑکوں کی وجہ سے اسے اسٹیج ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسلسل دائیں بائیں ہو کر دیکھنے کی کوشش میں سخت بد مزہا ہو رہی تھی۔ تب ہی ان ہلاکلا کرتے لڑکوں میں سے کسی ایک کا پاؤں زمین پر پڑے تاروں میں الجھا اور وہ اپنا توازن کھو کر دوسرے سے جا ٹکرایا اور دوسرا تیسرے سے، یہاں تک کہ جھومتے لڑکوں کا ایک پورا ٹولہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرف کو آکر گرا، جہاں عرش بیٹھی ہوئی تھی۔

عرش کے منہ میں سے نکلنے والی دل دوز چیخ تیز میوزک کے شور میں ہی کہیں دب گئی۔ لڑکے آوے منٹ کے اندر اٹھ کھڑے ہوئے مگر عرش کرسی سمیت وہیں زمین پر پڑی رہی۔

آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں نے عرش کے بے سدھ وجود کو ہلا جلا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رعنا خدا جانے کہاں سے دوڑتی

ہوئی آئیں۔ عرش کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پر پھول گئے۔ بے ہوش عرش کو گاڑی میں ڈال کر وہ گولی کی رفتار سے کلینک کی جانب روانہ ہوئیں۔ ڈاکٹر کو انہوں نے راستے میں ہی فون پر مطلع کر دیا۔ ان کے کلینک پہنچنے تک ڈاکٹر بھی وہاں آچکی تھی۔ کلینک کا عملہ عرش کو فوراً ”آپریشن تھیٹر“ میں لے گیا اور آپریشن تھیٹر کے باہر شدید خوف و ہراس میں مبتلا رعنا اس کی سلامتی اور زندگی کی دعائیں مانگنے لگیں۔

رات کے جانے کس پر عرش نے آنکھوں پر گرے بھاری پیوٹوں کو بمشکل اٹھایا تو کمرے کی سفید چکنی دیوار اور اس پر سے منعکس ہوئی ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح سے چھبی۔ اس نے کچھ بھی دیکھنے کی کوشش ترک کرتے ہوئے آنکھیں واپس موند لیں۔

عرش کا ذہن پوری طرح سے بیدار نہیں تھا مگر پھر بھی اسے کمرے میں اور لوگوں کی موجودگی کا احساس ان کی دھیمی دھیمی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آواز رعنا کی اور دوسری یقیناً ”ڈاکٹر کی تھی۔ عرش کو اس وقت جانے کی کوشش کرنا بے حد کھن کام لگ رہا تھا۔ اس نے بیدار ہونے کی کوشش ترک کرتے ہوئے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

صبح جب عرش کی آنکھ کھلی تو رعنا ایک چھوٹا سا بچہ اس کے پہلو میں لٹا رہی تھیں۔

وقت کا پتا نہیں تھا لیکن کھڑکی سے اندر آتی دھوپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھا خاصا دن چڑھ چکا ہے۔ ”مئی! یہ۔۔۔؟“ عرش نے نہایت کمزور آواز میں حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”یہ تمہاری بیٹی ہے جسے تم نے رات میں جنم دیا ہے۔“ رعنا نے جواب دیا۔

”لیکن میرا بچہ تو بچ نہیں سکا تھا۔“ عرش کے منہ سے نکلا۔ بچی کے اطراف تکیہ پھنسا تی رعنا نے ایک

دم سراٹھا کر عرشی کو دکھا۔

”میں نے رات کو آپ کی اور ڈاکٹر کی باتیں سن لی تھیں۔“ عرشی نے رعنا کی نظروں سے خائف ہو کر بتایا۔

عرشی کی بات سن کر رعنا کے چہرے پر شکست کے آثار نمودار ہوئے۔ عرشی سے زیادہ اس آنے والے بچے کی مختصر وہ خود تھیں۔ رات کے سانچے کے بعد ان کے دل پر کیا ہتی ہوگی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ ”تو تمہیں پتا لگ چکا ہے۔“ رعنا نے ہلکے لہجے میں کہا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔ فی الحال اس بچی کو اپنے ساتھ لٹالو۔ میں نے ڈاکٹر سے سارے معاملات طے کر لیے ہیں۔ کسی کو کچھ خبر نہیں ہوگی۔“

”مگر یہ ہے کون؟ آپ اسے لائی کہاں سے ہیں؟“ عرشی نے اٹھ کر بیٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ خود کو بستر سے ایک انچ بھی اوپر اٹھا سکتی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور کمر کے پیچھے تکیے رکھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔

اتنی سی مشقت سے ہی وہ بے دم ہو گئی۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

”بنتو کے جانے والوں میں سے کسی کی بچی ہے۔ لاوارث ہی سمجھو۔ ماں پیدا کرتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ باپ کا پہلے ہی پتا نہیں تھا۔ رشتہ داروں میں سے کوئی بھی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے تھوڑے سے پیسوں کے عوض بخوشی اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہو گئے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط برتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ بچی کون اور کہاں لے کر گیا ہے۔ اس لیے بے فکر رہو۔ کبھی کوئی اس کا پوچھنے نہیں آئے گا۔“ رعنا نے عرشی کو بچی کی دست یابی کی مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔ ”آخ۔ نو کرائی کی رشتہ دار؟“ عرشی کو ہنسی سی جان سے گھن آئی۔

عرشی نے ساتھ لیٹی بچی سے کھسک کر پرے ہونے

کی کوشش کی بھی بچی چھوٹنے سے غریبی کے جراثیم اسے بھی لگ جائیں گے۔

”اسے لوٹا دیجیے مئی۔ مجھے کوئی بچہ وچہ نہیں چاہیے۔“

”بے قوفی کی باتیں مت کرو عرشی!“ رعنا اس پر مجبزیں۔

”بے قوفی کی بات تو آپ کر رہی ہیں۔“ کمزوری کے باوجود عرشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”نبجانے کہاں سے اسے اٹھا کر لے آئی ہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ آپ اسے فوراً واپس لے جائیں۔“

”تم جانتی ہو نا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔“ رعنا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہاں جانتی ہوں۔ میرا بچہ زندہ نہیں بچ سکا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کسی کا بھی بچہ اپنی گود میں ڈال کر بیٹھ جاؤں۔“ عرشی نے وجود میں آنے والی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے پھر کر کہا۔

رعنا کچھ دیر لب بلبیچے عرشی کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

”مجھے نہیں معلوم کہ رات میرے اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کتنا حصہ تم نے سنا اور کتنا نہیں بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ اس بات چیت کا ایک بہت اہم نقطہ تمہارے گوش گزار ہونے سے رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تم انتہائی بری حالت میں یہاں لائی گئی تھیں کل رات نہ صرف تم اپنے ہونے والے بچے کو کھوپچکی ہو بلکہ تمہارے آئندہ ماں بننے کے امکانات بھی ختم ہو چکے ہیں۔“

رعنا نے بھاری ہوتی آواز کے ساتھ عرشی کو بتایا تو اسے پہلی بار اپنے وجود میں پھیلے خالی پن کا بری طرح احساس ہوا۔

یہ سچ ہے کہ عرشی شادی کے بعد اتنی جلدی بل بچوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن رعنا کے سمجھانے پر وہ اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھی اور

لب لب اس نے ذہنی طور پر خود کو ماں بننے کے لیے طے کر لیا تھا تب یہ سن کر کہ وہ کبھی ماں کے مرتبے پر نہیں ہو پائے گی اسے واقعی دھچکا لگا۔

”میں تمہیں یہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔“ عرشی کی ہل پڑی رنگت کو دیکھ کر رعنا نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ اس وقت تم اس بچی کو اپنا کر حذیفہ کی نظروں میں مرقوم ہو سکتی ہو۔ آج کے بعد تمہیں ایسا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

عرشی چپ رہی۔ اس نے جو کچھ سنا اسے اب لب لب نہیں آیا تھا۔

”دیکھو! جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔ اس بچی کو اپنے برابر لٹالو۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ سمجھنے والا ہے۔ اسے کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔“

عرشی کی خاموشی میں رضامندی کا عنصر پا کر رعنا نے ایک بار پھر بچی کو عرشی کے نزدیک کیا۔

رعنا کے ایسا کرنے پر عرشی نے پہلی بار نظر اٹھا کر ماتھ لیٹی بچی پر ڈالی۔

گلابی کپل میں لپٹی روئی کے گالوں جیسی نرم و نازک بچی واقعی دل موہ لینے کی جد تک معصوم اور پیاری تھی۔

پر وہ بھی عرشی تھی۔ اتنی جلدی کیسے پہنچ جاتی۔

”مئی! آپ کو لانا ہی تھا تو لڑکا لے کر آئیں۔ جب مھوٹ ہی بولتا ہے تو پھر اس جھوٹ سے پورا فائدہ حاصل کرتے۔“ عرشی نے کہا۔

شاید اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ بیٹے کی ماں کو وہ حذیفہ کی نظروں میں زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔ لڑکا نہ لے کر بڑھی لکھی عرشی کے ذہن میں اس اکتیہ پرانی ٹڈل ٹکاس سوچ نبھانے کہاں سے آئی۔

”بے وقوف لڑکی!“ رعنا ایک جلال میں آ گئیں۔

”بچے کیادکانوں پر ملتے ہیں جو جا کر اپنی مرضی کا اٹھا کر لے آتی۔“

”میرا مطلب تھا کسی یتیم خانے سے۔“ رعنا کو اس طرح غصے میں آنا دیکھ کر عرشی تھوڑا سا دباک گئی۔

”دنیا کا کون سا ایسا یتیم خانہ ہے جو چند گھنٹے کا نوزائیدہ بچہ راتوں رات تمہارے ہاتھ میں تھما دے گا۔ بچے کو ایڈاپٹ کرنے کے لیے کتنی لمبی قانونی کارروائی کرنی پڑتی ہے، کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟“ رعنا ایک بار پھر گر جیسی۔

”لو۔ اسے پکڑو اور فیڈ کراؤ۔“

رعنا نے سوئی ہوئی بچی کو جواب انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے کی تیاری کر رہی تھی بمبستر سے اٹھا کر عرشی کی گود میں ڈالا۔ بچی تھوڑی کمزور تھی۔ یہ بھی عرشی کے حق میں اچھا تھا۔ اس کی اپنی ڈیلیوری میں ابھی تھوڑا دقت باقی تھا۔ ایک قبل از دقت پیدا ہونے والے بچے کے طور پر وہ بچی بالکل موزوں تھی۔

عرشی جو اپنے آپ کو ایک لے پالک بچے کو اپنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔ رعنا کی یہ نئی ہدایت سن کر بالکل ہی بدگ گئی۔

”واٹ؟ میں اور اسے فیڈ کراؤں۔ نو دے۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ دودھ پلانے کا ارادہ تو اس کا خود کے بچے کو بھی نہیں تھا۔ پھر اس بچی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”مئی! آپ کہتی ہیں تو میں اسے رکھ لیتی ہوں، لیکن میں اسے فیڈ ویڈ بالکل نہیں کراؤں گی۔ آپ اس کے لیے اوپر کے دودھ کا بندوبست کیجیے۔“ عرشی نے بڑھائی سے کہا۔

بچی ابھی تک اس کی گود میں پڑی تھی۔ اچانک عرشی کو اپنے اوپر تیزی کے ساتھ پھلتے کیلے پن کا احساس ہوا۔

”اومائی گاڈ! اس بچی نے مجھے سارا گندا کر دیا۔ اٹھائیے اسے۔“ عرشی نے بچی کو خود سے پرے دھکیلا۔

”کم از کم مجھے دینے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتیں کہ اس کا ذائقہ ٹھیک سے بندھا ہے یا نہیں۔“ عرشی کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

رعنا نے چپ چاپ بچی کو اٹھا کر بنتو کے حوالے

کر دیا جو اس سے پڑے تبدیل کرنے لے گئی۔
تھوڑی دیر میں حذیفہ بھی پہنچ گیا۔
”حد ہو گئی خالہ! آپ کو مجھے رات کو ہی اطلاع
کر دینی چاہیے تھی۔“ وہ ناراض ہو رہا تھا۔
”بس بیٹا! سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ میں
ہی نہیں آیا۔“ رعنا اس سے نظریں چرائے کہہ رہی
تھیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو بچی بستر کے ساتھ رکھی
کٹ میں سو رہی تھی۔
”کیسی ہو؟“ وہ پہلے عرشی کے پاس آیا پھر عرشی سے
مثبت جواب دیا کہ کٹ کی طرف مڑا۔
بچی پر نظر پڑتے ہی جو چمک حذیفہ کے چہرے پر
آئی اس نے عرشی کو رعنا کے اس تیز رفتار اور دور
اندیش قدم کا قائل کر دیا۔ رعنا نے حذیفہ اور عرشی
کے رشتے میں اس بچی کو لا کر ایسی مضبوط گرہ باندھی
تھی کہ ساری دنیا کی جو ریا میں بھی آجائیں تو اسے نہ
کھول سکتی تھیں۔

اس بچی نے صرف چند لمحوں میں وہ کر دیا جو عرشی
اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک نہیں کر پائی
تھی۔ اس نے حذیفہ کا دل اپنے قبضے میں کر لیا۔
پہلی بار جو یہ تہائی بلا کا خوف عرشی کو مکمل طور پر
اپنے دل سے نکلنا محسوس ہوا۔
”اب دیکھتی ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے
ہو۔“ عرشی نے بچی کے ماتھے کو پیار سے چومتے حذیفہ
کو دیکھ کر مطمئن انداز میں سوچا۔
بچی واقعی بہت پیاری تھی اور دن بدن اور بھی
پیاری ہوتی جا رہی تھی۔ حذیفہ نے اس کا نام ہنہ
رکھا۔

ہنہ زیادہ تنگ کرنے والی بچی نہیں تھی۔ فیڈ
کرا کے کٹ میں ڈال دو تو گھنٹوں خود ہی پڑی کھیلتی
رہتی۔

وہ تیزی کے ساتھ بڑی ہو رہی تھی اور اس کے
بڑھنے کے ساتھ اس سے جڑی ذمہ داریوں میں بھی

اضافہ ہو رہا تھا۔

رعنا نے ہنہ کو سنبھالنے کے لیے فل ٹائم آیا کا
بندوبست کر دیا تھا۔ ہنہ کو سنانا، دھلانا، کھلانا، پلانا
سب آیا کے فرائض میں شامل تھا۔ عرشی کا کام فقط
اسے گود میں بھر کر کلینک سے گھر تک لانا تھا جو وہ
کر چکی تھی اور اب ہر قسم کی فکر و ذمہ داری سے آزاد
ہو کر اپنی پرانی رو میں پروا پس لوٹ چکی تھی۔

لیکن حذیفہ کی زندگی میں ہنہ کے آنے سے بہت
بدلاؤ آگیا تھا۔ ہنہ چست بچی تھی۔ جب بیٹھ نہیں
سکتی تھی تب بھی ٹانگیں بار کر خود پر سے کبل اتار
دیتی اور چھوٹی سی کٹ میں گھوم کر کہیں سے کہیں پہنچ
جاتی۔ اسے سی والے کمرے کے خشک و خوشگوار ماحول
میں آیا کٹ کے برابر بچھے اپنے بستر پر بے سددہ بڑی
خرائے لیتی رہتی۔ حذیفہ ہی راتوں کو بار بار اٹھ کر
اسے جا کر کبل اوڑھا کر آتا۔ اس کے اس دیوانے پن
پر عرشی کو ہنسی آتی۔

جیسے جیسے ہنہ بڑی ہوتی گئی حذیفہ کی وارفتگی میں
کی آنے کے بجائے اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ
عرشی کو چڑھنے لگی۔ اپنا بچہ ہوتا تو اور بات تھی مگر
ایک غیر کے لیے حذیفہ کے دل میں اتنی محبت کا پینا
عرشی کو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

ہنہ بھی حذیفہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ سارا
دن بلیا بلیا کی گردان لگائے رکھتی۔ اس نے ہر وہ کام کرنا
ہو یا تھا جو حذیفہ کرتا تھا۔ ہر بات میں وہ حذیفہ کی کاپی
کرنے کی کوشش کرتی۔

حذیفہ کو چیز سلاکس پسند تھا تو ہنہ کو بھی وہی
چاہیے ہوتا۔ حذیفہ ناشتے کے ساتھ اور بج جو س پیتا
تھا تو ہنہ بھلا کچھ اور کیسے لے سکتی تھی۔ حذیفہ کی
عادت تھی کہ وہ کولڈ ڈرنک کی بوتل یا گلاس میں سے
آخری دو گھونٹ ہمیشہ چھوڑ دیتا تھا تو ہنہ بھی ٹاپ کر دو
ہی گھونٹ بچاتی۔ یہاں تک کہ اس نے پہلی بار جب
اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں پینل پکڑی تو حذیفہ کی
دیکھا دیکھی سیدھے کے بجائے اسے ہاتھ میں تھامی۔

رفتہ رفتہ یہ چھوٹی اور معمولی باتیں بھی عرشی کی
برداشت سے باہر ہونے لگیں۔

”آپ نے یہ کیسی مصیبت لا کر میرے گلے میں
ڈال دی ہے۔ حذیفہ کو ہنہ کے سوا کچھ دکھتا ہی نہیں۔
میں تو جیسے ان دونوں کے درمیان ہو کر بھی وہاں نہیں
ہوتی۔ اس سے تو بے اولاد ہی بھلے تھے۔“

عرشی نے رعنا کے سامنے دل کی بھڑاس نکالی جو قد
آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ساڑھی کی فال
درست کر رہی تھیں۔ انہیں تھوڑی دیر میں کسی
فنکشن میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ وہ اس وقت
عرشی کے ساتھ اس ذاتی قسم کے رابلم پر لمبی چوڑی
بحث کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھیں۔

”تم خواہ مخواہ ہر بات کا بٹنکڑ بنا لیتی ہو۔ اگر حذیفہ
اس بچی سے پیار کرتا ہے تو کرنے دو۔ تمہارا اس میں
کیا بگڑتا ہے؟“ رعنا نے لا پرواہی سے کہا۔

عرشی کو ہمیشہ سے ہی ہر اس شخص کا وجود کھٹکتا تھا
جو تھوڑی دیر کے لیے بھی حذیفہ کی توجہ اس پر سے ہٹا
کر اپنی طرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب اس بار
سگی خالہ ہونے کے باوجود عرشی کی اس جلن سے مستغنی
نہ ہو سکیں تو پھر ہنہ تو واقعی غیر تھی۔

”ممی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔ وہ لڑکی میری
آنکھوں میں چبھتی ہے۔“ عرشی نے کہا۔

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہ ہر وقت تمہاری
نظروں کے سامنے ہی موجود ہوتی ہے۔“ رعنا کو معلوم
تھا کہ عرشی کن کن طریقوں سے ہنہ کو خود سے دور
رکھا کرتی تھی۔

”وہ میری نظروں کے سامنے نہ بھی ہو تو اس کی
موجودگی کا احساس تو ہر وقت رہتا ہی ہے۔ میرے
بہترین ڈیکور والے گھر میں جس کی لوگ مثالیں دیتے
نہیں سمجھتے تھے اب جگہ جگہ ہنہ کی کلر فمیلیس اس
کے بلاکس اور تانے میں کیا کچھ بھر پڑا رہتا ہے۔ اپنی بار
آیا سے کہا ہے کہ اسے کھلونے نرسری سے باہر نہ
لانے دیا کرے مگر اس عورت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ایک نمبر کی کام چور ہے وہ سارے لوکر اپنے ہی
ہوتے ہیں۔ تنخواہ لینے وقت حاضر اور کام کے وقت
غائب۔“ عرشی سخت سی ہوئی تھی۔

”عرشی بیٹا! چھوٹے بچوں والے گھر میں ایسا ہی ہوتا
ہے۔“ ہمیشہ کی طرح رعنا نے نرمی سے سمجھا کر اس کا
غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”مگر مجھے اپنے گھر میں ایسا کچھ نہیں چاہیے۔“
عرشی چلائی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رعنا کی آسے
پر سکون کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

”ایک تو میں اسے حذیفہ کے سامنے کچھ کہہ بھی
نہیں سکتی۔ اسی نے ہنہ کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔“
”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ عرشی کے برعکس
رعنا بالکل مطمئن تھیں۔

”اگر وہ حذیفہ کی کمزوری بن چکی ہے تو یہی وہ سو
ہے جس کے بل پر تم ساری زندگی حذیفہ کے گھر پر
راج کر سکتی ہو۔ حذیفہ جیسے جذباتی مرد کے لیے اولاد
کتنی بڑی زنجیر ہوتی ہے اس کا نہیں اندازہ ہی نہیں
ہے۔“

رعنا نے عرشی کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئی۔ حذیفہ
کی جذباتیت سے وہ خود بھی واقف تھی۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے پر اس لڑکی کو برداشت کرنا
میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ پلینز کچھ کیجیے کوئی
حل ڈھونڈیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ عرشی نے
کہا۔

”ریلیکس عرشی! اگر نہیں برداشت ہوتا تو اسے
ہاسل بھجوا دو۔ اس میں اتنا ٹینشن لینے کی کیا ضرورت
ہے۔“

رعنا نے اپنا آپ تنقیدی نظروں سے آئینے میں
دیکھتے ہوئے ایک بار پھر لا پرواہی سے کہا۔

وہ اس معاملے میں زیادہ متفکر نہیں تھیں۔ انہیں
معلوم تھا کہ عرشی کو رانی کا پہاڑ بنانے کی عادت ہے۔
ان کے حساب سے ہنہ کا مسئلہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تھا ہی
نہیں کہ اس طرح پریشان ہو جائے۔

”چھاسنو! میں ایک فیشن شو میں جا رہی ہوں۔ چلوگی میرے ساتھ؟ موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا تمہارا۔“

رعنا نے آخر کار آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے عرش سے پوچھا۔

”نہیں! آپ جانیے۔ میں اب گھر جاؤں گی۔“ عرش نے جواب دیا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ عرش کوئی فنکشن چھوڑ دے۔ وہ فیشن کی دلدادہ تھی اور جدید فیشن کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ رکھنا اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ پر فی الحال وہ کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اس کے ذہن میں رعنا کا ایک ہی فقرہ گھوم رہا تھا۔ ”ہنہ کو ہاسٹل بھجوا دو۔“



عرش کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ حذیفہ اس تجویز پر بالکل راضی نہیں ہوگا۔ اور یہی ہوا۔ وہ بات سنتے ہی بری طرح بھڑک گیا۔ ”تمہارا دل داغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”اس میں داغ خراب ہونے والی کیا بات ہے۔“ عرش برامان کر بولی۔

”میں ہنہ کی بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔ دیکھو نا۔ وہ دن بدن کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی جا رہی ہے۔ بورڈنگ میں جا کر وہ تھوڑا ڈسپلن سیکھ لے گی۔“ عرش نے کہا۔

”تم بھی تو ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ تو کیا تمہیں بھی ڈسپلن کے لیے بورڈنگ بھجوا دینا چاہیے؟“ حذیفہ نے ترخ کر کہا۔ عرش جزبہ ہو گئی۔ پھر جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ یہ معاملہ گرمی کھا کر حل ہونے والا نہیں تھا۔

”دیکھو! یہ دنیا کی بھلائی کا معاملہ ہے۔“ عرش نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کی۔ ”مجھے تو ایک چھوٹی سی بی بی کو اپنے گھر اور گھر والوں سے دور کر دینے میں اس کا کوئی بھلا نظر نہیں آتا۔ ہنہ

تھوڑی سی شرارتی ضرور ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے سزا کے طور پر بورڈنگ اسکول بھجوا دیا جائے۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بورڈنگ اسکول نہ ہوا جیل ہو گئی جہاں سزا میں دی جاتی ہیں۔“

”میرے حساب سے وہ جگہ جیل کے ہی برابر ہے جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے ماں باپ سے دور کر کے رکھا جاتا ہے۔“

حذیفہ قطعی لہجے میں بولا تو عرش زچ ہو گئی۔ اتنا اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا کہ حذیفہ آرام سے کبھی نہیں مانے گا۔ عرش نے اپنے اندر ابھرتی جھنجھلاہٹ کو چھپا کر حذیفہ کو نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”دنیا میں کتنے ہی بچے ہاسٹل میں جا کر رہتے ہیں۔ کچھ تو اچھا ہو گا نا ان اسکولوں میں جو لوگ اپنے بچوں کو وہاں بھجواتے ہیں۔“ عرش نے کہا۔

”بھجواتے ہوں گے۔ پر ہنہ نہیں جائے گی۔“

”بس۔“ اس نے عرش کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ ”میں نے کہہ دیا کہ ہنہ نہیں جائے گی تو نہیں جائے گی۔ اب ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔“

حذیفہ یہ کہہ کر چلتا ہوا روہیوں کھڑی دانت پیستی رہ گئی۔

حذیفہ اکثر عرش کی الٹی سیدھی فرمائشوں کو بلاچوں چراں مان کر اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا تھا کہ وہ اس سے کچھ بھی منوا سکتی ہے پر اس قسم کے موقعوں پر عرش کو بڑی شدت سے احساس ہوتا تھا کہ حذیفہ صرف ان باتوں کو مانتا ہے جو اس کی نظر میں — غیر اہم ہوتی ہیں۔ اتنی غیر اہم کہ وہ

ان سے انکار کر کے عرش کے ساتھ بحث کرنے کی زحمت کرنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا اور جو باتیں اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں ان پر عرش سر توڑ کوشش کر لینے کے باوجود اسے ٹس سے مس نہیں کر سکتی تھی۔

پر عرش بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بچپن سے اپنی منوانے کی جو عادت پڑ گئی تھی وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ دو چار دن بعد اس نے پھر بات چھوڑ دی۔ حذیفہ ناشتے کی ٹیبل پر تھا۔

”ہنہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ایسا کون سا بورڈنگ اسکول ہے جو اتنے چھوٹے بچے کو ایڈمیشن دیتا ہے۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔

جواب میں عرش نے اسکول کے فارم سامنے ٹیبل پر رکھ دیے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

ہنہ کے داخلے کے لیے معقول اسکول تلاش کرنے کے لیے عرش کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ وہی جانتی تھی اور اب اس کی ساری تفصیلات سے کیس ہو کر حذیفہ کے سامنے یہ مقدمہ پھر سے لے کر آئی تھی۔

”ہنہ اب اتنی چھوٹی نہیں رہی۔ پورے چھ سال کی ہو چکی ہے۔ وہ یہی عمر ہوتی ہے بچے کی بنیاد کو مضبوط کرنے کی۔“ عرش نے رمان سے کہا۔

”تمہیں اچانک اس کی بنیاد میں کیا کمی نظر آ گئی؟“ شہر کے بہترین اسکول میں پڑھ رہی ہے وہ۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس کی بنیاد کمزور ہے تو تم اسے مضبوط بنانے کے لیے جتنے ٹیوٹریاں کرنا چاہتی ہو کر لو۔ اس میں اگر ڈسپلن کی کمی محسوس ہوتی ہے تو کوئی بھی گورنس، ٹیچی یا بیکس لا کر اس کے سر پر بٹھالو مگر جو کچھ کرنا ہے ہمیں کرو۔ ہنہ ہاسٹل ہرگز نہیں جائے گی۔“

حذیفہ اپنا فیصلہ بنا کر ابلا ہوا انڈا کھانے لگا۔ عرش کی جان جل گئی۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے آخر۔ میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیسے نہیں جاتی۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

”میں اپنی بیٹی کو خود سے الگ نہیں کر سکتا۔“ حذیفہ نے پیچ میز پر سر دیا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

عرش کے اندر باہر لاوا دیک گیا۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر اس کے دل داغ کو جھلسانے لگے۔

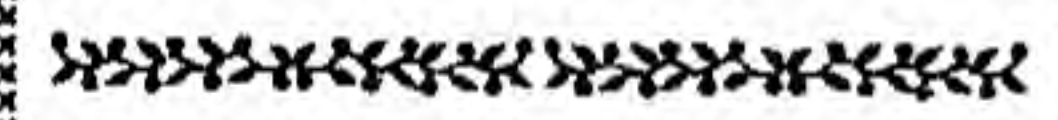
”وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“ وہ غصہ سے بے قابو

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

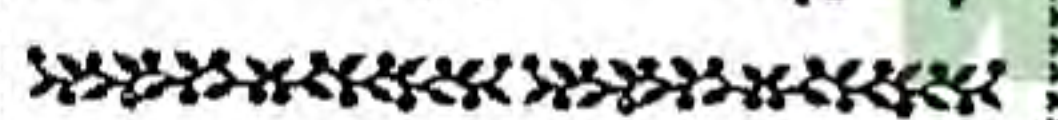
انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



450/-	آوارہ گرد کی ڈائری	سفر نامہ
450/-	دنیا گول ہے	سفر نامہ
450/-	ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفر نامہ
275/-	چلتے ہو تو ہمیں کو پیلیے	سفر نامہ
225/-	مگرمیری پھراسافر	سفر نامہ
225/-	خوار گندم	طہر و مزاح
225/-	اردو کی آخری کتاب	طہر و مزاح
300/-	اس ہستی کے کوپے میں	مجموعہ کلام
225/-	چاند مگر	مجموعہ کلام
225/-	دل دشتی	مجموعہ کلام
200/-	اندھ کتاؤں	ایڈ گرائیں پو! ابن انشاء
120/-	لاکھوں کا شہر	ادبیری! ابن انشاء
400/-	باتیں انشاء جی کی	طہر و مزاح
400/-	آپ سے کیا پردہ	طہر و مزاح



مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

ہو کر چلائی۔

عرشی کی سب سے بڑی خامی یہی تھی۔ اسے خود پر اپنے جذبات پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔

ہاتھ سے نکلے وقت اور زبان سے ادا ہوئے الفاظ دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی واپس موڑا جاسکتا تو عرشی یہ کر سکتی، پر اس وقت اس کے پاس رکتی سانوں کے ساتھ وہاں کھڑے ہو کر حذیفہ کے رد عمل کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

”میں جانتا ہوں۔“ حذیفہ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انتہائی ساٹ لہجے میں کہا۔ شاگ کے مارے عرشی اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں کا منہ بند کر دینے سے اتنی بڑی بات چھپی رہ سکتی ہے؟“ حذیفہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”تم کب سے جانتے ہو۔“ عرشی نے سوکھے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔

”جب سے تم جانتی ہو۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ ”جس کلینک میں تمہاری ڈیلیوری ہوئی وہاں ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ جو اپنے ایک کیس کے سلسلے میں اس رات وہیں موجود تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ مجھے فون پر بتا چکا تھا کہ بچے کو بچایا نہیں جاسکا اور ماں۔“

”میں اس لیے چپ رہا کہ چلو تمہارے اس جھوٹ سے اگر تمہاری سولی گود بھرنے کے ساتھ کسی لاوارث کو گھریل رہا ہے تو کیا برا ہے مگر عرشی! تم نے اس منہ کی مدح کو اپنی جھولی میں لیا ضرور پر بھی اسے اپنا نہ سکیں۔ جب تم نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اسے کم از کم سنبھالتیں تو سہی۔ اگر اس بچی کو چھت کے ساتھ

تھوڑا سا پیار بھی دے دیتیں تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ خاص طور پر جب تمہیں معلوم ہے کہ تم خود کبھی ماں نہیں بن سکو گی، لیکن مجھے تم سے یا تقدیر سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے ہنہ ہی کافی ہے۔“ وہ میز سے اٹھ کر عرشی کے سامنے آگھڑا ہوا۔

عرشی کا قند ہل کے بغیر حذیفہ کے کندھے تک پہنچ

رہا تھا اور آج اس کی نظریں حذیفہ کی شرٹ کے کنارے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو عرشی!“ حذیفہ نے وارننگ دینے والے انداز میں سامنے کھڑی عرشی سے کہا۔ ”آج کے بعد یہ کہنے کی غلطی دوبارہ بھی مت کرنا کہ ہنہ میری بیٹی نہیں ہے۔“

عرشی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنا پرس سامنے والی میز پر پھینکا اور اپنے پیر سفید اور نیلے ٹکوں سے مزین ہیل کی جوتی سے باہر نکالے۔ یہ سینڈل ان ہیپلز میں سے بھی مجنہیں فیشن کی خاطر بس تھوڑی دیر کے لیے پہنا جاتا ہے جبکہ عرشی انہیں پہن کر کافی دیر بازار میں گھومتی رہی تھی اور اب اپنے پیروں پر پڑنے والے لال نشانوں کو دیکھ رہی تھی جو پتلی پتلی پیپوں کی وجہ سے وہاں عارضی طور پر نمودار ہو چکے تھے۔ جھکی ہوئی عرشی کے خوبصورتی سے تراشے ہل آگے ہو کر چہرے کے ارد گرد سے گزرتے ہوئے اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔

عرشی کے بالوں کا قدرتی رنگ گہرا براؤن تھا، جسے عموماً ”سیاہ ہی سمجھا جاتا ہے اور وہ بھی کچھ ایسا برا رنگ نہیں تھا، پر عرشی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت جلد یکسانیت سے اکتا جاتی تھی۔ اب چاہے وہ یکسانیت زندگی میں ہو یا پھر فیشن میں۔ اچانک عقب سے آتی چھتا کے کی آواز نے اسے ہڑپڑا کر سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔

باہر ہال میں یقیناً کچھ ٹوٹا تھا۔

ہال کے دروازے سے ہی عرشی کو ایک نظریں ہی سب دکھائی دے گیا۔

ایک کونے میں زمین پر بکھرے کرشل کے گلدان کے ٹکڑے سمیٹی رشیدہ اور اس کے پاس ریڈ کا بڑا سا بال ہاتھ میں لیے مجرم بنی کھڑی ہنہ۔

عرشی کا خون کھول گیا۔ وہ یہ گلدان اپنے یورپ کے

کے دوران اٹلی سے خرید کر لائی تھی۔ وہ کہاں آیا تھا اور کتنے کا آیا تھا یہ الگ بات تھی اسے طیش لانے کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے ٹوٹنے میں منہ کی ہنہ کا ہاتھ ہے۔

”یہ تمہارے کھیلنے کی جگہ ہے کیا؟“ عرشی نے آگے بڑھ کر ہنہ کے منہ پر ایک زناٹے وار پھنٹر سید لیا۔

”ہزار بار کہا ہے کہ نرسوں کے اندر رہ کر کھیلا کرو۔“ عرشی نے چلا کر کہا۔

ہاتھ نیچا نیچا کر چٹکھاڑتی ہوئی عرشی اس وقت اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود انتہائی بھیاں لگ رہی تھی۔

ہنہ چپ چاپ بال ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اتنی سی عمر میں ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ جہاں وہ حذیفہ کی آنکھ کا تارا ہے وہیں عرشی کا موڈ اس پر نظر پڑتے ہی خراب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ خود کو اپنے بیڈ روم سے باہر نرسوں تک محدود رکھنے کی عادی بنا چکی تھی۔ گھر کے اس کمرے کو خاص حذیفہ کی ہدایت کے مطابق اور اس کی نگرانی میں تب نرسوں میں تبدیل کیا گیا تھا۔ جب ہنہ نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا شروع ہی کیا تھا۔ بے بی پنک کمر کی دیواروں والی اس نرسوں میں اسٹنڈ لوٹنے اور گڑبوں سے لے کر بے شمار چھوٹے بڑے گیمز ہنہ کے کھیلنے کے لیے موجود تھے۔

مگر یہ کمرہ چاہے کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو۔ آخر تھا تو چار دیواری اور چھت والا ایک کمرہ ہی ہنہ جیسی ذہین اور چلبلی بچی کے لیے سارا دن اس کمرے میں بند ہو کر گزارا کرنا بہت مشکل تھا، اسی لیے اس نے رشیدہ سے باہر لان میں جا کر کھیلنے کی فرمائش کی تھی۔

یہ سمجھ کر کہ عرشی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے رشیدہ نے بھی اس کی بات مان لی۔ ہنہ نے باہر جانے کے لیے ہال میں سے گزرتے وقت ہاتھ میں پکڑی بال کو ہوا میں اچھال کر کھینچ کرنا چاہا تو بال واپس ہاتھ میں آنے کے بجائے سائیڈ والی میز پر رکھے گل دان سے ٹکرا کر اسے زمین بوس کر گئی۔

”ممی! سوری۔ میں نے نہیں توڑا۔ غلطی سے ٹوٹ گیا ہے۔“ ہنہ نے عرشی سے کہا۔

”غلطی کی بچی! ہر روز کوئی نیا نقصان کر کے کہتی ہے کہ غلطی سے ہو گیا ہے۔“ عرشی نے ہنہ کو بازو سے دبوچ کر جھجھوڑتے ہوئے کہا۔

”ممی! میں روز نقصان نہیں کرتی اور آپ سے بھی تو پرسوں پلیٹ ٹوٹی تھی۔“ ہنہ نے بھی پلیٹ گر جواب دیا۔ عرشی آگ بگولہ ہو گئی۔ عرشی کی ہنہ سے جڑنے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے اتنے سخت رویے کے باوجود ہنہ اس کے رعب میں نہیں تھی۔ وہ عرشی کی گرم مزاجی کی وجہ سے اس کے سامنے آنے سے گریز ضرور کرتی تھی مگر اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اس کی پروانہ کرنے والی فطرت و عادات عرشی جیسی خود پسند اور رعوت بھری عورت کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔

”بکو اس کرتی ہے، بجائے معافی مانگنے کے بکو اس کرتی ہے میرے سامنے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح اسے پیٹ ڈالا۔

”پاپا! پاپا!“ ہنہ تکلیف سے بلبلاتی۔

معصیت میں اسے ایک ہی نام یاد آتا تھا۔

”چچو اور زور سے چلاؤ۔ کوئی نہیں آئے گا تمہیں بچانے۔“

عرشی نے ہنہ کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکے دیے تو ہنہ کی فلک شکاف چٹخیں سارے گھر میں گونجنے لگیں۔

”چپ کر منخوس!“ عرشی نے بے درے کئی تھپڑ اسے لگائے۔ چھ سال کی معصوم بچی عرشی کی جنونی گرفت میں بے بس تھی۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہو چھپا کر خود کو عرشی کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مغالطات کا ایک طوفان تھا جو عرشی کے منہ سے جاری تھا جس کو سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک مہذب طبقے کی پڑھی لکھی عورت ہے۔

ایک کونے میں کرسیاں سیٹنا بھول کر ہکا بکا بیٹھی

رشیدہ کو بھی عرش کا یہ روپ دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
چھوڑیں جی! بے بی سے غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں اسے۔

رشیدہ نے آگے بڑھ کر ہنہ کو عرش کی گرفت سے آزاد کروانے کی کمزوری کو شش کی۔
”فح ہو جاؤ یہاں سے۔“ غصے کی حالت میں عرش رعتا کے قابو میں نہیں آیا کرتی تھی۔ رشیدہ تو پھر معمولی نوکرانی تھی۔ رشیدہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی کیونکہ وہ غریب تھی اور اپنی لگی بندھی روڈی روٹی پر لات مارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔
اب ہنہ تھی اور عرش کا قبر۔ چھڑانے والا کوئی نہ تھا۔ کم از کم عرش کا یہی خیال تھا اور اس وقت تک رہا جب تک ہنہ کے رخسار کی طرف بڑھتے ہاتھ کو اچانک کسی نے کلائی سے جکڑ نہ لیا۔
”بس کرو یہ تماشا۔“

عرش کو اپنے برابر حذیفہ کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔ عرش کی طرح وہ بھی خلاف معمول جلدی گھرا گیا تھا اور عرش کی طرح ہی ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے کے منظر نے اس کا خون کھولا دیا تھا۔
”کیوں بس کروں۔ دیکھا نہیں اس نے کیا کیا ہے۔“ عرش نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی حذیفہ کی گرفت سے چھڑائی اور اس کی ٹانگوں کے پیچھے چھپی ہنہ کو ایک بار پھر پکڑنا چاہا۔

”بس!“ حذیفہ کی گرجتی آواز نے عرش کو اپنی جگہ پر ساکت کر دیا۔ رشیدہ بھی معاملہ بگڑا دیکھ کر کب کی وہاں سے روف چکر ہو چکی تھی۔

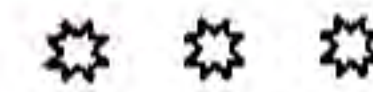
”تم ایک جنگلی اور وحشی عورت ہو۔ تم سے کسی اچھائی کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔“ حذیفہ میں کمال کی قوت برداشت تھی۔ اتنے سالوں میں کئی ایسے مواقع آئے جہاں کوئی بھی انسان خود پر کنٹرول کھو سکتا تھا مگر حذیفہ نے ہمیشہ خود پر قابو رکھا مگر اس وقت وہ جس طرح طیش میں آیا تھا اسے دیکھ کر عرش کو لگا کہ اگر اس نے اپنا ہاتھ فوراً نہ روک لیا تو آج حذیفہ کا

ہاتھ بھی اس پر ضرور اٹھ جائے گا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار اسے حذیفہ کے غصے سے خوف محسوس ہوا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

کتنی دیر حذیفہ ہنہ کے سسکتے وجود کو سینے سے لگا کر لان میں پھرتا رہا جیسے اپنی محبت سے اس نفرت کے اثر کو زائل کرنا چاہ رہا ہو۔ جو تھوڑی دیر پہل پھٹوٹوں کی صورت میں ہنہ کے جسم پر وار ہوئی تھی۔ حذیفہ کو معلوم تھا کہ جو کچھ ہوا اس کا ٹوٹے ہوئے ڈیکوریشن پیس سے کوئی تعلق نہیں۔ عرش محض اپنی فیر سٹریشن ہنہ پر نکال رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر طوفان کھڑا کر دینے والی۔ حذیفہ پر تو اس کا بس نہیں چلتا تھا البتہ ہنہ کو دق کرنے کا کوئی بہانہ وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اور یہ سب حذیفہ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ہنہ حذیفہ کی گود میں ہی روتے روتے سو گئی تھی۔ حذیفہ اسے لے کر اندر چلا آیا۔

عرش کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ اس کے اس جنگلی پن کے مظاہرے کے بعد حذیفہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
ہنہ کو اس کے بستر پر احتیاط سے لٹا کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سوئی ہوئی ہنہ کو دیکھنے لگا۔ رونے کی وجہ سے اس کی پلکیں بھگ کر ایک دوسرے سے چکی ہوئی تھیں۔ گالوں پر ابھی تک عرش کی بے رحم انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔

حذیفہ کتنی دیر ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا پھر حرکت کر سوئی ہوئی ہنہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر باہر نکل گیا۔



حذیفہ ساری رات اپنے کمرے میں نہیں آیا۔ عرش جب صبح اٹھی تو بستر خالی پڑا تھا اور چادر بے شکن تھی۔ عرش دونوں ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سمیٹتی بستر سے اترنے لگی تو اسے سائیڈ ٹیبل پر پڑا کاغذ نظر آیا۔

عرش نے نیند سے بھری آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو یہ بوڑنگ اسکول کا ایڈمیشن فارم تھا جو پچھلے کئی دن سے کبھی یہاں تو کبھی وہاں بڑا رہا تھا۔ جس چیز نے عرش کی آنکھیں پوری طرح سے کھول دیں وہ فارم کا ٹیٹلا اور آخری حصہ تھا جو کل تک خالی تھا۔ آج وہاں حذیفہ کے دستخط ہو چکے تھے۔ عرش کو نہیں معلوم کہ حذیفہ نے کیا سوچ کر فارم پر دستخط کیے تھے۔

رات کو ہنہ کو اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ کتنی دیر باہر لاؤنج میں ٹھکتا رہا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ عرش اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے بے رحمی کی کسی بھی حد کو پار کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔ جب سے ہنہ کی اصلیت کو حذیفہ سے چھپا کر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی تب سے عرش کا رہا سہا لحاظ بھی جاتا رہا۔ کبھی کبھی حذیفہ کو لگتا تھا کہ یہ وہ عرش ہے ہی نہیں جسے وہ شادی سے پہلے جانتا تھا۔

یا پھر شاید وہ اسے کبھی جانتا ہی نہیں تھا۔ حذیفہ نے باہر دیکھتے ہوئے تھک کر سوچا جہاں رات کی تاریکی صبح کی نیلگوں سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ باہر لان میں مالی کے لگائے پودوں پر نئی کوئٹلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ دنوں میں ان تھیں اور نازک کلیوں نے خوش رنگ اور خوش نما پھولوں کا روپ دھار لیتا تھا مگر کوئٹل سے پھولوں تک کے سفر میں انہیں ماہر ہاتھوں کی محنت کی ضرورت تھی جو محبت اور توجہ کے ساتھ ان کی تیاری کرتے۔

بچے بھی ان تھیں کلیوں کے جیسے نرم و نازک ہوتے ہیں جنہیں کھانے کے لیے اتنی ہی توجہ محنت اور محبت کی ضرورت پڑتی ہے لیکن جس گھر میں محبت کی جگہ نفرت بننے لگے وہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہتا۔

حذیفہ کو آج بھی وہ لڑکی نہیں بھولی تھی جس کی شخصیت اس کے ماں کے بد صورت رویے نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ جس نے اس کی خود اعتمادی چھین لی تھی۔ رشتوں پر سے اعتبار ختم کر دیا تھا۔

ہنہ کا ہاسٹل چلے جاتا ہی اس کے حق میں ہسرت تھا۔ سورج کی آفت پر پھیلتی لالی اس کے ظلموں ہونے کا اعلان کر رہی تھی جس وقت حذیفہ نے فارم پر دستخط کر کے سوئی ہوئی عرش کے پاس رکھا۔

اس کے بعد عرش نے ہفتوں کا کام دنوں میں پنپایا۔ زندگی میں پہلی بار عرش نے ہنہ کے کسی کام میں جی جان سے حصہ لیا اور وہ تھا ہنہ کے جانے کی تیاری۔ وہ جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے جاتے وقت اتنا داویلا مچایا کہ عرش کے کان پھٹنے کو آگئے۔ حذیفہ وہاں نہیں تھا۔ وہ صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ وہ ہنہ کو جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ وہ اندر بیٹھ کر بھی چلاتی رہی۔ حذیفہ کو آواز سن دیتی رہی۔

گاڑی گئی تو اس کے ساتھ ہنہ کا گھڑا کیا ہنگامہ بھی رخصت ہوا۔ عرش نے سکون کا سانس لیا۔ اپنے گھر پر اب اس کا مکمل راج تھا۔ اس راج کا ایک ایک پل وہ پوری طرح سے انجوائے کرنے کے موڈ میں تھی۔

حذیفہ سارا دن گھر سے غائب رہا۔ رات کو آیا تو آتش دان کے سامنے رکھی اپنی مخصوص کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

ابھی سردیوں کا موسم نہیں تھا اس لیے آتش دان ٹھنڈا پڑا تھا۔ پھر بھی حذیفہ اس میں رکھی سوکھی لکڑیوں کے نیچے بٹھسی ہوئی پرانی راکھ پر نظرس جمائے روشنی اور حرارت کا پتا دیتی کسی چنگاری کے اچانک بھڑک اٹھنے کا جیسے انتظار کر رہا تھا۔ عرش اپنا کالی سے بھرا گ لے کر اس کے سامنے دالی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

”کتنا عرصہ ہو گیا تھا ہم دونوں کو اس طرح سکون سے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔ اچھا لگ رہا ہے نا؟“ عرش نے مسکرا کر حذیفہ سے تائید چاہی۔

عرش واقعی اتنی بے حس تھی یا پھر انتہائی بے وقوف۔ جو اس وقت حذیفہ سے ایسی بات کر رہی تھی۔ جواب میں حذیفہ نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا

کہ عرشی کے ہاتھ سے کافی چھلک کر اس کے کپڑوں کو داغ دار کر گئی۔

اگر عرشی کا خیال تھا کہ ہنہ کے جانے کے بعد اسے حذیفہ کی پوری توجہ حاصل ہو جائے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ حذیفہ کے ساتھ جو تھوڑا بہت وقت اسے پہلے مل جایا کرتا تھا وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب وہ صبح گھر سے لکھتا تو رات گئے ہی گھر لوٹتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے وہ گھر پر موجود بھی ہوتا تو کوئی نہ کوئی کتاب لے کر آتش دان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا یا پھر دی پر کوئی اسپورٹس کرنٹ افیر یا پھر نیوز کا کوئی چینل لگا کر دکھاتا۔ اس نے بہت سالوں کے بعد دوبارہ ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک زمانے میں کلب لیول پر ٹورنامنٹس میں بھی حصہ لیتا اور اکثر جیت بھی جاتا تھا۔ تب عرشی بہت شوق سے اس کے پیچ دیکھنے جایا کرتی تھی اور تماشائیوں کی صف میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح اس کے لیے تالیاں بجا جاتی تھی۔ ”تمہیں کم از کم نیشنل لیول پر ضرور کھیلنا چاہیے۔ بہت اچھا کھیلتے ہو؟“ عرشی اسے افسانے سے کہتا۔

”اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔“ وہ لاپرواہی سے کہتا۔ ”تمہیں محنت کی کیا ضرورت ہے۔ تم میں نیچل ٹیلنٹ ہے۔“ عرشی اس سے کہتی۔ ”اور اگر ضرورت ہے تو کرونا تھوڑی سی محنت۔ تمہیں کیا اچھا نہیں لگے گا۔ اگر اس کھیل میں تمہارا نام ہو جائے گا۔“ ”میں نام کے لیے تو نہیں کھیلتا۔ میں اس لیے کھیلتا ہوں کیونکہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ اگر میں صرف جیتنے کے لیے کھیلوں تو شاید اسے اتنا انجوائے نہ کر سکوں۔“ ”یہ کیا بات ہوئی۔“ عرشی منہ بنا کر کہتی۔ ”جیتنے کا ہی تو مزا ہے۔ دنیا میں جیت سے زیادہ کچھ اہم نہیں ہوتا۔“ عرشی سر اٹھا کر عونت سے کہتی۔

”نہیں عرشی! جیت سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے اچھا فینو اور جان دار کھیل پیش کرنا۔ جس کھیل میں

یہ نہ ہو وہ کھیل نہیں جوا ہوتا ہے اور اس کی ہار جیت بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔“ حذیفہ عرشی کو سمجھایا کرتا تھا۔

عرصہ ہوا عرشی نے حذیفہ کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا اور حذیفہ اب انجوائے منٹ کے لیے بھی نہیں کھیلتا تھا۔ اب نہ جانے کون سی ذہنی تھکاوٹ تھی اسے جس سے جان چھڑانے کے لیے وہ خود کو جسمانی طور پر چور چور کرنے لگ پڑا تھا۔ عرشی کو حذیفہ کی ان خود ساختہ مصوفیات اور لاف تعلیق رویے سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ وہ خود گھر میں کم لگتی تھی۔ اس نے رعنا کے ساتھ ان کی سرگرمیوں میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی جو ان ہی کی طرح اپر کلاس خواتین نے مشغلے کے طور پر اپنائی ہوئی تھیں۔ بعض اوقات عرشی کو گھر لوٹنے میں حذیفہ سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی تھی۔ عرشی کو اس ساری روٹین میں اگر کوئی بات ناقابل برداشت لگتی تو وہ یہ تھی کہ حذیفہ جو بنا کسی جذبے یا احساس کے ایک ردیوٹ کی طرح اپنے شب و روز بسر کر رہا ہوتا تھا ہنہ کے چھٹیوں میں گھر آنے پر یکدم پھر سے زندہ ہو جاتا۔ عرشی سے اس کا چھٹیوں میں گھر آنا بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ایک معصوم لڑکی سے نہ جانے کیا ہیر۔۔۔ تھا کہ وہ اسے کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ محبت کے کسی بھی جذبے یا احساس سے عاری ممتا کے جذبے سے بھی محروم تھی۔ حذیفہ پر مکمل کنٹرول کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

”میں بخدا کا واسطہ ہے اس عذاب سے میری جان چھڑائیے۔“ عرشی ایک بار پھر۔۔۔ رعنا کے سر پر سوار ہو گئی۔

”کس عذاب کی بات کر رہی ہو تم؟“ رعنا جو رنگ برنگی دوائیاں کھیل رہی تھیں انہیں ننگے کی تیاری کر رہی تھیں اس کی بات پر حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔ ”ہنہ کی بات کر رہی ہوں میں۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کون سے عذاب میری زندگی میں نظر آ رہے ہیں۔“ عرشی نے تنگ کر کہا۔

”عرشی پلیز! پھر سے یہ قصہ مت شروع کرنا۔“ رعنا نے بے زاری سے کہہ کر گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کے ساتھ اپنے اندر اتاریں۔

پچھلے کئی دنوں سے ان کی طبیعت بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ ہمت جیسے جواب دہتی جا رہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے ہمیشہ جست اور ہٹاؤ سے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ ڈاکٹر کوئی خاص بیماری تشخیص نہیں کر سکے پھر بھی آرام کا مشورہ دیا۔

”آپ نے اپنی لائف کو بیسیوں کاموں میں الجھا رکھا ہے میڈم! یہ اس کا نتیجہ ہے۔“ یہ ان کے فیملی فزیشن کی رائے تھی۔

”لیکن میں تو ہمیشہ سے اسی طرح کام کرنے کی عادی ہوں۔“ رعنا نے کہا تھا۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ کچھ عمر کے بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک وقت کے بعد جسم اور دماغ اتنی لفٹ روٹین برداشت کرنے کے عادی نہیں رہتے۔ آپ پلیز خود کو تھوڑا آرام دیں۔ ریلیکس کریں۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا۔

مگر عرشی کے ہوتے ہوئے رعنا کو سکون بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ ابھی بھی عرشی کے گہرے موڈ کو دیکھ کر اور اس کے نتیجے میں کم از کم آدھے گھنٹے تک جاری رہنے والی متوقع چیخ و جھجکاؤ کو سوچ کر ہی رعنا کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

”میں اس قصے کو اس وقت تک چھیڑنا بند نہیں کروں گی جب تک آپ اپنی اس پیدا کی ہوئی مصیبت کا کوئی پکا حل تلاش کر کے نہیں دیتیں۔“ عرشی نے کہا۔

”میری پیدا کی ہوئی مصیبت؟ میں نے کیا کیا ہے؟“ رعنا نے اچھبے سے کہا۔

”سارا کیا دھرا آپ ہی کا تو ہے۔ آپ ہی نے یہ ہنہ نام کی بلا لا کر میرے گلے میں ڈالی تھی۔“ عرشی براہی سے بولی۔ ”اسے میری زندگی میں آپ لے کر آئی تھیں اب اسے میری زندگی سے خارج کرنے کی

ذمہ داری بھی آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔“ ”بھجوا تو دیا اسے ہاسٹل۔ ہو تو گئی وہ تمہاری زندگی سے خارج۔ اب اور کیا چاہتی ہو تم؟“ رعنا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ سارا ڈرامہ ان کی توقع سے زیادہ ان کے اعصاب سے طاقت نہ چڑ رہا تھا۔

”خاک خارج ہوئی ہے وہ۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد پھر گھر میں موجود ہوتی ہے۔“

”چند دنوں کے لیے ہی تو آتی ہے وہ۔ آنے دو۔ کون سا اب وہ مستقل تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔“ رعنا نے سمجھایا۔

”آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ یہی چند دن میری زندگی کے بدترین دن ہوتے ہیں۔“

عرشی اپنی نیل پالش سے تچی مخرومی انگلیوں کو بے دردی سے موڑ رہی تھی جو اس کے اندرونی اضطراب کی نشانی تھی۔

”حذیفہ کے پاس میرے ساتھ بتانے کے لیے ایک بل بھی نہیں ہوتا اس کے آنے پر اپنی تمام مصوفیات ترک کر کے مکمل طور پر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ آگ لگتی ہے میرے دل میں یہ دیکھ کر۔“ عرشی بھڑکی ہوئی شیرینی کی طرح کمرے کے وسط میں چکر کاٹ رہی تھی۔

رعنا بستر پر اپنا سر تھامے بیٹھی تھیں۔

”بیٹا! حالات سے سمجھو تا کرنا سیکھو۔ ہر چیز مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن مجھے ہر چیز اپنی مرضی کے مطابق چاہیے اور ہنہ کا وجود اسے بھی پر فیکٹ نہیں ہونے دے گا۔ پلیز می کمیونٹی تو کیجئے۔“

”جو کچھ میرے بس میں تھا میں کر چکی ہوں۔ اب اور کیا کروں۔“ رعنا بے بسی سے کہنے لگیں۔

”ٹھیک ہے۔ کچھ مت کیجئے آپ۔“ عرشی اور بھی طیش میں آ گئی۔

”پتا نہیں کیوں میں اپنی پرابلم لے کر آپ کے پاس آجاتی ہوں۔ آپ نے بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔“ عرشی نے سارے لحاظ طاق پر رکھتے ہوئے

انتہائی بد تمیزی کے ساتھ کہا۔

رعنا کا چہرہ سن ہو گیا۔

”کیا کہا تم نے؟ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا؟“ رعنا ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ کر عرش کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

”میں نے ہمیشہ جو کچھ بھی کیا صرف اور صرف تمہارے لیے کیا۔ مجھے حذیفہ چاہیے میں حذیفہ کے بغیر مر جاؤں گی۔ کون تڑپ تڑپ کر کہا کرتا تھا یہ۔“ رعنا نے کڑے تیوروں کے ساتھ عرش کو اس کے برسوں پرانی کیفیت یاد دلانی۔

”اس وقت میں نے۔۔۔ ہاں عرش! میں نے حذیفہ کو لا کر تمہارے ہاتھ میں تھمایا۔ صرف میری وجہ سے وہ آج اس لڑکی کے ساتھ ہونے کے بجائے تمہارے ساتھ ہے۔ صرف میری وجہ سے۔“

رعنا نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ جتنا تاؤ انہیں آج عرش کی بات سن کر آیا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ رعنا نے عرش کے چہرے کے آگے اپنا ہاتھ سوالیہ انداز میں لہرایا۔

”یہ سوچو تم نے اتنے عرصے میں کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پچھلے سات سال سے وہ تمہارا شوہر ہے۔ سات سال تم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے۔ تم سے تو آج تک یہ بھی نہیں ہو سکا۔“

”ممی! عرش تھلا کر رہ گئی۔

”چپ کرو اور خبردار! جو اب میرے پاس کوئی شکایت لے کر آئیں قصور سراسر تمہارا اپنا ہی ہے۔“ رعنا نے عرش کو آئینہ دکھایا۔

”ممی! میں یہ سب سننے کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔“ عرش غصے سے کانپ رہی تھی۔ سچ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

”نہیں سننا چاہتیں تو چلی جاؤ یہاں سے۔ بس بہت کرلی تمہاری بددعا اور صلہ بھی دیکھ لیا۔ اب میری توجہ جو میں تمہارے کسی معاملے میں دخل اندازی کروں۔ جاؤ عرش! اپنے مسئلوں کا حل خود تلاش کرنے کی

عادت ڈالو۔“ رعنا نے رکھائی سے کہا۔ کچھ دیر عرش بے یقینی کی کیفیت میں رعنا کی شکل دیکھتی رہی جو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس پٹنگ کے اوپر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھ سے اتنی ہی تنگ آچکی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں اور آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔“ عرش کا خیال تھا کہ اس جذباتی بلیک میلنگ کے نتیجے میں رعنا اسے روکیں گی پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رعنا اتنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھی رہیں۔

عرش جھنجھلا کر مڑی اور پیر پختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ واپسی پر عرش کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ نہایت ریش انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔

”میری ہی مت ماری گئی تھی جو حذیفہ جیسے پتھر کے ساتھ سر پھوڑا۔“ عرش نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے سوچا۔

اسے یاد آیا کہ یونیورسٹی کے زمانے میں کتنے لڑکے اس کی ایک نظر کرم کے انتظار میں اس کے ارد گرد منڈلایا کرتے تھے۔ عرش نے ان میں سے کسی کو بھی توجہ کے قابل نہ سمجھا کیونکہ تب اس کے حواسوں پر حذیفہ سوار تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کر لیا ہوتا تو زندگی اتنی پیچیدگیوں میں نہ الجھی ہوتی۔

لیکن وہ ان میں سے کس کا انتخاب کیسے کر سکتی تھی؟ وہ کتنے ہی بہترین کیوں نہ ہوں ان میں سے کوئی بھی حذیفہ نہیں تھا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص حذیفہ نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ منفرد تھا۔ سب سے الگ۔ اور صرف عرش کا تھا۔

کیا فرق پڑتا تھا کہ حذیفہ عرش کو ہر بات میں اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اپنی تمام سچ ادائیگوں کے باوجود اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا تھا۔

اسیئرنگ پر عرش کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایکسیلیٹر پر سہاواں کا زور بھی خود بخود کم ہو گیا۔ گھر

میں داخل ہونے تک گاڑی کی رفتار اور عرش کا موڈ اولوں چیزیں نازل حدود کے اندر آچکی تھیں۔ ماربل کے ٹائیلوں سے سج چمکدار پورچ کی حدیں جہاں ختم ہوتی تھیں وہیں سے گھر کے سامنے بنے ہرے بھرے لان کی شروعات ہوتی تھی۔

اس وقت لان کے عین درمیان گھاس کے اوپر ایک بڑے سائز کا ان فلیٹ اہیل بچھا ہوا تھا جس کے اندر گھر کے دو ملازمہ پائپ کی مدد سے پانی بھر رہے تھے۔ ”یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟“ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے عرش نے پانی بھرتے ایک ملازم سے استفسار کیا۔

”صاحب نے اسے بھرنے کو کہا تھا۔ چھوٹی بلی بلی بول میں نہانا ہے۔“ ملازم نے عرش کو بتایا۔

”کون چھوٹی بلی بلی؟“ عرش نے الجھ کر پوچھا۔ پھر اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ ہنہ کی بات کر رہا ہے۔ رعنا کے گھر سے اپنے گھر آنے کے دوران عرش یہ بھول گئی تھی کہ ہنہ کی گرمیوں کی چھٹیاں کل سے شروع ہو چکی ہیں اب وہ اگلے دو ہفتے اسی گھر میں عرش کے سر پر ناچتے ہوئے گزارے گی۔

عرش نے اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی پر گرتے ہوئے رعنا کے ہی ہانداز میں سر کو تھام لیا۔

عرش جس کرسی پر بیٹھی تھی اس کے برابر والی کھڑکی نے آدھی سے زیادہ دیوار کو گھیرا ہوا تھا اور اس کھڑکی میں سے لان کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ حصہ عرش کے بیڈ روم سے دکھتا تھا اس لیے اس کی آرائش و زیبائش پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے تھے۔

لال پتھروں کی بنی روش اس کے درمیان سبزے کا مٹلیں فرش اور اس پر سجے ٹاپ اور قیمتی بودے جو جانے کہاں کہاں سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ فشر کے بہترین لینڈ اسکیپ آرٹسٹ کے تخیل کو بھاری قیمت دے کر اس حسین منظر میں ڈھالا گیا تھا۔

پر اس وقت یہ دلکش و دلنشین نظارہ عرش کے تھے

اغصاب کو پر سکون کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ رنگ و خوشبو سے بھرا یہ خوبصورت منظر عرش کے لیے نہ صرف اپنی کشش کھوپکا تھا بلکہ کچھ عرصے سے اس کی نظروں میں چھنے لگا تھا۔ اس چھین کا آغاز اس دن بلکہ اس رات سے ہوا تھا جس رات ان کی لیڈر بلیک کی سیکرٹری سمر راجہ زبان نے اسے گھر پر پول سائیڈ پارٹی اسٹیج کی تھی۔ پارٹی کا مقصد گیٹ نوکیر سے زیادہ اپنے نئے سونمنگ پول کی نمائش کرنا تھا۔ رات کے وقت پول کے اطراف لگی ڈھیروں لائٹوں کے پانی کی سطح پر جھللاتے عکس نے نہایت فسوں خیر ماحول پیدا ہوا تھا۔ عرش سمیت وہاں موجود کئی خواتین کے دل میں اس سے بھی کچھ بہتر کردکھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

”صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر کیونٹی کلب کا سونمنگ پول ہے پھر گھر کے اندر سونمنگ پول بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔“ حذیفہ نے عرش کی تجویز کو سختی سے رد کر دیا تھا۔

”مگر اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ عرش کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ جب وہ لوگ انورڈ بھی کر سکتے ہیں اور ان کے پاس وافر جگہ بھی موجود ہے تب بھی حذیفہ پول بنوانے میں حجت کیوں کر رہا ہے۔

”حرج ہے عرش! چھوٹے بچوں والے گھر میں سونمنگ پول بنوانا مناسب نہیں ہوگا۔“ حذیفہ نے اپنا اعتراض بیان کیا تو عرش کا منہ کھلا رہ گیا۔

”کیا؟“ اس نے ہونٹوں کی طرح پوچھا۔ ”دیکھو عرش! ہنہ ابھی چھوٹی ہے۔ اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا لیکن شوق اتنا ہے کہ جب میں اسے کلب لے کر جاتا ہوں تو فوراً پانی میں چھلانگ لگانے کے لیے دوڑ بڑتی ہے گھر میں پول ہوگا تو یہاں بھی یہی کرے گی۔ کلب میں تو چھٹی دیر پانی میں رہتی ہے۔ میں اس کی عمرانی کرتا ہوں گھر میں جو بیس گھنٹے میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“ حذیفہ نے کہا۔

”تم خواہ مخواہ فکر کر رہے ہو وہ رشیدہ ہر وقت اس

کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

”جب ہم ماں باپ ہو کر ہر وقت ہنہ پر نظر نہیں رکھ سکتے تو نوکروں سے یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ غفلت نہیں برتن گے۔“

حذیفہ راضی نہ ہوا۔ ہنہ کے معاملے میں وہ مثل کلاس ہاؤس سے بھی زیادہ دہی تھا۔

”مگر مجھے ہر حال میں سونمنگ پول بنوانا ہے۔“

عرشی نے پیرنچ کر کہا۔

”کچھ سال بعد دیکھیں گے۔ تب تک ہنہ بھی سمجھ دار ہو چکی ہوگی۔“ حذیفہ نے اسے ٹال کر دتی

طور پر جان چھڑائی۔ آج اپنے سرسبز و شاداب لان کے

بیچ ہنہ کے لیے مصنوعی سونمنگ پول میں پانی بھرتا

دیکھ کر عرشی کو اپنا نہ بن سکنے والا سونمنگ پول پھر سے

یاد آگیا۔

”ہنہ کے لیے پول لگوانے کی فرمائش فوراً پوری

کر دی۔ میرا پول تعمیر کرواتے وقت تکلیف ہو رہی

تھی۔“ عرشی نے وائٹ پس کر سوچا۔ حالانکہ تھوڑی

دیر کے لیے سیٹ کیے گئے وہ فٹ گہرے بجکانہ

سونمنگ پول میں اور ایک دس پندرہ فٹ کی گہرائی

والے سونمنگ پول میں کتنا فرق ہوتا ہے یہ عرشی کو

بھی معلوم تھا۔ مگر وہ اکثر ایسے ہی بے جوڑ اور بے سگے

موازنے کر کے اپنا پارہ پائی کر لیا کرتی تھی۔

حذیفہ ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ یہ پول

سیٹ کرنے کی ہدایت اس نے یقیناً ”فون بر دی ہوگی۔“

عرشی کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک وہ خود بھی گھر بیچ

جائے گا۔ جب ہنہ گھر پر ہوتی تو کوئی میننگ حذیفہ

کے قدم و فتر میں زیادہ دیر تک نہیں روک پاتی۔ عرشی کا

اندازہ درست تھا۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ کی گاڑی بھی

پورچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔

احتجاج کے طور پر عرشی اپنے کمرے سے باہر ہی

نہیں نکلی اور جب باہر آئی تب تک رات کا اندھیرا

چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ حذیفہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ

ہنہ کو برگر کھلانے لے جا چکا تھا۔

ساتھ شامل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر عرشی نے

کبھی ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کیا تھا۔ اب تو

عرصے حذیفہ نے اسے ساتھ چلنے کی دعوت دینا بھی

چھوڑ دی تھی۔

ناراضی کے اظہار کے طور پر عرشی رات کو بھی ان

دونوں کے واپس آنے سے پہلے ہی سو گئی۔

حذیفہ ہنہ کو لے کر کب لوٹا۔ کمرے کے اندر

کب آیا، آیا بھی یا وہیں ہنہ کے کمرے میں صوفہ کم

بیڈ کھول کر اس پر سو گیا۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر

یہ دیکھنے تک کی بھی زحمت نہیں کی۔

ابھی موسم سرا کا پوری طرح آغاز نہیں ہوا تھا۔ پھر

بھی لندن میں اچھی خاصی ٹھنڈی ہوا آئیں چلنا شروع

ہو چکی تھیں۔ یہاں کا موسم عجیب تھا۔ گرمیوں کے

دنوں میں بھی جس روز سورج جلوہ افروز نہ ہو اس دن

بھی اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ سوسٹوں اور

کوٹ اور اکثر چھتریوں کے بنا گھر سے نکلنے کا تصور بھی

نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لندن کا شہر بھی اپنے موسم کی طرح عجیب تھا۔ گلیاں

میلا، سلیٹی رنگ کا، سوائے سینٹرل لندن کے جہاں

ٹورسٹ لوگوں کی بھرمار ہوتی تھی سارے شہر کا ماحول

اداسی اور یاسیت سے بھرپور تھا۔ ہر حیرت کی بات یہ

تھی کہ دھوپ نکل آنے پر یہی شہر اپنی پہچانی بدل لیتا

تھا۔ اداسی کا چولا اتار کر ایک دم سے چمکنے لگتا۔ بد رنگ

عمار میں خوبصورت لگتیں۔ اندھیری گلیاں روشن

ہو جاتیں۔ فقط ایک سورج کے نکلنے یا چھپ جانے

سے کسی اور جگہ میں اتنی تیزی کے ساتھ اس قدر

حیرت انگیز تبدیلی نہیں آتی تھی جتنی کہ لندن شہر

میں۔

موسم گرما رخصت ہو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے

چلتے کئی لوگ تیز ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھنے کے

لیے اپنے کوٹ کے کالر اوپر کیے تیز رفتاری سے اپنی

منزل کی طرف رواں تھے۔

ان ہی سبک خرام لوگوں کے درمیان ایک لڑکی بھی

چل رہی تھی جس کی رفتار باقی سب کی نسبت کم

تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے سڑک کے

کونے پر بنی کافی شاپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل

ہو گئی۔ اس نے کاؤنٹر سے کافی لی اور ایک کونے میں

رکھی بہت ساری بوتلوں میں سے اپنی پسند کا چاکلیٹ

باؤڈر کافی کے اوپر چھڑکا اور پھر شیشے کی دیوار کے ساتھ

رکھی میز کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گئی۔ جہاں

سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔

گرم گرم کافی کے گھونٹ پیتے ہوئے وہ باہر سے

گزرنے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

اسے خبر نہیں تھی کہ باہر سے گزرنے والے کئی

لوگ بھی کافی شاپ کے اندر بیٹھی اداس آنکھوں والی

اس لڑکی کی طرف اکثر متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔

وہ لڑکی جو ہمیشہ شیشے کی دیوار کے سامنے رکھی کرسی

پر اکیلی بیٹھا کرتی تھی۔

کافی ختم کر کے لڑکی نے ٹیبل پر رکھا اپنا بیگ اٹھایا

اور اسے کندھے پر ڈال کر شاپ سے باہر نکل آئی۔ باہر

نکلنے ہی ٹھنڈی ہوا اس کے گرم ہوئے رخساروں سے

نکرائی۔ کبھی یہ ٹھنڈ کا موسم اسے بے حد پسند ہوا کرتا

تھا۔ تب اسے نہیں پتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا

جب اس کی زندگی پر ہی برف جم جائے گی۔

ٹھنڈے جذبات، ٹھنڈے احساسات، ہر چیز منجمد،

حرارت کے بغیر۔

لڑکی نے بھی اوروں کی طرح کوٹ کے کالر ٹھنڈی

ہوا سے بچنے کے لیے اوپر کیے اور آگے چل پڑی۔ اس

کارخ اندر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف تھا جہاں سے اسے

اپنے گھر کی سمت جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔

ٹرین اس کے مطلوبہ اسٹیشن پر پہنچی تو لڑکی برقی

سڑھیوں سے چڑھتی ہوئی زیر زمین اسٹیشن سے نکل کر

ایک بار پھر کھلی فضا میں آگئی۔

اب کی بار وہ پہلے کی نسبت تیز قدموں سے ایک

سمت میں چلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ایسے رہائشی

علاقے میں داخل ہو گئی جہاں بہت سارے ایک جیسے

گھر قطار میں بنے ہوئے تھے۔

ایک گلی میں اگلے ہاتھ کے تیسرے نمبر والے گھر

کے سامنے ٹھہر کر اس نے بیگ سے جالی نکال کر

دروازے میں لگائی اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

گھر کے اندر کچن کی سمت سے کھٹو پڑی آوازیں

سنائی دے رہی تھیں۔

”کون؟“ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر کسی نے کچن

میں سے ہی صدا لگائی۔

”میں ہوں۔ جویریہ“ لڑکی نے اپنا کوٹ دروازے

کے ساتھ لگے کوٹ ریک پر ٹانگتے ہوئے جواب دیا۔

”سرا! آپ روزیہ سوال کیوں پوچھتے ہیں جبکہ آپ

کو پتا ہے کہ میرے علاوہ اور کسی کے پاس گھر کی چابی

نہیں ہے اور میرے علاوہ کوئی دروازہ کھول کر اندر

نہیں آسکتا؟“ جویریہ نے کچن میں داخل ہوتے

ہوئے پروفیسر صاحب سے کہا۔

”عادت پڑ گئی ہے۔ اب اس عمر میں پرانی عادتیں

آسانی سے جان نہیں چھوڑتیں۔“ پروفیسر صاحب

اس کی طرف پلٹتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

وہ کچن سلیب کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے بنائے

سینڈویچز کے کنارے چھری سے کاٹ رہے تھے۔

سلیب کے نیچے فٹ ہوئی کپڑے دھونے کی مشین کے

گول شیشے میں سے جھاک بھرے پانی میں ڈوبے

کپڑے گول گول چکر کھاتے نظر آ رہے تھے۔

جویریہ کچن کے وسط میں رکھی ٹیبل کے گرد پڑی

کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔

یہ ایک مناسب سائز کا کچن تھا۔ انگلینڈ کے متوسط

طبقے کے ہر در سرے گھر میں پائے جانے والے کچن

جیسا ساہم ضرورت کی ہر چیز سے لیس۔

کچن کے وسط میں رکھی جس ٹیبل کے پاس جویریہ

بیٹھی تھی اس پر رکھی جیم جیلی کی بوتلیں اور دو تین قسم

کے پڑے ہوئے سیریز کے ڈبے یہ بتاتے تھے کہ صبح کا

ناشتا ”عموماً“ یہیں بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔

اپنے سر پر پٹی اوئی ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے

جویریہ کی نظر سیریل کے پیکٹ کے پیچھے سے جھانکتی
 سگریٹ کی ڈبیہ پر چلی گئی۔
 پروفیسر صاحب بھی سینڈویچز سے بھری پلیٹ لے
 کر جویریہ کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔
 ”آج کتنے سگریٹ پیسے آپ نے؟“ جویریہ نے
 بظاہر لڑوائی سے پوچھا۔
 ”ایک بھی نہیں۔“ پروفیسر صاحب جلدی سے
 بولے پھر جویریہ کے ابرو چڑھا کر دیکھنے پر کھسکا کر کہنے
 لگے۔
 ”چھایا! ایک پاتھا۔ اب دن میں ایک سگریٹ
 کی اجازت تو تمہنے بھی دے رکھی ہے۔“
 ”آپ ایک بار امت کر کے مکمل طور پر چھوڑ دیں
 نہیں دیتے؟“ جویریہ نے کہا۔
 ”کہانا۔ اس عمر میں پرانی علوتیں اتنی آسانی سے
 نہیں چھوڑتیں۔ خاص طور پر اگر وہ بری علوتیں
 ہوں۔“ وہ مسکرائے۔ ”چھاپھوڑو یہ بحث یہ بتاؤ ج
 کیا تھا تمہنے؟“
 ”آج مصروفیت زیادہ تھی۔ وقت ہی نہیں ملا۔“
 جویریہ نے جواب دیا۔
 ”چھاپھوڑو یہ کھاؤ۔ تمہاری پسند کے سینڈویچ بنائے
 ہیں۔“ پروفیسر صاحب نے پلیٹ جویریہ کے آگے
 کھسکائی۔
 وہ جویریہ کے آنے سے پہلے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتے
 تھے۔ بمانیہ ہوتا تھا کہ انہیں اس وقت بھوک محسوس
 ہوتی ہے حالانکہ وہ خود یہ سب بس چکھنے کے برابر ہی
 کھاتے تھے۔
 ”آپ پلیر روز ایسا مت کیا کریں۔“ جویریہ ان کے
 خلوص کے آگے شرمندہ ہو جاتی۔
 ”تم بھی پلیر روز وہ سہر کا کھانا مت چھوڑا کرو۔“
 پروفیسر صاحب نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا پھر
 حکم بھرے انداز میں کہنے لگے۔
 ”چھاپھوڑو یہ کھانا کھادو یہ۔“
 جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ میں رکھا ایک ٹکون
 اٹھایا اور ہولے ہولے کترنے لگی۔

سینڈویچ واقعی مزیدار تھے۔ جویریہ کو پتا ہی نہیں چلا
 کہ اس نے پہلا کب ختم کر کے دوسرا بھی اٹھالیا۔
 ”کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
 اپنے دوسرے سینڈویچ کے اختتام پر جویریہ نے
 نوٹ کیا کہ پروفیسر صاحب نے خود ایک بھی سینڈویچ
 نہیں لیا تھا۔
 ”ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا تھکاوٹ سی
 ہو گئی ہے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولے تو جویریہ نے
 چونک کر انہیں دیکھا۔
 ”متر کی دہائی کے اختتام پر ہونے کے باوجود پروفیسر
 صاحب ابھی تک انتہائی چاق و چوبند تھے۔ لیکن
 بہر حال ان کی عمر ایسی نہیں تھی جسے آسانی سے نظر انداز
 کیا جاسکے۔
 آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“ جویریہ نے احتیاط کے
 ساتھ کہا۔ پروفیسر صاحب اس کی طرف دیکھ کر
 مسکرائے۔
 ”آرام کر کے ہی تھک گیا ہوں۔ اب تھوڑی
 بھاگ دوڑ کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”لگتا ہے ہانز کی کوئی نئی ای میل آئی ہے۔“ جویریہ
 سمجھ گئی۔ ”اس نے پھر اپنا کوئی نیا کارنامہ بنا کر آپ کو
 انصاف کر دیا ہو گا۔“
 ہانز اب نا۔ بھر یا میں تھا اور اپنے روایتی جوش و
 خروش کے ساتھ معاشرے سے برائی کے خاتمے کی
 کوششوں میں مگن تھا۔ اپنی ان کاوشوں کے نتائج وہ
 اکثر ریڈیو ای میل یا فون پروفیسر صاحب کو بھی
 جاتا رہتا تھا۔
 ”ہانز کی میلا تو آتی ہی رہتی ہیں۔ ہانز سے میرا بھلا
 کیا مقابلہ۔ وہ بلا تھکان کام کر سکتا ہے کیونکہ اس میں
 ہمت، حوصلہ اور طاقت ہے اور میں۔“ پروفیسر صاحب
 نے گہرا سانس لیا۔ ”میری زندگی میں آنے والے وقتے میری
 عمر کا تقاضا ہیں۔ ہر تھوڑے عرصے کے بعد اگر رک کر
 سانس نہیں لوں گا تو اگلا قدم نہیں اٹھاپاؤں گا۔ انسان
 کو اپنی حدود کا پتا ہونا چاہیے۔“
 ”پھر کیا بات ہے؟“ جویریہ نے کھوجتی نگاہوں سے

انہیں دیکھا۔ پروفیسر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر
 بولے۔
 ”تمہیں وہ لاہور والا دوٹن سینٹریا دے ہے جنہاں تم
 نے یہاں آنے سے قبل کچھ وقت گزارا تھا؟“
 پروفیسر صاحب کی بات سن کر جویریہ کے جسم میں
 غیر ارادی طور پر ایک دم تکاؤ آیا پر وہ منہ سے کچھ نہیں
 بولی۔
 ”جب میں وہاں کام کیا کرتا تھا تو میں نے ایک تجویز
 پیش کی تھی کہ اس جگہ کو محض ایک پناہ گاہ کے طور پر
 استعمال کرنے کے بجائے یہاں کچھ ایسے ہنر سکھانے
 کا بھی بندوبست کیا جائے جو غریب عورتوں کی زندگیوں
 میں بہتری لاسکیں۔ اب چاہے وہ بہتری ان عورتوں
 کے واپس اپنے خاندانوں میں لوٹ جانے کے بعد
 اضافی آمدنی کی صورت میں ہو یا پھر ایک نئی زندگی کی
 شروعات کرنے میں معاون ہو۔ سینٹر کی سرپرست سز
 ملک بھی اس معاملے میں میری ہم خیال تھیں لیکن
 اس وقت ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس
 تجویز پر عمل کیا جاسکے۔“ پروفیسر صاحب نے جویریہ کو
 بتایا۔
 ”اور اب وسائل موجود ہیں؟“ جویریہ کچھ کچھ
 سمجھنے لگی۔
 ”ہاں! کچھ کا بندوبست ہو چکا ہے۔ مزید کی بھی
 امید ہے۔ سینٹر کو بھی توسیع دی گئی ہے۔ اب وہ لوگ
 چاہتے ہیں کہ میں وہاں واپس آکر اس کام کو اپنی نگرانی
 میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔“ پروفیسر نے کہا۔
 ”پھر آپ کو ضرور جانا چاہیے۔“ جویریہ نے
 خلوص کے ساتھ کہا۔
 ”تم چلو گی میرے ساتھ؟“ انہوں نے خالی پلیٹیں
 اکٹھی کرتی جویریہ سے اچانک پوچھا۔
 ”میں؟“ جویریہ نے حیرت سے پروفیسر صاحب کو
 دیکھا۔ ”میں وہاں کیا کروں گی؟“
 ”تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ آخر تمہیں کیونٹی
 ڈیولپ منٹ کا تجربہ ہے۔“ پروفیسر صاحب بولے۔
 ”نہیں! میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔“ پلیٹیں

ہاتھ میں لیے ہوئے سر جھکا کر کھڑی جویریہ نے آہستہ
 سے انکار کیا۔
 ”جیسے تمہاری مرضی۔“ پروفیسر صاحب نے اصرار
 نہیں کیا۔ جویریہ نے استعمال شدہ پلیٹیں سنک کے اندر
 رکھیں۔
 ”ہاں یاد آیا۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی
 جاسم کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ تم گھر پہنچی ہو یا نہیں
 تمہارے سیل فون پر بھی کال کر رہا مگر تم نے اٹھایا
 ہی نہیں۔“ پروفیسر صاحب نے جویریہ کو اس کے ایک
 کولیک کے فون کے بارے میں بتایا۔
 ”میرے فون کی بیٹری ختم ہو چکی ہے اس لیے
 اس کا فون میرے نمبر پر نہیں مل رہا ہو گا۔ کوئی بات
 نہیں۔ ابھی اسے کال کر کے تسلی دے دیتی ہوں کہ
 میں بخیر وعافیت گھر پہنچ چکی ہوں۔ انتہائی دہی انسان
 ہے یہ جاسم بھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہو جاتا
 ہے۔“
 جویریہ نے جھوٹی ہلہلوں پر صابن لگاتے ہوئے
 مسکرا کر کہا۔
 ”ہر کسی کے لیے فکر مند نہیں ہوتا ہے۔ وہ۔“
 پروفیسر صاحب بولے جویریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 وہ پروفیسر صاحب کی طرف پشت کیے برتن دھوئی
 رہی۔
 ”جاسم اچھا لڑکا ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر
 صاحب نے بظاہر عام سے لہجے میں جویریہ سے کہا۔
 ”ہاں بہت اچھا ہے۔ وہ۔ ہمارے پورے پراجیکٹ کو
 اسی نے سنبھال رکھا ہے۔“
 جویریہ نے پروفیسر صاحب کی طرف مڑتے ہوئے
 عام سے لہجے میں کہا۔ جویریہ جان بوجھ کر ان کی بات کا
 دوسرا مطلب نکال رہی تھی۔ پچھلے سات سالوں کے
 دوران وہ جویریہ کی عادات سے بہت اچھی طرح واقف
 ہو چکے تھے۔
 اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب مزید کچھ کہتے
 کپڑے دھونے کی مشین نے زور سے گھٹی بجاکر
 کپڑے دھول جانے کا اعلان کیا۔

”آپ رہنے دیجئے۔ میں باہر ڈال آتی ہوں۔“ جویریہ نے پروفیسر صاحب کو انھیں سے منع کرتے ہوئے مکین کی گول شیشے کی گھڑکی کھول کر دھلے کپڑوں کا ڈھیر پلاسٹک کی ٹوکری میں نکالا اور جلدی سے نئے موضوع گفتگو کو چھوڑ کر باہر نکل آئی جہاں گھر کے پچھواڑے میں چھوٹی سی جگہ تھی۔

باہر دھوپ چھاؤں کی آنکھ مجھولی جاری تھی۔ کوئے میں ایک قدیم درخت اگا تھا جس میں موسم کے ساتھ کاسنی رنگ کے پھولوں کے پکے لگا کرتے تھے۔ اس درخت کی مہین مہیناں چلنے والی ہوا کے ساتھ ہلکے ہلکے لہرا رہی تھیں۔ درخت سے کچھ فاصلے پر ہی کپڑے لٹکانے والے تار بندھے ہوئے تھے جویریہ نے ٹوکری میں سے ایک شرٹ نکال کر جھاڑ کر تار پڑا دی۔ سات سال گزر جانے کے باوجود وہ ماضی کی ایک بھی یاد کو ذہن سے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور پروفیسر صاحب اس سے پوچھ رہے تھے کہ اسے دو مین سینٹر میں گزارا وقت یاد ہے؟

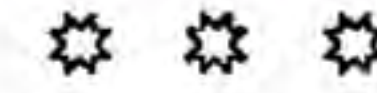
بظاہر یہ جویریہ اس جویریہ سے بہت مختلف تھی جسے پروفیسر صاحب بکھری ہوئی، لٹٹی ہوئی حالت میں سات سال پہلے یہاں لے کر آئے تھے۔ تب کسے پتا تھا کہ لمز کے پروگرام کے تحت ایڈمیشن حاصل کرنے والی ڈری سہمی اعتماد سے عاری کی قسمت میں ایک دن انگلستان کی ایک اچھی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونا لکھا ہے۔

کہاں بزنس اسٹڈیز اور کہاں سوشل ورک کی ڈگری۔ انسان کہاں سے سفر شروع کرتا ہے کہاں جانے کا سوچتا ہے اور کہاں جا پہنچتا ہے۔ یہ اسے وقت سے پہلے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس ڈری سہمی جویریہ سے اس پر اعتماد جویریہ تک کا سفر کتنا کٹھن تھا؟ یہ صرف جویریہ ہی جانتی تھی۔

لیکن یہ سارا فرق صرف ظاہری حد تک تھا۔ پروفیسر صاحب کو معلوم تھا کہ اندر سے جویریہ اب بھی اتنی ہی معصوم، حساس اور بھولی بھالی ہے جتنی پہلے ہوا

کرتی تھی اور انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اپنے کام میں مگن کھاتی پیتی، ہنستی بولتی بظاہر ہر طرح سے ایک نارمل زندگی گزارتی جویریہ نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر لیے تھے اور اب انہیں کسی کے لیے بھی دوبارہ کھولنے پر تیار نہیں تھی۔

جویریہ سے کہیں بہتر تو اس کی پشت پر اگا ٹنڈ منڈ شاخوں والا درخت ہی تھا جو اپنے پرانے کمزور پتے جھاڑ کر آنے والے خوشگوار دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔



جویریہ جب ساڑھے سات بجے صبا کے گھر پہنچی تو گھر میں کسی قسم کی دعوت کے کوئی آثار نظر آرہے تھے حالانکہ صبا نے اصرار کر کے جویریہ کو ویک اینڈ پر اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔ ”آج ڈنر ہے بھی یا تم نے مجھے بلانے کے لیے بہانہ گھڑا تھا؟“ جویریہ کو صبا کا اوٹ پٹانگ ساحلیہ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔

”ہاں ہاں ہے کیوں نہیں۔“ صبا بیڑھیوں پر سے چھلانگ مار کر اترتے ہوئے بولی۔ ”تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔ تب تک جاٹم بھی پہنچ جائے گا۔“

”جاٹم بھی آ رہا ہے؟“ اور کوٹ کے بٹن کھولتی جویریہ کے ہاتھ رک گئے۔ ”اور کس کس کو بلایا ہے تم نے؟“

”کسی کو بھی نہیں۔ بس تم اور جاٹم ہی ہو۔ تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ کھانا باہر جا کر کھا میں گے“ صبا یہ کہتے ہوئے دھب دھب کر کے بیڑھیاں چڑھتی اوپر بھاگ گئی۔ جاٹم کے گھر سے یہاں تک کا راستہ کم سے کم بھی ڈیڑھ گھنٹے کا ضرور تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ جویریہ کو نہیں معلوم تھا کہ جاٹم کی صبا سے اتنی دوستی ہے کہ وہ صرف ایک ڈنر کے لیے یہاں تک کی لمبی ڈرائیو کر کے اپنا ویک اینڈ خراب کرنے کو تیار ہو جائے گا۔

بہر حال اگر صبا نے بلایا تھا اور جاٹم آ رہا تھا تو جویریہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔ جویریہ اندر سنگ روم میں آکر صبا کی ای کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ لی دی پر چلنے والا کیم شو دیکھنے لگی۔

صبا کے والدین کا تعلق میرپور سے تھا اور وہ کئی سال پہلے بہتر مستقبل کی تلاش میں انگلستان آئے تھے۔ صبا اس نسل سے تعلق رکھتی تھی جسے ”برٹش بورن“ کہا جاتا تھا جو اپنے پاکستان، انڈیا یا بنگلہ دیش میں پیدا ہونے والے ماں باپ کے برعکس یہیں انگلستان میں پیدا ہو کر پرورش پائی تھی۔ جن کے والدین نے ساری عمر چھوٹے موٹے کام کر کے انہیں اچھی تعلیم دلوا کر اس قابل بنادیا ہوتا تھا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ گوروں کے اس دس میں ان کے شانہ بشانہ چل سکیں اور بہترین ملازمتوں کے لیے ان کے ساتھ برابری کی سطح پر مقابلہ کر سکیں۔

صبا شوخ اور زندہ دل لڑکی تھی جبکہ جویریہ نسبتاً خاموش اور سنجیدہ مزاج رکھتی تھی۔ دونوں کے مزاج میں اتنا فرق ہونے کے باوجود دونوں کی دوستی اب تک قائم تھی اور اسے قائم رکھنے میں جویریہ سے زیادہ صبا کا ہی ہاتھ تھا۔ جویریہ کی نظریں لی دی اسکرین سے بھٹک کر سنگ روم سے ملحق ڈانگ روم کی طرف چلی گئیں جہاں صبا کا بھائی عبید اللہ لکڑی کی میز پر کتابیں پھیلانے اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔

عبید اللہ صبا کا سگا بھائی نہیں تھا۔ وہ ایک افغان لڑکا تھا جس کا تعلق قدح مار کے علاقے سے تھا اور جس کے خاندان سمیت پورے گاؤں کو جنگ کی تباہ کاریوں نے صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا تھا۔ صرف پندرہ سالہ عبید اللہ ہی کسی طرح اپنی جان پر کھیلتا ہوا انگلستان پہنچ گیا۔ گو کہ عبید اللہ اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے لاتعداد افراد میں سے ایک تھا مگر اسے ایک چیز میں دوسروں پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یہ کہ وہ فقط پندرہ سال کا تھا اور ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا تھا جسے بین الاقوامی سطح پر غیر محفوظ قرار دیا جا چکا

تھا۔ اکثر معاملات میں ظالمانہ حد تک بے حسی کی چادر اوڑھ لینے والی یہاں کی حکومت کے چند اصول ایسے بھی تھے جو قابل تحسین تھے اور ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ کسی لاوارث بچے کو چاہے وہ غیر قانونی طور پر ہی ملک میں کیوں نہ داخل ہوا ہو، کسی ایسے علاقے میں واپس نہیں بھیجا جائے گا جہاں اس کی جان کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہ دی جاسکے۔ چنانچہ سن بلوغت کو پہنچ جانے تک عبید اللہ کو نہ صرف یہاں رہنے کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے جڑے دیگر اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی حکومت برطانیہ نے اپنے سر لے لی۔

صبا کے والدین عبید اللہ کے رضاعی والدین تھے۔ عبید اللہ پچھلے دو سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا اور اب تک ان کے خاندان کا الٹو حصہ بن چکا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع، اپنے کام سے کام رکھنے والا ذہین لڑکا تھا جو پسماندہ علاقے سے آنے کے باوجود بہت تیزی کے ساتھ خود کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر رہا تھا۔ اگلے سال عبید اللہ کی اٹھارویں سالگرہ آنے والی تھی۔ قانونی طور پر بالغ ہو جانے کے بعد حکومت اسے یہاں رہنے کی اجازت دے گی یا پھر اسے اس کے ملک واپس بھیج دیا جائے گا یہ بات فی الحال صبا کے گھروالے بھی نہیں جانتے تھے۔

لی دی پر چلنے والا کیم شو اپنے آخری مراحل میں تھا تب صبا تیار ہو کر پیچھے اتر آئی۔ ساتھ ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

”یقیناً“ جاٹم ہو گا۔“ صبا نے گردن کے گرد مفلر لپیٹتے ہوئے اندازہ لگایا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دروازے پر جاٹم پھولوں کا بو کے اور چاکلیٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”ہیلو! کیسی ہو؟“ اس نے اندر آتے ہوئے جویریہ اور صبا دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا۔

جاٹم درمیانے قد کا خوش شکل عراقی نوجوان تھا جو صبا اور جویریہ کے ہی دفتر میں ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ صبا اور جویریہ جاٹم کی ماتحتی میں کام کرتی

تھیں لیکن یہ جاشم کے خوش اخلاق اور دوستانہ رویے کا مکمل تھا جس نے اس کے سامنے اور کرز کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت خوشگوار رکھے ہوئے تھے۔ جویریہ کا خیال تھا کہ جاشم پھول اور چاکلیٹ صبا کے لیے ڈنر بلانے کے شکریے کے طور پر لایا ہے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جاشم نے دونوں چیزیں صبا کو پکڑانے کے بجائے جویریہ کی طرف بڑھائیں۔ ”ابھی برتھ ڈے جویریہ!“ جویریہ نے سٹیٹا کر ساتھ کھڑی صبا کی طرف دیکھا، جس کی بائیں کھلی ہوئی تھیں۔

”سربراہ!“ صبا چکی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ جویریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہ تمہاری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ اصولاً تو یہ دعوت تمہیں ہم لوگوں کو دینی چاہیے تھی لیکن تم نے نہیں دی اس لیے ہم بے رہے ہیں۔“ صبا نے کہا۔

جویریہ نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب چھوٹی تھی تب بھی نہیں۔ ان کے گھر میں سالگرہ وغیرہ منانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ پر اب اب پروفسر صاحب، صبا اور جاشم جیسے قلمی ساتھی اسے یہ دن بھولنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کسی نہ کسی اشارے سے یہ بلور کراویٹے کہ سال کے تین سو پینسٹھ عام سے گزرنے والے دنوں میں یہ ایک دن کم از کم جویریہ کے لیے بہت خاص ہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔“ جویریہ نے کہا۔

”آجھے بچوں کی طرح شکریہ کہو اور چلو ہمارے ساتھ۔ ہم گرین اسٹیٹ جا کر کھانا کھائیں گے۔“ صبا نے گھر کے پاس ایک جگہ کا نام لیا جو پاکستانی کھانوں کے لیے مشہور تھی۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف کے تھمے تھمے سفید گولے ایک تو اتر کے ساتھ آسمان سے گر رہے تھے۔

گرین اسٹیٹ صبا کے گھر کے پاس ہی تھی۔ جاشم کی گاڑی میں سوار ہو کر ان لوگوں کو وہاں پہنچنے میں زیادہ

دیر نہیں لگی۔

”چلو جاشم! آج جویریہ کی سالگرہ کے بہانے تم بھی ہمارے ملک کے ذائقوں سے آشنا ہو جاؤ گے۔ اس جگہ پر کم و بیش ہر قسم کا پاکستانی کھانا مل جاتا ہے۔“ صبا نے جاشم کو بتایا۔

”مجھے معلوم ہے۔ میں پہلے بھی یہاں کھانا کھانے آچکا ہوں۔“

”رنگی؟“ صبا نے حیرت سے کہا۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں پاکستانی چیزیں پسند ہیں۔“

”پاکستانی چیزوں میں ناپسند کرنے والی کون سی بات ہے۔“ جاشم نے سنجیدگی سے کہا تو جویریہ پورے انشماک کے ساتھ گاڑی کی کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ گزرنے والے سائن بورڈ پڑھنے لگی۔ پتا نہیں اسے ہر بات کیوں ذمہ معنی لگنے لگی۔ کھانا آجھے خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ جویریہ نے بل دینے کی کوشش کی مگر جاشم اور صبا دونوں نے انکار کر دیا۔

”یہ دعوت ہم دونوں نے دی ہے اس لیے بل بھی ہم ہی دیں گے۔ تم کسی اور دن ہم دونوں کی دعوت کر کے حساب برابر کر لیتا۔“ صبا نے کہا۔

ان لوگوں کے کھانا کھانے کے دوران برف باری میں کافی تیزی آچکی تھی۔

جویریہ کا خیال تھا کہ صبا کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد جاشم اسے اسٹیشن تک لفٹ دے گا مگر گاڑی اس سے بھی آگے نکال کر لے گیا۔ ”یہ کہاں جا رہے ہو؟“

”تمہیں گھر چھوڑنے۔“ جاشم نے اطمینان سے جواب دیا۔

”یہیں اسٹیشن پر اتار دیتے میں خود چلی جاتی۔“ جویریہ نے گاڑی کی سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ تمہارا گھر میرے راستے میں ہی پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔

”ایسا بھی کوئی راستہ میں نہیں ہے۔ اچھا خاصا آؤٹ آف روے جانا پڑے گا تمہیں۔“ جویریہ ناراضی سے بولی۔ جویریہ کی رہائش گرین وچ میں تھی۔ لندن

کے مشہور زمانہ میری ٹائم میوزیم کے پاس جہاں بنی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر زمین میں سے زیرو میٹرین نامی ایک سیدھی لکیر گزاری گئی ہوئی تھی۔ پوری دنیا کو جغرافیائی لحاظ سے خط استوا پر بننے والی زمین سو ساٹھ فرسز لکیروں میں یہ پہلی لکیر تھی اور وہیں پر نصب ایک گھڑی کے وقت کو GMT یعنی گرین وچ میں ٹائم کہا جاتا تھا جس سے ساری دنیا اپنے اپنے وقت کا حساب لگاتی تھی۔

”مجھے آؤٹ آف دے نہیں پڑے گا۔ اور اگر راستہ لمبا ہو گا بھی تو میرا ہو گا“ تمہیں اس سے کیا۔ تم تو گھر پہنچ جاؤ گی۔“ جاشم جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ چپ ہو گئی۔

جاشم سے بحث کرنا لا حاصل تھا۔ جویریہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں برف باری کی وجہ سے ٹریفک آہستہ چل رہی تھی مگر سڑک پر گرنے والی برف کی تہہ ابھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ آمدورفت بند ہو جاتی جیسا کہ عموماً ”شدید برف باری کے دوران ہو جاتا کرتی تھی۔ زیر زمین راستوں پر برف باری عموماً اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ جویریہ تو کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی جاتی مگر جاشم کا واپسی کا راستہ خلاصا لمبا تھا اور برف باری تیز ہونے کی صورت میں اس کے راستے میں پھنس جانے کے امکانات کافی زیادہ تھے۔ جویریہ نے آسمان سے گرتے سفید گولوں کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔

”تم کل شام کو فارغ ہو؟“ سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتے ہوئے جاشم نے جویریہ سے اچانک پوچھا۔

”کیوں کیا کوئی اور سربراہ ہے؟“

”ہے تو۔ پر تمہارے لیے نہیں۔“ جاشم وینڈ اسکرین پر سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”ذرا اصل مجھے تمہیں کل اپنے گھر لے کر جانا ہے۔“ جاشم کی بات پر جویریہ ایک دم سے محتاط ہو گئی مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔

”کل میرے پیرش کی شادی کی چالیسویں سالگرہ

ہے۔ ایڈن برگ سے میرا بڑا بھائی اور ساسری سے بہن بھی پہنچ رہی ہے۔ ان دونوں نے پہلے فرسز مصروفیات کا بہانہ بنا کر آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس لیے میرے پیرش کو ان کے آنے کے بارے میں نہیں بتا۔ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر انہیں یہ سربراہ بننے کا پلان بنایا ہے۔“

جاشم جویریہ کو بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کا سا اشتیاق تھا اور مسکراہٹ میں شوخی تھی۔ اس لمحے جویریہ کو وہ چھوٹا سا بچہ لگا جو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر پلان کی ہوئی اپنی شرارت کے بارے میں سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ جویریہ بھی مسکرانے لگی۔ ”اور کون کون ہو گا تمہارے پیرش کی اپنی دوسری پر؟“

”باہر سے تو کوئی نہیں۔ بس اپنے گھر والے ہی ہوں گے۔“ جاشم نے بتایا تو جویریہ سوچ میں پڑ گئی۔

”پھر شاید میرا نام مناسب نہیں ہو گا۔“ جویریہ نے ہنسنے ہوئے عذر پیش کیا۔

”کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میرے گھر والے تمہیں اپنے خاندان کا حصہ ہی سمجھتے ہیں۔“ جاشم نے برہمی سے کہا۔

جاشم کے گھر والے اسے اپنے خاندان کا حصہ کیوں سمجھنے لگے تھے؟ یہ جویریہ کو معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وہاں جانے سے گتر رہی تھی۔

”نہیں جاشم! میں نہیں آؤں گی۔“ جویریہ نے انکار کیا۔

”جویریہ! ملانے مجھے خاص طور پر تمہیں لے کر آنے کو کہا ہے۔ تم نہیں آؤ گی تو انہیں بہت یاموسی ہو گی۔“ جاشم نرمی سے بولا۔

جویریہ کو جاشم کی امی اچھی لگتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں جویریہ کو دیکھ کر امید کے جو رنگ ابھرا کرتے تھے وہ جویریہ کو مترد کر دیتے تھے۔ وہ ان کے گھر جا کر ان کی ایسی توقعات کو بڑھوا نہیں دیتا چاہتی تھی جس پر وہ پوری نہ اتر سکتی ہو۔ مگر دوسری طرف وہ

اس نرم خور اور محبت کرنے والی عورت کی خواہش کو رد کر کے اس کا دل توڑنے پر بھی خود کو راضی نہیں کیا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جاؤں گی۔“ جویریہ نے بے چارگی سے کہا۔ ”مگر مجھے اتنی دور سے لینے کے لیے مت آنا۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی۔“

”چھابا! جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ جویریہ کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے گہرا سانس لے کر بولا۔

”کل شام سات بجے۔ ویر مت کرنا۔“ اس نے جانے سے پہلے جویریہ کو پھر یاد دہانی کرائی اور پھر اپنی گاڑی سمیت برف کی گرتی چادر میں گم ہو گیا۔

جائم کا خاندان عراق پر نوے کی دہائی میں امریکی فوج کے ابتدائی حملوں کے دوران نقل مکانی کر کے یہاں آیا تھا۔ جویریہ ایک دو بار پہلے بھی جائم کے گھروالوں سے مل چکی تھی۔ وہ سنبھلے ہوئے، مہذب لوگ تھے۔ جائم کے والد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ بغداد میں ان کا نام تھا، ساکھ تھی جو جنگ کے دوران ان کے آبائی گھر کی طرح لمبے کاؤ میز بن گئی۔ ساتھ ہی ان کے بچوں کا وہ تہناک اور روشن مستقبل جسے محفوظ بنانے کے لیے انہوں نے عمر بھر محنت کی تھی اسی لمبے سے اٹھنے والی گردوغبار میں کہیں گم ہوتا نظر آیا۔ تب حالات سے مایوس ہو کر وہ اپنے خاندان سمیت یہاں آ گئے اور ایک نئے ملک میں اپنی اور اپنے بچوں کی نئی زندگی کی شروعات کی۔

جائم کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے طب کا ہی پیشہ اپنایا۔ ان میں سے ایک بھائی لندن میں اور ایک بھائی ایڈن برگ کے ایک بڑے اسپتال میں سرجری کے شعبے سے منسلک تھا۔ جائم کی بڑی بہن بھی ایک آرٹھوپڈک سرجن سے بیاہی ہوئی تھی اور سائبریا کے گردونواح میں رہائش پذیر تھی۔

ڈاکٹروں سے بھرے اس خاندان میں اکیلا۔ جائم ہی تھا جو سوشل ورک کی طرف آنکلا تھا۔ اب

تک اس کی زندگی صرف اپنے کام کے گرد ہی گھومتی رہی تھی۔ گھروالوں کے احساس دلانے کے باوجود اسے اپنے شب و روز میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کی جویریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

جویریہ سے مل کر جائم کو پہلی بار احساس ہوا کہ اگر اس بھائی روڑی زندگی میں کسی کا ساتھ مل جائے تو کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ زندگی مصروف سی لیکن اس مصروفیت میں اگر تھوڑی سی خوشبو، تھوڑے سے رنگ بھی شامل ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

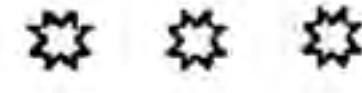
وہ جوان تھا، خوش شکل تھا، خود کفیل اور خود مختار بھی تھا۔ ایسے نوجوان مغرب میں اب ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں رشتہ جوڑنے پر سب راضی تھے مگر رشتوں کو قانونی شکل دینے کا حوصلہ کسی کی میں ہی رہ گیا تھا۔

جویریہ جائم کے ساتھ پچھلے دو سال سے کام کر رہی تھی اور ان دو سالوں کے دوران وہ جان چکی تھی کہ جائم ایک شائستہ اور نفیس انسان ہے۔ جویریہ اسے ایک کولیگ کی حیثیت سے پسند بھی کرتی تھی اور اس کے کام کرنے کے طریقے کار سے متاثر بھی تھی۔ مگر یہ پسندیدگی صرف کام کی حد تک تھی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جائم کی دلچسپی صرف جویریہ کے کام تک محدود نہیں تھی، یہ بات سب ہی سمجھ چکے تھے۔ یہاں تک کہ جویریہ خود بھی۔

جائم ویک اینڈ پر ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے صبا کے لیے نہیں جویریہ کی خاطر آیا تھا۔ وہ اس کے لیے اس سے زیادہ بھی کر سکتا تھا، یہ بات جویریہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے جویریہ جائم کے ساتھ کام کے علاوہ زیادہ وقت گزارنے سے گھبراتی تھی۔

مسئلہ جائم کے ساتھ نہیں تھا۔ مسئلہ جویریہ کے ساتھ تھا جو جائم کی طرف سے ملنے والے واضح اشاروں کے باوجود اب تک اسے کوئی مثبت جواب نہیں دے پائی تھی۔

جویریہ کا دل ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہو چکا تھا اور یہ بات وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں جائم کو جتا بھی چکی تھی۔ جائم کوئی ٹین اینجر نہیں تھا جو قسمیں کھا کر یا رات بھر عشقیہ ایس ایم ایس کر کے جویریہ کو اپنی محبت کا یقین دلاتا۔ بیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سمجھ چکا تھا کہ ایسے فیصلے زور یا دباؤ والے کر نہیں کرائے جاسکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نوجوان محبت کے زخموں کو بھرنے میں سب سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اسے امید تھی کہ جویریہ ایک نہ ایک دن ماضی کے تکلیف دہ شکنجے سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گی اور تب وہ اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو گا۔



جویریہ کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک جائم کے گھر میں ہونے والی دعوت میں الجھا ہوا تھا۔

اس کی توقع کے خلاف جائم کے گھر اس کا اچھا وقت گزارا تھا۔ جائم کی امی نے جن کے چہرے پر جھریوں کے ساتھ شفقت اور اپنائیت کی بھی جھلک تھی اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔

کھانے کے بعد انہوں نے جویریہ کو پرانی البم میں سے جائم اور اپنے دوسرے بچوں کی تصاویر دکھائیں۔ جائم کی ماما اور اس کے خوش مزاج و زندہ دل ڈڈ کے درمیان صوفے پر بیٹھ کر ان پرانی یادگاروں کو دیکھتے ہوئے اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ ان کے گھرانے کا حصہ نہیں ہے۔

چند پرانی تصویریں تھیں جنہیں جویریہ بیٹھ کر دیکھ رہی تھی اور ایک تازہ تصویر تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے بن رہی تھی۔ جائم کے مامی باب، بہن بھائی اور ان کے چاروں طرف روڑتے بھاگتے، کھیلنے کودتے بچے ایک مکمل اور خوش باش خاندان کی تصویر۔

ایسے ہی کسی خاندان کا حصہ بننے کی جویریہ نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ ایسی ہی محبتوں اور چاہتوں کا

حصہ دار بننے کی خواہش جو آج تک کبھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔

کبھی کبھی تو جویریہ کو عبید اللہ جیسے حمال نصیب پر بھی رشک آتا جس سے قدرت نے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد اسے پھر سے ایک محبت کرنے والا خاندان عطا کر دیا تھا۔

جائم کے گھرانے کی پرانی تصویروں میں جویریہ شامل نہیں تھی۔ مگر اب تخلیق ہونے والی تصویر کا حصہ دین سکتی تھی۔

یہ اپنائیت اور لگاؤ سے بھرا خاندان اسے اپنی آغوش میں سمیٹنے کو تیار تھا۔ پھر کیوں وہ اب تک ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ اتنا تو اس کا بھی حق بنتا تھا کہ وہ تھوڑی سی خوشیاں اپنی جھولی میں ڈال لے۔ تھوڑی سی چاہتوں پر اپنا بھی حق جماسکے۔

جویریہ کتنی دیر خالی اسکرین پر نظرس جمائے بیٹھی رہی۔ آخر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے سائیڈ پر رکھافون اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے ایک مروانہ آواز ابھری۔

”آپ کے پراجیکٹ میں میرے لیے ابھی بھی گنجائش ہے؟“ جویریہ نے آہستہ آواز میں استفسار کیا۔

”گنجائش کا کیا مطلب؟ تمہاری جگہ کوئی اور لے سکتا ہے کیا؟“ دوسری طرف سے پروفیسر صاحب بولے۔

”ٹھیک ہے سر! تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ جویریہ نے کہا۔ ”میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہو؟“ پروفیسر صاحب ایک دم بولے تو جویریہ بھونچکی رہ گئی۔

”یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ جہاں مخالف کا زور بڑھایا حالات ناموافق ہوئے وہاں سے فرار اختیار کر لی۔ پر مجھے کیا۔ میرا تو فائدہ ہی ہو رہا ہے نا۔“ انہیں نجات دے کیوں نہی آگئی تھی۔

”بے چارہ جائم بابا!۔“ وہ پھر سنتے ہی چلے گئے۔

جویریہ نے بھنا کر فون بند کر دیا۔

”یہ چکن ٹرائی کر کے دیکھو۔ یہاں کی کڑا ہی کافی مشہور ہے۔“ حذیفہ نے ایک ڈش محب کے آگے سرکاتے ہوئے اس سے کہا۔

”اس کی باری جب آئے گی تو اس کو بھی ٹرائی کر لوں گا۔ تم نے اتنا کچھ منگو لیا ہے کہ چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جائے گا۔“ محب نے جواب دیا۔ ماضی کے دہلے پتلے محب اور آج کے محب میں خلاص فرق آچکا تھا۔ اس کا جسم پہلے کی نسبت کافی بھاری ہو گیا تھا اور آنکھوں پر سنہری فریم کے چشموں نے جگہ بٹلی تھی۔ ”دیئے اب تم سچ سچ کے ڈاکٹر لگتے لگے ہو۔“ حذیفہ نے محب کو چھیڑا۔

”اور تمہیں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔ اب تک دیسے کو پیسے ہو۔“ محب رشک سے بولا۔

”نہیں خیر۔ فرق تو پڑا ہے۔“ حذیفہ نے کہا۔ تبدیلی تو حذیفہ میں بھی آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ محب کی تبدیلی نظر آتی تھی جبکہ حذیفہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

”بھابھی کیسی ہیں؟“ محب نے پلیٹ میں پالک سپر ڈالتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“

”اور بیٹی؟ وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے؟“

”نہیں، سات سال کی ہو گئی ہے۔“ حذیفہ نے مسکرا کر بتایا۔ ”اور تمہارے بچے؟“

”ایک ابھی پانچ سال کا ہوا ہے، دو سراسر اڑھے تین سال کا ہے۔ مستبد معاش ہیں دونوں، ہر وقت منہ بگاڑ کر انگریزی بولتے رہتے ہیں۔“ محب نے منہ بنا کر حذیفہ کو بتایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”تصور ان کا نہیں تمہارا ہے۔ تم ہی انہیں وہاں لے کر گئے تھے۔“ حذیفہ نے کہا۔ محب اپنی فیملی کے ساتھ کافی عرصہ پہلے کینڈا شفٹ ہو گیا تھا اب کئی سال کے بعد اس کا پاکستان چکر لگا تھا۔

”یہاں بار بار میں سوچتا ہوں کہ میرا ہر جانے کا فیصلہ صحیح تھا بھی یا نہیں۔ بعض دفعہ ہم اپنا فیوچر بنانے کے چکر میں کچھ ایسی چیزوں کی قربانی دے دیتے ہیں جن کی اہمیت سے ہم اس وقت واقف نہیں ہوتے۔“

”تو واپس لوٹ آؤ۔“ حذیفہ نے مشورہ دیا۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“ محب نے موضوع بدلا۔ ”تم بتاؤ تمہاری اس دوست کا کیا حال ہے؟“ محب کے ذہن میں اچانک کوئی بھولی بسری یاد آنا نہ ہوئی۔

”کون سی دوست؟“

”دبی جس کا کیس تم مجھ سے ایک بار ڈسکس کرنے آئے تھے۔ کیا نام تھا اس کا۔“ محب جویریہ۔

”کمال ہوتی ہے وہ آج کل؟“ حذیفہ نے حیرت سے کہا۔

”بھولے تو تم بھی نہیں ہو۔“ محب حذیفہ کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”معلوم نہیں۔ کچھ بتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ اب تو کئی سال ہو چکے ہیں۔“ حذیفہ نے بتایا۔

”کبھی کہیں سر راہ ملاقات، کوئی اتفاقہ نہ بھٹیر؟“

محب کو تجسس ہو رہا تھا۔ حذیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”دو تین سال پہلے لندن انڈر گراؤنڈ میں ٹرین پر چڑھتی ایک لڑکی پر اس کا گمان ہوا تھا۔ پر وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ وہ بھلا وہاں کہاں؟“ حذیفہ محب کے سر کے پیچھے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتا ہوا خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ اب وہ محب کو کیا بتاتا کہ کئی بار جس کو وہ اپنی تلاش کا انت سمجھا وہ پاس جانے پر معمولی شبہات کے علاوہ کچھ نہ نکلی۔

اسما کے بستر مرگ پر کیے گئے اعتراف کے بعد سے اسے جویریہ کو ڈھونڈنے کی بے چینی لگ گئی تھی۔

رعنا کے بولے اس جھوٹ کا پول بھی اسی لمحے کھل گیا تھا جس کا سہارا لے کر انہوں نے حذیفہ کو عرشی سے شادی کے لیے رضامند کیا تھا۔ پر حذیفہ نے یہ بات کبھی رعنا کو جتائی نہیں تھی اگر وہ اپنی ماں کو معاف کر سکتا تھا تو رعنا کو بھی کر سکتا تھا۔ دونوں ماؤں نے اپنی

وانست میں اپنی اپنی اولاد کا مستقبل محفوظ کرنے کی سعی کی تھی۔

محب نے حذیفہ کی طرف دیکھا جس کی توجہ کھانے سے ہٹ چکی تھی۔ وہ دیوار پر لگی تصویر میں اپنی بھولیوں کی جھرمٹ میں پائیں باغ کی شہرہ نشین پر استراحت فرماتی مغلیہ شہزادی کے نقوش میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ پینٹنگ کے دونوں طرف دیوار میں بنے طاقچوں میں بجی ہوئی لمبی گردن والی صراحیاں اور سفید براق چاندنی سے ڈھکے اور سنہری کم خواب کے گاؤں کیوں سے بچے پستہ قد تخت جن پر کھانا چٹا گیا تھا۔

محب کو اچانک ہی سارا ماحول انتہائی دیدہ زیب اور دلچسپ لگنے لگا تھا۔

”تم نے ہاتھ کیوں روک لیا۔ یہ لوٹا۔“ حذیفہ کا دھیان پھر سے محب کی طرف ہوا۔ اس نے اپنے فرائض میزبانی ادا کرتے ہوئے ایک ڈش محب کے آگے کی اور بیرے کو تازہ اور گرم نان لے کر انے کا اشارہ کیا۔

کھانے بننے کا سلسلہ بظاہر وہیں سے واپس جڑ گیا جہاں پر تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا، پھر بھی محب اپنے دل سے اس پشیمانی کے احساس کو پوری طرح نہ نکال سکا کہ اس نے نادانستہی میں ایسا قصہ چھیڑ دیا تھا جو شاید اسے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔

عرشی نے انگلی کی مدد سے اپنے سن گلاسز کو واپس آنکھوں کے سامنے کیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

برگد کے بڑے سے بیڑ کے سائے میں دھوپ کی تیز شعاعوں سے خود کو بچا کر کھڑی عرشی کے سامنے خالی میدان کے پار ایک زیر تعمیر عمارت تھی جس کے اندر دو تین فٹ کے فاصلے پر فرش سے لے کر چھت تک گھڑے کیے لے لے ہائیں اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اس عمارت کی پہلی چھت ڈلے زیادہ عرصہ نہیں گزر رہا تھا۔

عرشی کو زیر تعمیر عمارتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس گرمی کے موسم میں طویل چھیل میدان پار کر کے اسے جا کر دیکھنے کا حوصلہ تھا۔ لیکن یہ عمارت یہاں پر ہونے والے ترقیاتی کاموں میں کا حصہ تھی اور جس کا ہر ایک کو معائنہ کرنا یہاں کے مگران محمود اختر صاحب کا خاص شوق تھا۔

عرشی نے دھول، مٹی اور بجری کے ڈھیر کے درمیان سے گزرتے محمود صاحب کی پشت کو دیکھا جو سر پر برستی آگ سے بے نیاز، ساتھ چلتے حذیفہ کو اس عمارت کے تعمیر ہو جانے کے بعد اسے استعمال میں لانے جانے کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔

حذیفہ عموماً ”عرشی کے ساتھ کم ہی کہیں آیا جاتا کرتا تھا مگر آج عرشی بعد اصرار اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ اسے دکھانا چاہتی تھی کہ اس کی مصروفیات اتنی فالتو اور بے کار بھی نہیں ہیں۔ جتنا وہ تصور کرتا ہے۔

اور اس جگہ کے بارے میں عرشی کو ہمیشہ اچھی ہی رپورٹ ملتی آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ جگہ عرشی کی نہیں بلکہ رعنا کی محنت کا نتیجہ تھی۔ رعنا اپنے اس پراجیکٹ کی تکمیل تک زندہ نہ رہ سکیں ورنہ اس آوارے کی کارکردگی یقیناً ”ان کا سرخسر سے بلند کر دیتی۔

رعنا اس پر اسرار بیماری سے صحت یاب ہوئی نہیں پائی تھیں جس کا سیرا ان کے ڈاکٹر ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

رعنا کے ساتھ فلاحی کاموں میں عرشی نے ان کی زندگی میں ہی حصہ لیتا شروع کر دیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد ان کاموں سے منسلک تمام ذمہ داریاں جسے عرشی کو دہرائے میں مل گئیں۔

رعنا کے انتقال کے بعد حذیفہ نے عرشی کے ساتھ برتاؤ میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ زیادتی وہ پہلے بھی نہیں کرتا تھا، اب اس کا رویہ مزید نرم ہو گیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ماں باپ کے گزر جانے کے بعد جس طرح وہ خود اکیلے پن کا شکار ہو گیا تھا عرشی بھی اسی کیفیت سے گزرے۔

حذیفہ یہاں آکر عرشی کی توقع کے مطابق متاثر ہوا یا نہیں لیکن وہ دلچسپی ضرور لے رہا تھا۔ یہ اندازہ عرشی کو دور سے ہی اسے پورے انہماک کے ساتھ بنگے جیسے سفید بالوں والے اختر محمود کی باتیں سنتا دیکھ کر ہو رہا تھا۔

عرشی کو اختر محمود جیسے لوگوں کی قوت برداشت پر حیرت ہوتی تھی جن پر کام دھن میں نہ سردی اثر کرتی تھی نہ ہی گرمی جو کئی سال باہر ٹھنڈے علاقوں میں گزارنے کے باوجود بھی اس عمر میں اس دھوپ کے نیچے یوں آرام سے پھر رہے تھے جیسے کوئی خوشگوار موسم میں باغ کی چمن قدمی کو ٹھکاتا ہے۔

عرشی نے دور کھڑے حذیفہ اور اختر محمود پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے پیچھے بنے سنگل اسٹوری آفس سے متصل کمرے کا رخ کیا جس کی ایک دیوار میں سے آدھے سے زیادہ باہر نکلی جو کورڈ بے نما مشین کے اندر سے نکلتی گڑ گڑا ہٹ عرشی کو یہ تسلی دینے کے لیے کافی تھی کہ کم از کم اس کمرے کا درجہ حرارت اس کی مرضی کے مطابق ضرور ہوگا۔

اس نے اپنے برابر کھڑی بنتو کو گیٹ کے پاس درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑی کی ہوئی گاڑی میں سے منل واٹر کی بوتل لانے کا کہہ کر اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

باہر کی تیز دھوپ سے ایک دم اندر آنے پر عرشی کو کچھ دیر کمرے میں اندھیرے ہیولوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

تھوڑی دیر میں جب عرشی کی آنکھیں صاف دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے نظریں اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ کمرہ اس سینٹر کا کمپیوٹر روم تھا۔ دیوار کے ساتھ ترتیب سے رکھی ڈھیر ساری میز کرسیاں اور ہر میز پر رکھا ہوا ایک عدد کمپیوٹر۔

یہ کمپیوٹر روم باہر سے آنے والی ٹیم کے اصرار پر بنایا گیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں سکھائے جانے والے علوم کو جدید وقت کے تقاضوں سے ہم

آہنگ ہونا چاہیے۔ غریب گھرانوں سے آئی ایسی باصلاحیت لڑکیاں جن میں کچھ نیا سیکھنے کی قابلیت موجود ہو انہیں اس کی بھی تربیت حاصل کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیے تاکہ وہ بھی تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

خود عرشی کی نظر میں یہ چونچلے ان عورتوں کی اوقات سے بڑھ کر تھے جو یہاں پر آیا کرتی تھیں۔ غریبوں کی حیثیت اور ان کے معاشرے میں مقام سے متعلق عرشی کی بڑی مخصوص اور محدودی سوچ تھی۔

عرشی کے علاوہ اس وقت اس لمبوترے کمرے کے اندر ایک اور لڑکی بھی موجود تھی جس نے عرشی کے اندر داخل ہوتے وقت اسے سر کے خفیف اشارے سے خوش آمدید کہا تھا اور جسے آنکھوں کے سامنے چھائے اندھیرے اور داغ پر چڑھی گرمی کے زیر اثر عرشی دیکھ نہیں پاتی تھی۔

پر اب گرمی اور اندھیرا دونوں چھٹ چکے تھے۔ عرشی نے اب دلچسپی کے ساتھ اس سادہ سے پرنٹڈ لان کے موٹ میں ملبوس اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سارے کمپیوٹروں کو باری باری آن کر کے انہیں چیک کر رہی تھی۔

اس نے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا جس میں سے کچھ ٹٹیں نکل کر اس کے چہرے پر آ رہی تھیں۔ عرشی نے آج سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً یہ بھی باہر سے آنے والی ٹیم کا ہی حصہ تھی کیونکہ اس کے انداز میں جو بے نیازی اور خود اعتمادی تھی وہ اکثر یہاں کام کرنے والی چھوٹی موٹی سوشل ورکرز میں نہیں پائی جاتی تھی۔

عرشی کو اس لڑکی میں عجیب سے کشش محسوس ہوئی۔ انتہائی شفاف اجلا چہرہ جس سے کرنیں سی پھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں گہری چپ اور خاموشی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ تب ہی کمرے کا بیرونی دروازہ کھلا اور حذیفہ اور اختر محمود ایک

دوسرے کی معیت میں کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ ”یہ ہمارے سینٹر کا ایک اور نیا اضافہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم عورتوں کو یہ سب سیکھا کر انہیں اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ہم نے یہ ترغیب کبھی نہیں دی۔ ہمارا مقصد خود کفالت ہے خود مختاری نہیں۔“ اختر محمود حذیفہ کو بتاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ حذیفہ کو ابھی اس عمارت کا معائنہ کرا کے لا رہے تھے جس کے مختلف حصوں میں مکمل ہو جانے کے بعد سلائی، کڑھائی اور بنائی کی مشینیں سیٹ کی جانی تھیں اور اب اس سے اگلا اور بہتر قدم کمپیوٹر کی تربیت تھا۔ اختر محمود صاحب کا تبصرہ اب تک جاری تھا۔

”یہ جگہ ہم نے انتہائی کم وقت میں سیٹ کی ہے اور یہ سب جویریہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم اتنے کم وقت میں بھی اس ٹارگٹ کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔“

”جویریہ؟“ اختر محمود اور حذیفہ کی طرف بڑھتی ہوئی عرشی ایک لمحے کو ٹھنکی۔

ایک عام سا نام ہی تو تھا جو کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ مگر یہ وہ نام تھا جو اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی عرشی کو دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔

عرشی نے تیزی کے ساتھ پلیٹ کر کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا جو شاید اٹھ کر نئے آنے والوں کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔

مگر اپنی جگہ سے اٹھ نہیں پائی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عرشی فوراً ”سمجھ گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا صرف نام ہی نہیں بلکہ اس کا پورا وجود ہی عرشی کے لیے خطرہ ہے۔“

عرشی نے لڑکی پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے وحشت زدہ ہو کر حذیفہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ اتنا ہی سفید پڑ چکا تھا جتنا کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا تھا۔

ایسا لگا جیسے زمین کی گردش تھوڑی دیر کے لیے

رک سی گئی ہو جیسے وقت اپنی جگہ ٹھہر گیا ہو۔ اور اس جگہ ہوئے لمحے میں صرف جویریہ اور حذیفہ ہی نہیں وہ بھی شامل ہو چکی تھی۔

اس سارے ماحول میں صرف اختر محمود ہی وہ ایک واحد شخص تھے جنہیں ابھی تک ان قیامت خیز لمحوں کی خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ اس جوش و خروش سے حذیفہ کو سینٹر کی تفصیلات سے آگاہ کیے جا رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہوا تھا کہ حذیفہ کو اب ان کی کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اختر محمود کے علاوہ اب کسی کو بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا یہاں تک کہ عرشی کو بھی نہیں جو پچھٹی پچھٹی آنکھوں سے کبھی بت بنے حذیفہ کی طرف دیکھتی تو کبھی پتھر کی بنی جویریہ کو۔

عرشی کا بس چلتا تو وہ جویریہ اور حذیفہ کے درمیان ایسی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی جو انہیں آپس سے دیکھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی۔

پر اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

”جویریہ!“ حذیفہ کی سانسوں کے ساتھ ٹکٹے والے نام نے اختر محمود کی چلتی زبان کو روک دیا۔

پہلی بار انہیں کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا۔ انہوں نے الجھ کر اپنے برابر کھڑے حذیفہ کی طرف دیکھا جو اب وہاں نہیں تھا۔

وہ جویریہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں جویریہ! اتنے سال کہاں تھیں تم؟“

وہ عرشی اور اختر محمود دونوں میں سے کسی کی بھی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جویریہ کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے باز پرس کر رہا تھا اور جویریہ وہیں دو من سینٹر میں کپڑے اور روٹی سے بنائی جانے والی بے جان پکلی گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں کے زور سے آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو اور جس کے ٹوٹ جانے کا ڈر اسے آنکھیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہا ہو۔

شاید یہ سب کچھ ایک خواب ہی تھا۔ جویریہ نے بند آنکھوں کے ساتھ سوچا اور اگر یہ واقعی خواب تھا تو اس خواب کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے وہ تمام عمر اپنی آنکھیں موندنے کو تیار تھی۔

”جویریہ! آنکھیں کھولو۔ دیکھو میری طرف۔“ حذیفہ نے اس سے کہا۔ یہ خواب کیسے ہو سکتا تھا جویریہ کے کان حذیفہ کی آواز سن رہے تھے جب حذیفہ کے ہاتھوں کی گری اسے اپنے بازوؤں کے اندر حیات بن کر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن اگر یہ آواز یہ وجود حقیقت نہ ہو تو اب کی بار وہ برداشت نہیں کیا کرتی۔

جویریہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا دھندلایا ہوا ذہن تاریکی سے روشنی میں یوں واپس آیا جیسے کوئی غوطہ خور گہرے پانی کو پیچھے چھوڑتا ہوا سطح اور زندگی کی طرف واپس لوٹتا ہے۔

کمپیوٹر روم اور اس میں موجود لوگ ایک بار پھر منظر میں واپس آئے۔

دروازے کے پاس کھڑی خوف زدہ چہرے والی عورت اس کے برابر پریشان ہوتے پروفیسر صاحب اور ان دونوں سے دور اور جویریہ کے بالکل پاس ابھی تک اس کے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے کھڑا حذیفہ۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟“

حذیفہ دنیا بھر کی تھکان اپنے لہجے میں سموئے اس سے ایسے سوال پوچھ رہا تھا جن کا کوئی تسلی بخش جواب جویریہ کے پاس نہیں تھا۔

”میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے ہو۔“

ساری وضاحتیں سارے جواب ایک دم سے بہت بے معنی اور فالتو لگنے لگے تھے۔

اپنی زندگی کے آٹھ قیمتی سال اس نے ایک جھوٹ کی نذر کر دیے۔ وہ اب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی

کہ زیادہ قصور کس کا تھا۔

اس کا جس نے جھوٹ بولایا پھر اس کا جس نے بلا سوچے سمجھے اس جھوٹ کا یقین کر لیا۔

”تم سے یہ سب کس نے کہا۔“ حذیفہ نے چونک کر پوچھا۔ ”اور اگر کہا بھی تھا تو تم نے اتنی آسانی سے کیسے مان لیا۔ کم از کم ایک بار مجھے پکار کر توبہ کیجیے۔“

”پکارا تھا۔ میرے دل نے کئی بار تمہیں پکارا تھا۔ تخلیق کے کرب سے گزرتے ہوئے بھی میں نے بار بار تمہارا ہی نام لیا تھا۔ پر میری آواز تم تک پہنچ ہی نہیں پائی۔“ وہ حذیفہ کو روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ آنسو جو پچھلے آٹھ سال سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے آنکھوں کو جل تھل کرنے لگے۔

”تخلیق کا کرب؟“ عرش کی ذہن میں یہ فقرہ ہتھوڑے کی طرح لگ کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ حذیفہ نے جویریہ کے آنسوؤں سے بھیجے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا خود کا رنگ اچانک ہی بے حد پیلا پڑ گیا تھا۔

”یہ تم کس کی باتوں میں آرہے ہو حذیفہ! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تمہیں ایک بار پھر سے پھنسانے کے لیے مکر و فریب کا جال بن رہی ہے۔“

عرش کا خوف اب ٹھیک ٹھاکہ ہشت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جو کچھ اس کے سامنے ہو رہا تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا اسے ہونے کی وہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

”جویریہ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔ سچ کیا ہے۔“ حذیفہ نے عرش کی مداخلت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جویریہ کو ایک بار پھر سے جھنجھوڑا۔

”جھوٹ بول رہی ہے یہ۔ بکواس کر رہی ہے یہ۔ کسی تخلیق کے کرب سے نہیں گزری۔ تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے ایک نئی کہانی گھڑ رہی ہے۔“

عرش ہدائی انداز میں چلائی۔ اسے اپنی پوری زندگی ریت کی مانند لگنے لگی تھی جسے وہ جتنا زیادہ زور لگا کر مٹھی میں پیچھے رکھنے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی تیزی

کے ساتھ اس کی انگلیوں کے بیچ سے پھسلتی جا رہی تھی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھو۔ یہ بھی اس وقت وہیں تھی جب میں نے تمہارے بچے کو جنم دیا تھا۔“

جویریہ نے عرش کی سمت اشارہ کر کے کہا تو وہ حیرت کے مارے اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جویریہ کا سچ سچ دل غ چل گیا ہے۔ اس نے تو آج سے پہلے جویریہ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

عرش اس بات کو جویریہ کے بالکل پن کی سند کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ضرور کچھ کہتی اگر اس کے عین پیچھے کوئی چیز شخص کی زوردار آواز کے ساتھ دشمن پر نہ کر پڑتی۔

اس آواز پر عرش نے تیزی کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا یہ منسل دائر کی بوتل تھی جس کا ڈھکن استعمال کے بعد ٹھیک سے بند نہیں کیا گیا تھا اور اب زمین پر گری ہوئی اس بوتل میں پانی بہہ کر کمپیوٹر روم کے فرش کو سیراب کر رہا تھا۔

لیکن جس کے ہاتھوں سے یہ بوتل گرئی تھی اس نے اسے اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ بنتو تھی جو عرش کے پیچھے ادھ کھلے دروازے کے بیچ کھڑی ٹھہر کر کانپ رہی تھی۔

”بہشت بی بی۔“ پروفیسر اختر کو بھی مسز ملک کی یہ ملازمہ خاص یاد آئی جو جویریہ کے حمل کے دوران سائے کی طرح اس کے ساتھ چکی رہتی تھی۔

”پوچھو اس عورت سے۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ جویریہ نے روتے ہوئے حذیفہ سے کہا۔

حذیفہ کی نظریں بنتو پر جم گئیں۔

”بولو سچ کیا ہے؟“

حذیفہ کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ بنتو سر سے پیر تک خوف سے لرز گئی۔

بنتو رعینا کی پرانی ملازمہ تھی اور ان ذمہ داروں میں سے ایک تھی جو رعینا کی وفات کے بعد عرش کو درگاہ

میں ملے تھے۔

بنتو کو اس وقت اگر ذرا سی بھی امید ہوتی کہ وہ آج اس سوال کا جواب دیے بنا یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اسی ادھ کھلے دروازے سے پلٹ کر واپس بھاگ جاتی مگر اس بات کو سمجھنے کی عقل اس جاہل اور ان پڑھ عورت میں بھی تھی کہ اب وہ کہیں بھی بھاگ کر چلی جائے سچائی اگلے بتاؤ نہیں سکتی۔

”وہ جی۔ زچگی ہوئی ضرور تھی پر بچہ مر رہا پیدا ہوا تھا۔“ بنتو نے ہٹکاتے ہوئے کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میرا بچہ زندہ اس دنیا میں آیا تھا۔“ اب کی بار جویریہ نے حذیفہ کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں جی۔“ بنتو گھبرا کر بولی۔ ”بچہ مر رہا تھا۔ ہم لوگوں نے اسے خود دفنایا تھا۔ آپ پروفیسر صاحب سے پوچھ لیں۔“

بنتو نے ایک کونے میں کھڑے پروفیسر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ایک نو مولود دفنایا ضرور گیا تھا۔ اتنا تو پروفیسر صاحب کو بھی یاد تھا مگر جس جویریہ کو وہ جانتے تھے وہ اتنی بڑی بات بلا وجہ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ہو رہا تھا اسے دیکھنے کے بعد انہیں بالکل یقین نہیں رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے برسوں پہلے دیکھا۔ وہ واقعی سچ تھا یا پھر فقط ان کی نظر کا دھوکا۔ ایک ایسا دھوکا جو جاں بوجھ کر دیا گیا ہو۔

”نہیں۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے خود اپنے بچے کے رونے کی آواز سنی تھی۔“ جویریہ نے کہا۔

”اس کو غلطی لگی ہے جی۔ یہ تو بے ہوش تھی اس وقت۔“ پروفیسر صاحب کی طرف سے کوئی تائیدی بیان نہ پا کر بنتو سخت شیشیلی ہوئی۔ ایک ماں اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اس کے رونے کی آواز سنی تھی لیکن کسی نے میری بات نہیں مانی۔ سب مجھ سے یہی کہتے رہے کہ

اس کی سائیس اس کے پیدا ہونے سے پہلے بند ہو چکی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟

جویریہ نے حذیفہ کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار روتے ہوئے اس سے وہ سوال کیا جس نے پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دیا تھا۔

پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اس کے تحت الشعور میں گونجنے والی ایک مہین سی آواز کی بازگشت نے نجانے کتنی اندھیری راتوں میں اسے جھٹکے سے بیدار کیا تھا۔

دن کے اجالوں میں بھی نجانے کتنی بار اس کے راہ جلتے قدم کسی بچے کے رونے کی آواز پر بری طرح لڑکھڑائے تھے۔

اور سب بھند تھے کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی؟

حذیفہ کچھ دیر روتی بلکتی جویریہ کے سامنے ساکت کھڑا رہا پھر آہستہ سے اسے خود سے الگ کر کے پیچھے کی طرف مڑا۔

اس کی نظروں میں جو کچھ تھا اسے دیکھ کر عرش خوف زدہ ہو کر اس کے رستے سے ہٹ گئی۔

لیکن حذیفہ کو اس وقت عرش سے کوئی سروکار نہ تھا۔

”اگر بچہ زندہ پیدا ہوا تھا تو پھر یقیناً تم نے ہی اسے بعد میں مارا ہو گا۔ بولو کیسے مارا تھا؟ گلا گھونٹا تھا یا پھر زہر دیا تھا؟“ حذیفہ نے بنتو کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”مم میں نے کچھ نہیں کیا تھا جی۔“ بنتو نے سر سے پیر تک کانٹے ہوئے کہا۔ حذیفہ کی آنکھوں میں اس قدر اشتعال تھا کہ بنتو کی شمی گم ہو رہی تھی۔

”بولو ذلیل عورت! کیا کیا تھا تم نے میری اولاد کے ساتھ؟“ حذیفہ ایک دم دھاڑ کر بولا تو بنتو چیخ مار کر اس کے پیروں میں گر گئی۔

”میں نے اس کو نہیں مارا۔ میں نے تو تمہیں اس کو چھوٹی بی بی کی گود میں لا کر ڈال دیا تھا۔“

کسی ہنستے ہنستے شہر پر تم کرنے کے بعد جو موت کا سناٹا

چہار سو پھیلتا ہو گا ویسا ہی سکوت بنتو کے ان الفاظ کے بعد سارے کمرے پر طاری ہوا۔

”معاف کر دیں صاحب! معاف کر دیں۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں جی۔ جو ملکائی جی نے بولا ہمیں نے وہی کیا۔ معافی۔“ بنتو حذیفہ کے پیروں سے لپٹی گھکیائے جارہی تھی پر اب حذیفہ کو کچھ بھی سننے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اس انکشاف کے بعد سب ہی دم بخود کھڑے تھے۔ خاص طور پر عرش۔

عرش کو لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو۔

”ہنہ۔“ حذیفہ کی ہی بی بی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ عرش نے چکراتے سر کے ساتھ سوچا۔

لیکن اگر گزرے ماہ و سال پر وہ ایمان داری کے ساتھ نظر ڈالتی تو ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں لگ رہا تھا۔

ہنیا کو پارک میں کھلاتے وقت یا بازار میں لے کر گھومتے ہوئے جب اکثر لوگ عرش کے بجائے حذیفہ سے آکر کہتے تھے کہ آپ کی بی بی بالکل آپ پرے تو عرش کو عجیب نہیں لگتا تھا۔ ہنہ ہر وقت تو حذیفہ کی گود میں یا اس کے کندھوں پر چڑھی رہتی تھی۔ ظاہر ہے جو ہر وقت اسے ساتھ لیے پھرے گا لوگ اسی سے یہ بات کہیں گے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جو مماثلت راہ چلتے اجنبیوں کو بھی دکھائی دے جاتی تھی وہ عرش کو کیوں نہ نظر آسکی۔

شاید اس لیے کہ وہ اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی آنکھوں پر بندھی خود غرضی کی پٹی نے اس پر کبھی حقیقت کا اور آگ ہونے ہی نہیں دیا۔

ہنہ کے ہر رنگ، ہر روپ میں اس کا باپ جھلکتا تھا۔ اس کی ہر عادت حذیفہ کا عکس تھی۔

ہنہ کی جن باتوں کو عرش حذیفہ کی نقل سمجھا کرتی تھی وہ اس بچی کا اصل تھیں جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھیں۔

کتنی انسانی بات تھی کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود عرش ہنہ کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کر سکی جبکہ حذیفہ نے اسے اسی لمحے اپنا لیا تھا جب پہلی بار گود میں اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

شاید یہ خون کی مہک تھی جس نے باپ بی بی کو ایک کر دیا اور عرش اتنے سال ان کے ساتھ رہنے کے باوجود کبھی ان کا حصہ نہ بن سکی۔

”تم۔“ حذیفہ پیروں میں گری بڑی بنتو کو نظر انداز کر کے عرش کی طرف مڑا۔ ”تم اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہو یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“ حذیفہ عرش کو دیکھتے ہوئے تنفر سے بولا تو وہ دنگ رہ گئی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ عرش نے شدید حیرت کے عالم میں حذیفہ سے پوچھا۔ جواب میں حذیفہ عرش کو بازو سے گھسیٹ کر جویریہ کے سامنے لے آیا۔

”دیکھو اس کی طرف۔ اور کیا کیا کچھ چھینو گی تم اس لڑکی سے۔ اس کی زندگی کی خوشیاں لے کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی جو تم نے اس کی اولاد بھی ہتھیالی۔ ایک ماں کی گود کو دیر ان کرتے ہوئے تمہارے دل کو کچھ نہیں ہوا؟“

حذیفہ آنکھوں میں نفرت لیے عرش سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ سب میں نے نہیں کیا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ ممی نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہنہ کو کہاں سے لے کر آئی تھیں۔“

”تم مجھ سے یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تمہاری ”ممی“ تمہاری مرضی کے خلاف بھی کوئی کام کر سکتی تھیں۔“ حذیفہ کے لہجے میں اس کی نگاہوں سے بھی زیادہ تنفر تھا۔

”بس کرو عرش! اور کتنے جھوٹ بولو گی مجھ سے۔ اور کتنے دھوکے دو گی۔“

حذیفہ کے انداز میں عرش کے لیے ذرا بھی رعایت نہیں تھی۔ رعنا نے ہمیشہ پیسے کے بل پر سب کچھ خریدا تھا یہاں تک کہ انسانوں کو بھی۔ کلینک کی ڈاکٹر سے لے کر دو من سینئر کی ہیلتھ ورکر تک اور اس کے

علاوہ بھی جانے کتنے لوگ جن کے بارے میں عرش کو واقعی خبر نہیں تھی۔

لیکن ایک بات کا عرش کو اچھی طرح سے پتا تھا اور وہ یہ کہ رعنا نے جو کچھ بھی کیا صرف اس کی خاطر کیا۔ شاید رعنا بذات خود اتنی سنگدل نہ تھیں جتنی عرش کی محبت میں بے بس ہو کر مجبور ہو گئی تھیں۔

رعنا نے حذیفہ کی ہی بی بی کو عرش کی گود میں ڈال کر ہمیشہ کی طرح بہت خطرناک داؤ کھیلنا تھا مگر اس کھیل میں رعنا اکیلی نہ تھیں۔ کچھ ہاتھ اس میں تقدیر کا بھی تھا۔ رعنا کی گود اسی رات سوئی نہ ہوتی جس رات قدرت نے جویریہ کی گود بھری تھی۔

اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ اگر عرش کو ایک جیتے جاگتے بچے کی ضرورت نہ ہوتی تو کیا تب بھی رعنا کو بچہ تبدیل کرنے کا خیال آتا؟

اگر نہیں تو پھر ہنہ کا کیا بننا؟

کیا اسے اس کی ماں کے پاس رہنے دیا جاتا یا پھر رعنا اسے حذیفہ پر حق جتانے کا ذریعہ سمجھ کر جویریہ سے علیحدہ کر دیتیں؟

یہ سارے وہ سوال تھے جن کے جواب رعنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔

رعنا تو اپنے اعمال قبر میں لے کر چلی گئیں اور ان کا نتیجہ بھگتنے کے لیے عرش کو اکیلا چھوڑ گئیں۔

بنتو اب تک فرش پر اکڑی بیٹھی تھی۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور پروفیسر صاحب چپ چاپ ایک کونے میں کھڑے ہو کر وہاں دیکھ رہے تھے جہاں حذیفہ نے اپنے ہانڈے کے حلقے میں روٹی ہونی جویریہ کو سمیٹ رکھا تھا۔

آخر پروفیسر صاحب تھک کر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ان کی کیفیت اس وقت ایک ایسے میر کارواں کی سی تھی جو اپنی سنگت میں سفر کرنے والے لوگوں کو بخیر و عافیت منزل تک پہنچا دینے کے بعد آسودگی بھری تھکان کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پھر یاد آیا کہ وہ آج کا سگریٹ پی چکے

ہیں۔ کوئی پورا ہو چکا تھا۔ ان کے سگریٹ کا بھی اور اس لڑکی کی آزمائش کا بھی جو برسوں سے نارسائی کی آگ میں جل رہی تھی۔

انہوں نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے ڈیوے واپس جیب میں ڈال لی۔

”حذیفہ پلیز۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔“ عرشی نے حذیفہ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ روکنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

حذیفہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو عرشی کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ وہ حذیفہ جسے عرشی کی خوشبو میں بی شہد رنکت، ریشمی زلفیں مائل نہ کر سکیں اب جویریہ کے الجھے سلجھے بالوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھیں موندے سکون سے کھڑا تھا۔

اس لمحے عرشی کو حذیفہ کے چہرے پر الفت و محبت کے وہ تمام رنگ دکھائی دے رہے تھے جو اس کا اتنے برسوں کا ساتھ بھی کبھی لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

عرشی کو ایک دم احساس ہوا کہ اتنے سال تک اپنی جس فتح کے نشے میں وہ چور رہی وہ کس قدر کھوکھلی تھی۔ اس نے حذیفہ کو کبھی جیتا ہی نہیں تھا فقط اس کا خول اپنایا تھا۔ اصل حذیفہ تو کہیں جویریہ کے پاس ہی رہ گیا تھا۔

وہ تو عرشی کا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ کسی کو زبردستی بھی حاصل کیا جاسکتا ہے بھلا؟ اس سارے قصے میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ حذیفہ کو آج یہاں آنے کے لیے عرشی نے ہی مجبور کیا تھا۔

وہ نہ آتا تو کیا ہوتا؟

یہ ایک بے ضرر سا معمول کا ورثہ ہوتا جس کے ختم ہونے کے بعد عرشی اپنی زندگی کے روز مو معمولات کی طرف واپس لوٹ جاتی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ آٹھ سال کی جو

مہلت قدرت کی طرف سے عرشی کو ملی تھی اس کی معیا و پوری ہو چکی تھی۔

حذیفہ کو ہر حال میں آج ساتھ آنا ہی تھا اور جویریہ کو بھی یہیں پر موجود ہونا تھا۔ کیونکہ قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔

عرشی اب اس فیصلے کی بازگشت کو سن رہی تھی جو اتنے سالوں کے بعد لوٹ کر حساب برابر کرنے آئی تھی اور عرشی کو ڈر تھا کہ اگر حساب انصاف کے ساتھ کیا گیا تو اس کے ہاتھ خسارے کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

آٹھ سال میں پہلی بار عرشی کی آنکھوں سے سچ سچ کے آنسو بہنے لگے تھے۔

پھر اس نے مجھ سے کچھ نہیں لیا۔ نہ بنگلہ نہ گاڑی بس فقط اپنی ذات کو میری زندگی سے نکال کر لے گیا۔

دوسرے لفظوں میں مجھے کسی داماں کر گیا۔

ہاں یہ میں ہوں۔ عرشین حذیفہ۔

میں جانتی ہوں کہ اس کے نام کو بھی اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا حق اب مجھے نہیں رہا ہے۔ حذیفہ کے جانے کے کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے اس کی طرف سے طلاق کے کاغذات موصول ہو گئے تھے۔

مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔

جاتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے جتنا غصہ اور جتنی نفرت تھی اس کو دیکھ لینے کے بعد میرا

کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا رہنا حماقت ہوتی۔

میرے ہر جھوٹ، ہر غلط بیانی کو اتنے سال خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والا میری زندگی کے اس سب سے بڑے سچ کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوا کہ اس کی بیٹی کو اپنی ماں سے جدا کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

دل میں اگر کک اشقی ہے تو اس بات کی کہ جویریہ کے ساتھ جڑے جس رشتے کو دوری کے آٹھ طویل سال بھی ختم نہ کر سکے، میرے ساتھ اسی تعلق کو

توڑنے میں حذیفہ نے آٹھ ماہ بھی نہ لگائے۔

میں کہا کرتی تھیں کہ سات سال کم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کو۔ اور اگر میں واقعی کو شش کرنی تو شاید میں بھی حذیفہ کے دل میں اپنا مقام بنا سکتی تھی پھر شاید وہ مجھ سے اتنی بے دردی کے ساتھ نانا توڑنے سے پہلے ایک بار رک کر سوچتا

ضرور۔ اگر وہ مجھ سے اس قدر بدظن نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اب بھی اپنی زندگی میں میرے لیے تھوڑی سی گنجائش نکال لیتا۔

اسے رشتوں کا مان رکھنا آتا تھا۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ جتنا عرصہ میرے ساتھ رہا میں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اب وہ نہیں ہے تو احساس ہوا کہ میں اس کے بنا کچھ بھی نہیں۔

جب وہ تھا تو مجھے اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ نہیں ہے تو میں سرشام گھر لوٹ آتی ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھی اس کی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر اس کے ہونے کے احساس کو اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے ایک ہی جھٹکے میں جویریہ اور میری زندگیوں کو اول بدل کر ڈالا ہو۔ کل تک جو میرے پاس تھا وہ سب اس کا ہو چکا ہے اور جو کچھ میں نے اس سے چھینا تھا وہی میرا مقدر ٹھہرا۔

نارسائی کے اس کرب سے مجھے بھی آشنائی ہو گئی جس کا عذاب وہ لڑکی اتنے سال تک سہتی رہی تھی۔

فرق صرف یہ ہے کہ جویریہ کی سزا تو آٹھ سال کے بعد اختتام پذیر ہو گئی، لیکن کیا میری اس قید تنہائی کا کبھی کوئی انت ہو گا؟

کچھ دن پہلے مجھے ان دونوں کے ہاں جڑواں بیٹوں کے پیدا ہونے کی خبر ملی تھی۔ میں خوش ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں وہ بھی خوش ہو گا۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں۔

پنہ کو بھی ان دونوں نے بورڈنگ اسکول کے بجائے ریگولر اسکول میں داخل کروادیا ہے تاکہ وہ بھی

علم بچوں کی طرح زیادہ سے زیادہ وقت اپنے باپ کے ساتھ گزار سکے۔ اسکول کے خشک ماحول کی جگہ اب اسے باپ کا پیار ملے گا جو اس کا حق اور ضرورت ہے۔

باپ کی توجہ اور پیار تو پنہ کو شروع دن سے ہی حاصل تھی البتہ پنہ کے دل کی سلیٹ کا مل والا حصہ تو کورائی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جویریہ بہت پیار سے اس پر اپنا نام کندہ کرے گی۔

میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا کسی سے ملنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں جاتی ہوں۔ کام بھی کرتی ہوں۔ مئی کی این جی او کی ساری ذمہ داری اب میرے کندھوں پر ہے۔

سب لوگ کہتے ہیں کہ مسز عنا کی بیٹی ان ہی کی طرح خدا ترس اور بے غرض ہے۔ دیکھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینا الی۔ مگر سب غلط کہتے ہیں۔

میں بے غرض نہیں ہوں۔ دیکھی انسانیت کی خدمت میں بھی میری اپنی غرض شامل ہے۔

حذیفہ نے ایک بار کہا تھا کہ عرشی! تم دو سروں کا بھلا کرو گی تو خدا تمہارا بھلا کرے گا۔

مجھے خدا سے کس بھلے کی امید ہے؟ یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم، پھر بھی میں اس آس پر لوگوں کا بھلا کیے جا رہی ہوں کہ کبھی تو خداوند کریم کو میری حالت پر رحم آئے گا۔

کبھی تو میرے دل کی بے چینی اور کک ختم ہوگی۔ کبھی تو وہ مجھے بخش کر میرے گناہوں کا بوجھ میرے ضمیر سے ہٹائے گا۔

کبھی تو۔



ایلیا یقین



پر چڑھ کر دیوار کے اس حصے پر چڑھ جاتی تھی جہاں دو چار گھلے تھے اور درمیان میں کچھ خالی جگہ تھی پھر وہاں سے ہمارے ہاں جھانکا کرتی تھی۔ شروع میں تو میں خاصی جربز ہوئی، لیکن مروتا خاموش رہی، پھر وقت کے ساتھ ساتھ عادی ہو گئی۔

”کل مسز کمال، شہلا کا رشتہ مانگنے گئی تھیں۔“ اس نے خبر دی۔

”پھر؟“ میں نے دلچسپی چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھا۔

”پھر کیا ہوتا تھا؟“ بین نے مسز کمال کو گھر سے نکال دیا بہت شور مچا، تم نے نہیں سنا؟“

”نہیں! میں تو سو گئی تھی۔“ وہ جانتی تھی کہ میں جلدی سونے کی عادی ہوں۔

”اچھا۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ”تم بین کو سمجھاؤ تو سہی، اچھا رشتہ ہے غور تو کرنا چاہیے۔“

انکار کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب وہ میری اور بین کی اچھی سلام دعا کا فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔

بین باجی پچھلی گلی میں رہتی تھیں اور اوہیڑ عمر خاتون تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں شہلا اور نائلہ۔ ان کے شوہر فاروق صاحب کو دو برس پہلے اچانک دل کا دورہ پڑا تو سیر نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ بس اسی وجہ سے وہ ہمیشہ ہم سے احسان مندی سے ملتی تھیں۔

دورہ محلے میں ان کے تعلقات محدود تھے اور ہاں! میرے تینوں بچے شہلا ہی سے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ میں نے اچھا کہہ دیا اور وہ مجھ سے رخصت لے کر مسز کمال

”جنگل میں آگ لگ جائے تو کیا کرتے ہیں؟“ سیر نے کشن بازو کے نیچے رکھ کر بازو کو موڑ کر سر کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے دیکھا اب وہ اپنے گفتگرایا لے بالوں والا سر ہاتھ پر ٹکا چکا تھا۔

”آگ کے درخت کاٹ کر ادھر سے ہٹا دیتے ہیں تاکہ آگ نہ پھیلے۔“ میں نے جواب دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی، جس پر یقیناً ”میرا سائیکائرسٹ شو ہر خود بھی سیدھے ہو کر لیٹ گیا ہو گا۔“

سیر کو رات کو جاگ کر فطرت کے اصولوں اور نظریوں پر گفتگو کرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ ہر بات کو ہر مسئلے کو گفتگو سے حل کر لیتا ہے، بلکہ وہ اتنا معتدل مزاج ہے اور اتنی اچھی گفتگو کرتا ہے کہ معاملات بگڑتے ہی نہیں۔ جب میں نئی نو ملی ولسن تھی تب میں پورے ذوق و شوق سے اس گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھی، لیکن اب جبکہ میرے تین بچے ہیں، میرے پاس اس کے لیے فرصت نہیں یا پھر نیند غالب آجاتی ہے۔ شاید عظمیٰ سچ کہتی ہے کہ میرا معیار بھی گر چکا ہے۔ کیونکہ ایک باشعور شخص کے ساتھ نظریات پر گفتگو کرنا اور چیز ہے اور پڑوس اور میکے میں سسرال کی برائیاں کرنا اور پڑوسیوں کو لڑوانا اور بات ہے۔

صبح سیر بازو پر سر رکھے کروٹ کے بل ویسے ہی سو رہا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہی پچھلے دن والی روئین شروع ہو گئی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد دوسرے میں بچوں کو کھانا کھلا کر ٹیوشن بھیجا۔ صبح سے اندر آئی رہی تھی کہ ساتھ والی ٹینے نے آواز لگائی۔ وہ اپنی سیڑھیوں

چاہیے۔ کہہ دیجیے گا آپ ان کو۔“ وہ چائے لاتی فائرہ کو نظر انداز کر کے لوٹ گئیں۔

سیر یہ ساری صورت حال دیکھ کر مسکرائے لگا اور سالن پر چاول ڈالتے ہوئے بولا۔

”تم اس بات پر ایسے ہی مٹی ڈال دو جیسے میں لوکی گوشت پر چاول ڈال رہا ہوں، پھر اسے کس بھی کرو۔“

میں خاموشی سے بچوں کے سونے کا انتظار کرتی رہی، پھر فاسغ ہو کر کمرے میں گئی۔ میں سیر سے یہ الجھن سلجھوانا چاہتی تھی۔

”کیا ہو جاتا اگر بین باجی بے عزتی کر کے مسز کمال کو گھر سے نہ نکالتیں تو۔“ میں بولی۔

”مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ پنڈو نے متوجہ ہو کر کہا۔ وہ سچ مچ پنڈو ہے۔ کیسے یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤ گی۔ فی الحال میں نے اس کو ساری بات بتادی جو مجھے شینہ نے بتائی تھی۔

”ارے! میں تو رات بارہ بجے تک جاگ رہا تھا میں نے تو کوئی شور نہیں سنا اور ہمیں کیا پتا کہ دونوں میں کیا بات ہوئی ہے۔ مسز کمال نے جا کر کیا کہا اور شور تو بالکل بھی نہیں سنا میں نے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

کے گھر چلی گئی جو سامنے تھا۔ مسز کمال کا بیٹا تین برس پہلے دیہی گیا تو ان کے ہاں خوش حالی آگئی اس کی ضد تھی کہ شادی شہلا سے ہی ہو۔

رات کو عجیب اتفاق ہوا۔ سیر آیا تو دروازے پر پیچھے پیچھے ہی مسز کمال بھی داخل ہوئیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہا تو وہ برآمدے میں ہی بیٹھ گئیں۔ برآمدے کے اکلوتے تخت پر، جس کے علاوہ برآمدے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ اسی پر نظر ڈال کر گویا ہوئیں۔

”آپ نے بین سے بات کی کہ میرے رشتے پر غور کرے؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

”وہ تو میرا بیٹا سر ہو گیا ہے ورنہ میں کیوں اس سے رشتہ جوڑوں۔ اسے تو کوئی تمیز ہی نہیں، نہ کھانے کو

ہوتا ہو گا گھر میں۔ ہم تو گاڑی میں رشتہ لینے گئے تھے۔ ان کے پاس تو سائیکل پر بھی شاید ہی کوئی رشتہ لے کر آئے۔“ پھر آخر میں بولیں۔ ”آپ انہیں مت

سمجھائیں۔ لیکن انسان کو اپنی حالت دیکھ کر بات کرنی

سمیر بھی کسی بات پر رنج نہیں ہوتا تھا۔ وہ میری اکلوتی پھوپھو کا بیٹا ہے۔ جن کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی اور ابو اور پھوپھو ایک دوسرے کے اکلوتے بہن بھائی ہیں تو انہوں نے مزید ایک رشتہ تشکیل دینے کے لیے سمیر اور میرا انتخاب کیا۔ اب ہماری ہفتہ وار چھٹی امی کے گھر اور لمبی چھٹیاں پھوپھو کے ہاں گزرتی ہیں۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ سمیر مزاجاً بالکل پینڈو ہے۔ وہ پلیٹ میں سالن ڈال کر اوپر سے چاول ڈالتا ہے۔ اس کے کپڑے استری نہ ہوں تو خفا نہیں ہوتا، لیکن میں اسے سال کے تین سو پینسٹھ دن پراٹھا پکا کروں تب بھی اس کی ممنونیت میں کمی نہیں آتی اور وہ روزانہ اتنی ممنون نظموں سے میرا شکریہ ادا کرتا ہے جیسے یہ پہلا پراٹھا ہو شاید اس لیے کہ میں پینڈو آدمی کی شہری بیوی ہوں۔ اسے اپنے پینڈو ہونے پر فخر ہے اور مجھے پینڈو کی بیوی ہونے پر۔

بچوں کے امتحان ختم ہوئے تو ایک ہفتے کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں بچوں کے ساتھ سررال چلی آئی۔ بھرے پرے سررال میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ دو جیٹھ، تین نندیں، پھر پھوپھا کے رشتے دار الگ۔ اتنے بڑے خاندان میں ہفتہ دن کی طرح گزر جاتا لیکن سمیر کے لیے یہ وقت خاصا طویل ہو جاتا تھا کیونکہ میں سررال جاؤں تو وہ اپنے سررال میں غمر جاتا ہے یعنی میری امی کے گھر۔

ایک ہفتہ گزار کر سمیر کے ساتھ ہم واپس آگئے۔ چھوٹے سے محن میں دیواروں کے ساتھ کیا ریاں اور گھر کے دروازے سے برآمدے کی جلی کے دروازے تک راستے کو چھوڑ کر دونوں اطراف میں گھاس لگی ہوئی تھی۔ گھر کا یہ حلیہ دیکھ کر مجھے برا غصہ آیا۔ اب گھراٹا بڑا بھی نہیں تھا کہ لان چٹا، لیکن اب کیا کیا جائے کہ سمیر آخر پینڈو ہے۔ میں نے موڈ آف کر کے لڑنا چاہا تو یہ بھی ممکن نہ ہوا کیونکہ اب آخر چم چم ایک ہاتھ سے تو کھیلنا نہیں جاسکتا۔

میں نے گھر کی اس درگت کا سبب جانتا چاہا تو وہ سر میں تل بہاتے ہوئے بولا کہ شہر میں رہ کر وہ بڑی اداسی

محسوس کرتا ہے اس لیے چھوٹا سا کھیت تو ہونا چاہیے۔ یعنی اب میں پینڈو کے لیے سبزیاں گھر میں اگاؤں تاکہ اسے گاؤں جیسا محسوس ہو۔ پہلے پہل تو میں جھنجھلائی لیکن پھر تازہ دھنیا کاٹ کر سالن میں ڈالنا مجھے خود اچھا لگنے لگا اور توری، بینگن، کرلیے اور ٹنڈے خود اگا کر پکانے میں بھی بہت مزا آیا۔ آہستہ آہستہ ”کھیتی باڑی“ میری روٹین کا حصہ بن گئی اور میں ”شہری پینڈو“ بن کر سبزیاں محلے والوں کو تحفہً بھیجنے لگی۔

پھر ایک روز سمیر نے مجھے کہا۔ ”یار رانیہ! تم بچوں کو گھر میں ہی پڑھا لیا کرو۔ بچے اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پڑھے لکھے ماں باپ انہیں وقت نہیں دیتے۔“ یہاں وہ ماہر نفسیات کی زبان بول رہا تھا۔

”میں شک ہوتا ہوں گا کہ ہم نے محنت کر کے نہیں پڑھا درنہ خود ہی پڑھا دیتے ان کو۔“ یہ جذباتی بلیک میلنگ تھی۔ ”دیکھو! سائنس، معاشرتی علوم، کمپیوٹر اور سندھی تم پڑھا لیتا اور اسلامیات، اردو، ریاضی اور انگریزی میں دیکھ لیا کروں گا۔“

مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔

فائزہ آنکھیں جماعت میں تھی رنجہ چھٹی میں اور احمد تیسری میں۔ شروع شروع میں مجھے اس نئے تجربے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں تھوڑا وقت لگا۔ دھیرے دھیرے میرے بچے مجھ سے قریب ہو گئے۔ البتہ اب ٹینینے دیوار سے لٹک کر ہمارے گھر جھانکنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب میں سارا دن ہی مصروف ہوتی اور مجھے وقت ہی نہ ملتا۔

اور جب کبھی تینوں کا ہوم ورک کم ہوتا تو میں انہیں عظمیٰ اور کبریٰ کے گھر لے جاتی۔ اونٹنگ بھی ہو جاتی اور بچے بھی خوش ہو جاتے۔ پہلے یوشن کی وجہ سے صرف التوار کا دن ہی فارغ ہوتا تھا اب تو میں بہت عرصے بعد ٹینینے کے گھر بھی ہو آئی تھی جو اسکول کے نالنے سے میری گہری دوست تھی۔ اب مجھے کسی

طرح بھی محلے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ٹینینے نے میرے کھیت میں صبح صبح آکر تپا یا کہ شہلا کے لیے کوئی رشتہ آیا تھا۔ ان لوگوں نے انکوائری کے لیے ٹینینے سے بات کی تھی اس لیے کہ وہ لوگ اس کے کسی رشتہ دار کے خاندانی دوست تھے۔ تب ٹینینے نے انہیں مسز کمال والا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ جس پر رشتہ نہ ہو سکا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ مجھ سے بھی کچھ خفا تھی کہ میں نے اتنی مصروفیات پال لی ہیں کہ میرے پاس اس کی بات سننے کا اب وقت ہی نہیں بچتا۔ میں نے اسے ملامت کرنا چاہا کہ اس نے شہلا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”سین اتنی بد اخلاق ہے اور ویسے بھی میں مسز کمال سے تعلقات خراب نہیں کر سکتی کیونکہ وہ مجھے ترکیبیں بتاتی ہیں۔“

میں اس کی بے حسی کا اندازہ کر کے خاموش ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر کی چند باتیں کر کے لوٹ گئی لیکن میرا ذہن شہلا کے معاملے میں ہی اٹکا رہا۔

رات کو ہم بچوں کو شب بخیر کہنے کے بعد اپنی خواب گاہ میں آئے تو میں سمیر سے آج کے واقعے پر تبادلہ خیال کرنے لگی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق پوری توجہ سے مجھے سنتا رہا۔ پوری بات سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی بے چینی چھیل گئی۔

”یہ شہری عورتوں کا مسئلہ ہے اور کچھ عورتوں کی نفسیات۔ شہر میں گھر میں رہنے والی عورتیں یکسانیت اور فراغت سے بہت عاجز آجاتی ہیں رانیہ! وہ سارا دن گھر میں رہتی ہیں۔ نہ اونٹنگ ہوتی ہے نہ کوئی تفریح۔ بڑے شہروں میں تو رشتے دار اور ملنے جلنے والے اتنی دور رہتے ہیں کہ ان کے گھر جانا مشکل ہوتا ہے اور انسان تو سماجی حیوان ہے پھر وہ محلے میں ہی اپنی سہیلیاں بنا لیتی ہیں اور محلے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب رہات میں عورتیں کھیتوں میں جاتی ہیں۔ رشتے دار قریب قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ

سازشیں نہیں ہوتیں۔ سلائی کڑھائی میں اور مختلف کاموں میں مشغول رہتی ہیں تو اس طرح کا جس زندہ ماحول نہیں ہوتا ان کی زندگی اور روٹین میں حرکت ہوتی ہے۔ شہری عورتیں جو گھروں میں رہتی ہیں ان کی زندگی بہت بور ہوتی ہے۔ وہ ادب جاتی ہیں۔ ان کی تفریح اسی طرح کی باتیں بن جاتی ہیں۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔

”سین باجی تین یار میرے پاس آچکی ہیں۔ وہ بھی ادب چکی ہیں لیکن تنہائی پسند ہیں۔ اب مسز کمال کا بیٹا ہزار جان سے شہلا پر عاشق ہے اس کا کردار جیسا بھی ہو لیکن مسز کمال ہر وقت اپنی امارت جتاتی رہتی ہیں تو سین باجی کیسے اپنی بیٹی کی شادی ادھر کر دیں؟ اور خواجواہ انہوں نے اس لڑکی کا اثر بھی خراب کر دیا ہے۔ یہ بات محلے میں اتنی مشہور ہے کہ اب کوئی بھی رشتہ آئے تو یہ مفت کی بدنامی ان کے سر لگ گئی۔ کوئی لڑکی بدنام ہو جائے تو سوچو اس کے گھر والے کیسے ناکرہ گناہ کے مجرم بن جاتے ہیں؟“ اس نے حسب عادت بڑی تفصیل سے مجھے سمجھایا۔

”تمہیں پتا ہے جنگل میں آگ لگ جائے تو اسے آگے کے درخت کاٹ کر قابو کر سکتے ہیں۔ لیکن عورتوں کی زبان پر کوئی ایسی بات آجائے تو اس کا کیا کریں؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا اس نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ دنوں میں تم بھی ٹینینے کے ساتھ ان چکروں میں پڑ جاؤ گی۔ تم نہ بھی چاہتیں تو وہ تمہیں گھیر گھار کر ان ہی کاموں میں لگا دیتی۔ پھر شاید تم بھی انتقامی کارروائی کرتیں اور عمر بھر کے لیے ان چکروں میں پڑ جاتیں۔ اس لیے میں نے چاہا کہ تمہیں باغبانی کی طرف اور بچوں کی طرف لے آؤں تاکہ تم اس دلدل سے بچ جاؤ۔“

وہ اب بھی اسی انداز میں لیٹا تھا، تکیے پر کھنی نکا کر ہتھیلی پر سر رکھے۔ مجھے اس کی چالاکی پر بڑا پیار آیا اور میں اس سے واقعی متفق ہوں۔ کہیے! آپ کا کیا خیال ہے؟

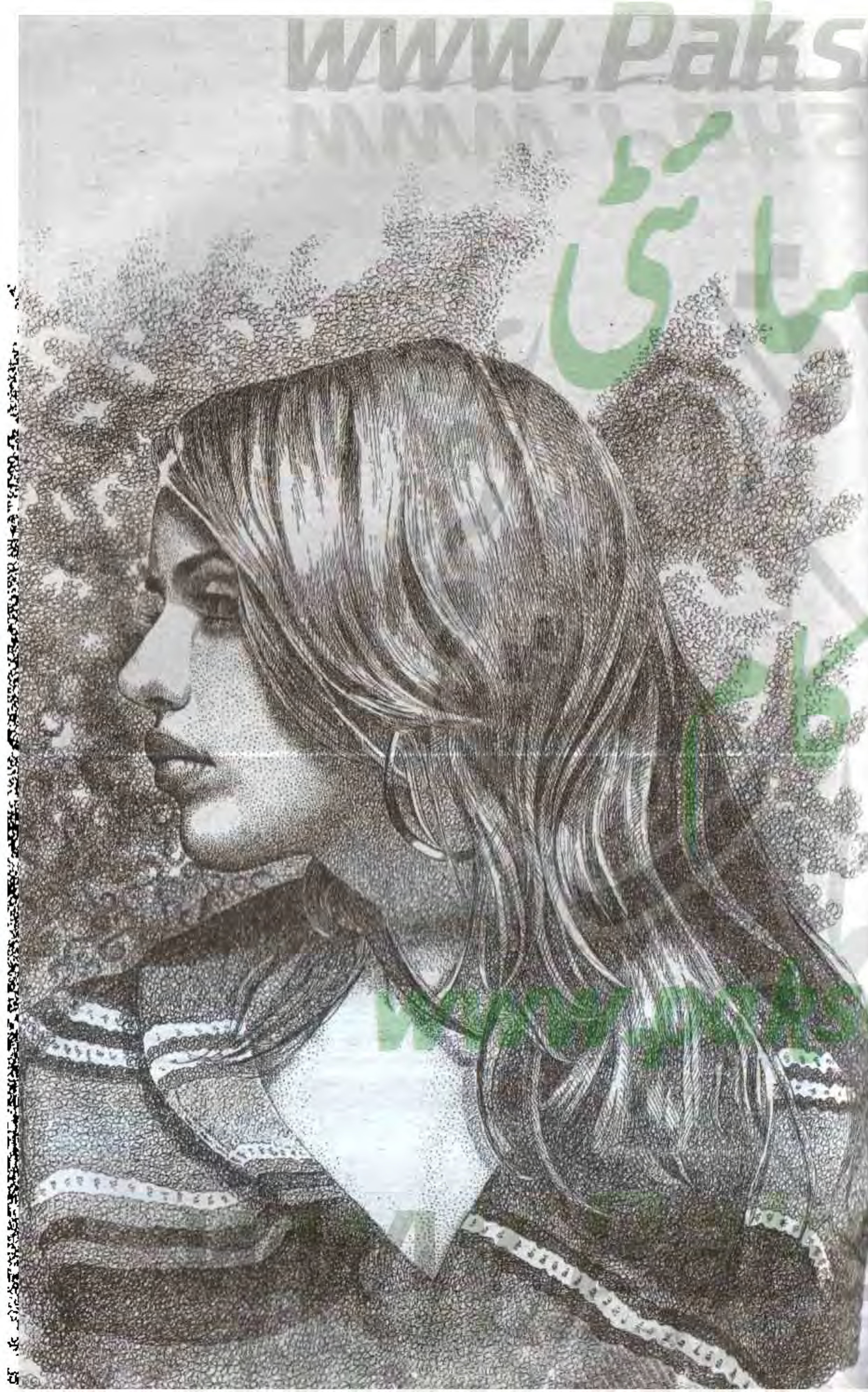


دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا روالہ اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی ”جنت“ کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم ”اس“ کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لپٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تحکک کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمنہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں تو قیر صاحب کے بتائے گئے جنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ لیض کے دوست تو قیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

نہیہہ العباس طبعاً ”سخت گیر اور غصہ ور نوجوان“ ہے، جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



چھپی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت باللاں ہے۔ شبیبہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیبہ تنوی کا منگیتر ہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیبہ العباس ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیل بنا دیا۔ وہ انبیا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے نجیست نہیں بھائی فلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبیا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو بیٹھ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار بننے پر بیگم دانیال، شبیبہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو شبیبہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو جوت لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر وادارے گا۔

اتفاقاً "ماوی" کا نکر او شبیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجھلاہٹ میں شبیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شبیبہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ شبیبہ کا روز ایک سیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر شبیبہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً "ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ شبیبہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ شبیبہ ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور شبیبہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیا دل بادل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب شبیبہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی "ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، اما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے شبیبہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق و حق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوس کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں، ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے دے دیے سے جنت کے اندر پہنچنے والی متقی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہنگ آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

شبیبہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق بٹختی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیبہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ شبیبہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ جو بھی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیبہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد انھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن شبیبہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی شبیبہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو وہی معذور تھا۔ شبیبہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کر چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

شبیبہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیبیسی حرکت میں آجائے گی۔ شبیبہ نے ماوی سے کہا کہ وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو شبیبہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔

۲۲ بائیسویں قسط

"ذمیر عروش! مجھ سے دوستی کرنے کے لیے تمہیں سروش کے نام کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں اور دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ تم جو نہیں کہتیں تمہاری آنکھیں کہہ دیتی ہیں اور تمہاری آنکھیں صرف محبت کی زبان بولتی ہیں۔ میں تمہاری محبت اور دوستی کی قدر کرتی ہوں اور اس محبت میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔ پلیز! اس خط کا جواب جلدی دینا۔

صرف اور صرف تمہاری۔ جنت۔

شبیبہ العباس کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی پھر ناپسندیدگی اور جھنجھلاہٹ دکھائی دینے لگی۔ بھڑکنے کے لیے تو یوں بھی اسے کم ہی باتوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب تو پھر بھی متن الجھانے والا تھا۔ اس پر سے غضب یہ ہوا کہ تنوی بھی اسی وقت اپنی نوٹ بک کی تلاش میں آگئی۔

"وہ شبیبہ بھائی! میری نوٹ بک آپ کے روم میں رہ گئی تھی شاید۔" تنوی نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

شبیبہ نے پلٹ کر کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

"شاید نہیں۔ یقیناً۔" ساتھ ہی نوٹ بک اس کی طرف بڑھادی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" کھلا ہوا صفحہ اس کے سامنے تھا۔ تنوی نے ذرا سی حیرت کے ساتھ نوٹ بک پکڑ لی پھر پٹا مٹی۔

"نہیں۔"

"تم لو کیوں کو دوستیاں کرنے سے فرصت نہیں ہے۔" شبیبہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ یہ میری فرزند نے مذاق میں لکھ دیا تھا۔" تنوی نے سر اسید ہو کر وضاحت پیش کی یا محض کوشش ہی کی

تھی۔
 "یعنی ایک اور وہابیات فریڈ تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے؟" شبیبہ نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ تنوی کا جھکا ہوا سر اتنا جھک گیا کہ ٹھوڑی ہی ہنسی کی ہڈی سے ٹکرانے لگی۔
 "میری بات کان کھول کر سن لو! فوراً" سے بیشتر اپنی دوستیاں محدود کرلو۔ میں نے تمہیں کالج میں ایڈمیشن سے پہلے بھی سمجھا دیا تھا کہ کسی اوٹ پانگ سرگرمی کی خبر نہ ملے مجھے۔ اور پھر بھی تم ایسی چیپ لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھتی پھر رہی ہو۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" آنسو پہلے نکلے لفظ لبوں سے بعد میں ادا ہوئے تھے۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں میری فریڈ نے مذاق میں لکھ دیا تھا۔"

شبیبہ مزید چڑ گیا۔
 "اسی لیے میں تم سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ آنسوؤں کے بغیر تو تمہیں بات کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ اونہ۔ جاہل!"

تنوی کی ہچکیاں ہی بندھ گئیں۔
 "گیٹ لاسٹ۔ جسٹ گیٹ لاسٹ۔" شبیبہ نے چنگھاڑ کر کہا۔ "اور اگلی بار مجھے اپنی شکل تب دکھانا جب ان آنسوؤں سے چھٹکارا حاصل کرلو۔"
 تنوی سر ہٹ باہر بھاگی۔ شبیبہ بے وجہ غصے سے کھوتا رہا۔

ماویٰ اپنی ہی جھونک میں تھی۔ تنوی غم زدہ اور حواس باختہ۔
 راہداری کے کنارے بری طرح ٹکرا گئیں۔
 "ارے بھئی! دھیان سے۔" ماویٰ نے ہی کچھ حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی گرنے سے بچایا تھا۔

"چوری کی ہے یا محض تفریح کے لیے بھاگ رہی ہو؟" حسب عادت ماویٰ نے سنجیدگی کے ساتھ انتہائی غیر سنجیدہ سوال جزا۔ تنوی کے پہلے ہی حواس درست نہیں تھے "آن کی آن اور بھی ہونق نظر آنے لگی۔
 ماویٰ نے بغور اسے دیکھا پھر تعجب سے بولی۔

"ارے! تم تو رو بھی رہی ہو۔" استفسار تھا یا محض بات برائے بات تنوی سمجھی نہیں۔ یوں بھی تازہ تازہ جھاڑ کھا کر نکلی تھی۔ سمجھ بوجھ نے تقریباً "تقریباً" ساتھ چھوڑی رکھا تھا۔
 "کچھ تو بولو تنوی! ہوا کیا ہے آخر تمہیں؟"

لیکن تنوی نے جواب دینے کے بجائے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے نفی میں سر ہلادیا۔
 "تو پھر کیا جسٹ فار داسک آف فن رو رہی ہو؟" ماویٰ نے زور دے کر پوچھا۔ لیکن تنوی مستقل نفی میں سر ہلاتے تیزی سے تقریباً "بھاگتے ہوئے آگے نکل گئی۔"

"عجیب لڑکی ہے۔" ماویٰ نے کندھے اچکا کر سوچا اور آگے کی طرف چل دی۔ یوں ہی چلتے پھرتے گھومتے گھاتے حویلی کے آرکیتک چور غور کرتے ہوئے اسی طرف آگئی جس طرف پچھلی بار حویلی کی بھول بھلیوں میں کھو کر پہنچ گئی تھی۔

وہی برآمدے کی سیڑھیاں سامنے احاطہ مینواں درخت اور تین اطراف میں بنے کمرے۔

عجیب سا اسرار چھا تھا اس حصے میں جو یک وقت اسے اپنی طرف کھینچتا بھی تھا اور دور رہنے پر مجبور بھی کر رہا تھا۔ معا" سے وہی لڑکی دکھائی دی۔ ماویٰ اسے دیکھ کر غیر ارادی طور پر محتاط ہو گئی۔
 "لگتا ہے آپ آج پھر راستہ بھول گئی ہیں۔" وہ لڑکی ماویٰ کے پاس چلی آئی۔ "آئیں بی بی! آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔"

ماویٰ نے محسوس کیا وہ پچھلی بار سے کہیں زیادہ پر اعتماد دکھائی دیتی تھی۔
 "ایک بار راستہ بھولنے کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ ہر بار۔ ایسا ہی ہو۔" ماویٰ نے بظاہر ہنس کر لیکن معنی فیزی سے کہا۔ "اور میرا خیال ہے اس بار تو میں بالکل صحیح جگہ پر پہنچی ہوں خیر۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"تسینم۔" اچھا نام ہے۔ "ماویٰ نے سرسری سی نظریں اس پر ڈال کر بند دروازوں کو دیکھا۔
 "ان بند دروازوں کے پیچھے کیا ہے تسینم! جو تم ان کی اتنی حفاظت کرتی ہو؟" گو کہ اس کا انداز سرسری تھا۔
 "راز ہیں بی بی!"
 "س۔ کیا مطلب؟"

تسینم ہنس دی۔
 "ہر حویلی کے کچھ راز ہوتے ہیں بی بی! جن سے حویلی والے واقف ہوتے ہیں یا حویلی کے ملازم۔ باہر والوں کو ان رازوں سے آشنائی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان بند دروازوں کے پیچھے بھی راز چھپے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ مانیں ان دروازوں سے دور رہی رہیں۔"

"ان ہی رازوں سے پردہ اٹھانے تو میں یہاں آئی ہوں اور میرا دل کہتا ہے تسینم! ان بند دروازوں کو کھولنے میں تم ہی میری مدد کرو گی۔" ماویٰ نے گہری پرسوج نظریں تسینم کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔
 "آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں بی بی! میں آپ کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔"

"نہیں! فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اب میں اکثر تمہیں زحمت دوں گی۔ سمجھیں؟ نہیں نا؟ اچھی بات ہے کچھ معاملات میں کچھ لوگوں کی سمجھ کم ہو تب ہی بہتر رہتا ہے۔ اچھا! میں چلتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر تسینم کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے رستے چل دی۔

تسینم اب بھی ہونق نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ یہ لڑکی رجب علی کی بیٹی ہے یہ خبر گھومتے پھرتے اس تک بھی پہنچ ہی گئی تھی اور دل ہی دل میں اس نے بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی کیونکہ ماویٰ کا ہاتھ اسے عقل کی طرف سے تھوڑا تنگ لگ رہا تھا۔

یہاں سے ہٹ کر جس وقت ماویٰ محرم کے کمرے میں پہنچی تنوی اس کے کندھے پر سر رکھے زار زار رو رہی تھی۔ حرم اسے پیار سے سہلا رہی تھی جبکہ غم غصے سے یہاں وہاں ہل رہی تھی۔
 "چلو۔ ابھی بڑے ابا سے بات کرتے ہیں۔ آخر! شبیبہ بھائی کو کس نے اتنا اختیار دیا ہے کس۔"

"ارے ماویٰ! آؤ نا۔ دروازے میں کیوں کھڑی ہو؟"
 ساتھ ہی ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں نمل کو اشارہ بھی کیا کہ خاموش رہے، لیکن نمل، حرم جیسی صلح جو اور معاملہ فہم بھی اور نہ ہی تنوی جیسی ڈر پوک کہ کسی کے ڈر سے خاموش ہو جائے۔ ماویٰ پر ایک اڑتی پڑتی نظر ڈال کر اس وقت بھی اس نے اپنا بیان جاری رکھا تھا۔

”تنوی سمیت ہم سب پر رعب جماتے رہیں۔ یہ ساری بی جان کی دی ہوئی ڈھیل ہے اور سچی بات ہے تنوی! تمہاری بزدلی کا بھی پڑا ہاتھ ہے کہ شبیہ بھائی اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں۔ جس وقت وہ تمہیں ڈانٹ رہے تھے دو چار کھری کھری سنائی ہوئیں تو مجال تمہیں تھی کہ دوبارہ تمہیں کچھ کہتے۔“

”تمہارا بھی دماغ ہی خراب ہے نمل!“ حرم نے اس کی تان اسٹاپ چلتی زبان سے چڑ کر کہا۔

”تمہیں نہیں پتا کہ تنوی اور شبیہ کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اگر وہ تنوی پر حق جتانے ہے تو صرف اسی رشتے کی وجہ سے۔ تنوی کیسے اسے کچھ کہہ سکتی ہے؟“

”رشتے کی نوعیت مختلف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان جان کو ہی آجائے۔“ نمل مشکل ہی سے قائل ہوتی تھی۔ ”اور پھر حق جتانے اور محض رعب جھاڑنے میں بہت فرق ہوتا ہے حرم! آپا! مگیتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ لڑکا لڑکی کو دوسرے انسانوں سے کاٹ کر ہی رکھ دینا چاہیے۔“

”چھا! اب اس بات کو ختم کرو۔“ حرم نے کن اکھیوں سے ماویٰ کو دیکھتے ہوئے بحث سیٹنا چاہی۔

”میں اس بحث کو ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے اتنا غصہ آ رہا ہے اس لڑکی پر۔ حد ہوتی ہے بزدلی کی ہر بار کسی نہ کسی بات پر سوہمہ بھا کر چپ ہو جیتی ہے۔ یہ نہیں کہ اسی وقت دو باتیں سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ اور اس پر سے بی جان سینئر ظلم یہ نہیں کہ اپنے جانشین، ظلم جو نیئر کو بھی ساتھ ہی لے جاتیں، بٹھا گئیں ہمارے سروں پر رعب جمانے کے لیے کیا ہمارے ہاں باپ موجود نہیں جو ہر ہدایت ہمیں شبیہ بھائی کی طرف سے جاری کی جاتی ہے؟“ نمل بہت ہی غصے میں تھی۔

”بس کرو نمل! خدا را بس کرو۔“ حرم کو بری طرح تاؤ آیا۔

”ایک تو بے چاری تنوی ویسے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اس پر سے تمہاری بک بک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔“

”میری چڑچڑاس لیے ختم نہیں ہو رہی کہ شبیہ بھائی کے سامنے آپ نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ لے کے ہاتھ دبا دیا میرا۔“

”بھائی ہے وہ ہمارا۔ اگر کسی بات پر کچھ کہہ بھی دیا تو کون سی قیامت آگئی؟ بھول بھی جاؤ۔“ حرم چاہتی تھی

”جلد از جلد یہ موضوع ہی سمٹ جائے تاکہ ماویٰ کے سامنے بات کھلے ہی نہیں۔“

”خواتواہ بھول جاؤں۔ چلو تنوی پر پابندیاں لگائیں بات کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے۔ کچھ لوگ بیوی اور مگیتر کے معاملے میں پوز ہو جاتے ہیں لیکن ہمیں کیوں منع کیا کہ ماویٰ سے بات چیت ہی نہ کریں؟“ حرم نے سر ہی بیٹھ لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ماویٰ کے تاثرات ہی بدل چکے تھے۔

”اس سے مجھ سے بات کرنے سے منع کیا ہے۔ لیکن کیوں؟“ وہ جواب تک ان کی ساری گفتگو سے لا تعلق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے اچھبے سے پوچھا۔

”صرف بات کرنے سے منع نہیں کیا تم سے“ دور“ رہنے کے آرڈر جاری کیے ہیں۔“ نمل نے جل کر کہا۔

”واقعی؟“ ماویٰ نے دلچسپ قہقہہ لگایا۔ یوں جیسے بڑی اچھی بات ہوئی ہو۔

”تینوں نے یک وقت اس کو دیکھا۔ اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات تھی آخر؟ لیکن ماویٰ نے ان تینوں کے تاثرات پر زیادہ توجہ نہیں دی وہ مزے سے پیر جھلاتے ہوئے دل ہی دل میں بہت کچھ سوچنے میں مصروف ہو گئی۔

”تو ثابت ہوا شبیہ العباس بھی! کہ تم مجھ سے خائف ہو تب ہی تو اپنی گرز کو مجھ سے دور رہنے کی تاکید کرتے پھر رہے ہو۔ اب آئے گا مزا۔ تمہارا نام تو شبیہ العباس کے بجائے ”مکڑو بھٹی“ ہونا چاہیے تھا۔ اب دیکھنا۔ میں نے بھی تمہاری بساط تم پر ہی نہ الٹ دی تو میرا نام ماویٰ احسان نہیں۔“ وہ مزے سے ارادے باندھ

ماویٰ تھی۔

”اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم تو حد ہی کرتی ہو نمل۔ اور تنوی اٹھ کر فوراً ”منہ دھوؤ“ حرم

ہاں آپا کارول بھاتے ہوئے بولی۔



اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ شبیہ العباس لڑکیوں کو اس سے فاصلہ رکھنے کی تاکید کر چکا ہے، ماویٰ آرام سے بیٹھیں ان کے ساتھ گپیں لڑاتی رہی۔ پھر جب مٹی کو فون کرنے کے خیال سے وہاں سے باہر نکلے تو حرم اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

”ماویٰ!“ وہ تقریباً ”آوہی رابدار“ی عبور کر چکی تھی جب اس نے اپنے عقب میں حرم کی آواز سنی۔ ماویٰ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ حرم تیز تیز چلتی اس کی طرف آ رہی تھی، لیکن ماویٰ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی کہ حرم کی چال میں واضح لڑکھاہٹ تھی۔

”رکو ماویٰ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ حرم نے قریب پہنچتے ہوئے کہا، مبادا وہ پھر سے چل پڑے۔

”حرم! یہ۔۔۔؟“ اس کا الجھا ہوا سا استفسار اور نگاہوں کا رخ پیروں کی طرف تھا۔

”کیا؟“ حرم نے قدرے تعجب سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بے مطلب ہنس دی۔

”چھائی۔۔۔ اوہ! میں سمجھی پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ تو میرے پیر میں بچپن سے لگے ہے اب تو اس کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر میں لنگڑا کر نہ چلوں تو عجیب لگے گا۔ اور اصل تم نے پہلی بار دیکھا ہے تو عجیب لگ رہا ہے۔“

اتنی وضاحت کے باوجود ماویٰ کچھ بول نہیں سکی۔

”علاج نہیں کروایا؟“

”شاید بچپن میں کروایا ہو۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔“ حرم نے لا پرواہی سے کہا۔

”مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے حرم! آئی ایم سوری۔“ ماویٰ نے ہمدردی سے کہا۔

”تم کیوں دکھی ہو رہی ہو۔“ حرم نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”اس حویلی میں رہی نہیں ہوتا! اس لیے تمہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ بی جان کی ساری اولادوں کو اللہ نے کسی نہ کسی آزمائش میں ضرور ڈالا ہے۔ خود ہمارے بڑے دونوں تایاؤ، بی طور پر معذور ہیں۔ پھر بڑے ابابہیں۔ انہیں اور ان کی اولاد کو کسی بیماری کی آزمائش تو نہیں ملی البتہ ان کو فیملی کا سکون نصیب نہیں ہوسکا۔ پھر ہمارے ابابہیں تو ان کی اولاد میں سے مجھے بیماری ملی ہے۔ اف ماویٰ! تم کیا کیا سنوکی۔ بڑی لمبی داستان ہے۔ تم چھوٹا اس بات کو۔ میں تو تم سے صرف اتنا کہنے آئی تھی کہ پلیز! نمل کی باتوں کو سیریس مت لینا۔ شبیہ نے تو ذرا سی بات کہی تھی اس نے بات کا بنگلڑ ہی بنا دیا۔ شبیہ دل کا بڑا نہیں ہے۔ پتا نہیں کس جھوٹک میں کہہ گیا ہو گا۔ تم پلیز اس کی باتوں کو دل پر مت لینا۔“ حرم نے چاری اپنی ذمہ داری بھاری تھی۔

”ارے نہیں! میں کسی کی باتوں کو دل پر نہیں لیتی۔ لیکن بدلہ ضرور لیتی ہوں اور شبیہ العباس سے بھی بدلہ ضرور لوں گی۔“ وہ مسکرا مسکرا کر دل ہی دل میں ارادے باندھ رہی تھی جبکہ حرم کہہ رہی تھی۔

”شبیہ العباس ہمیشہ سے بی جان کے قریب رہا ہے۔ بی جان اس کی باتوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں تو اسی وجہ سے ہمیں بھی اس کی ہر جمع غلط بات کو ماننا پڑتا ہے۔ اب تو خیر عادت ہی ہو گئی ہے، لیکن نمل ابھی چھوٹی ہے اسی لیے ہر بات پر اعتراض کرنا شروع کر دیتی ہے۔“

”اور تنوی؟“ ماویٰ نے پوچھا۔ ”آئی مین! تنوی اتنا کیوں رو رہی تھی؟ کیا اس کے نزدیک شبیہ العباس کی بات

اہم نہیں ہے؟“ اس کے لیے تو سب سے اہم ہے۔ ”حرم نے ہنس کر کہا۔
 ”شبیبہ بی جان کا لڑلا ہے اور تنوی بی جان کی چھوٹی بیٹی کی نشانی۔ اسی لیے دونوں ہی بی جان کو عزیز ہیں۔ اسی بنا پر بی جان نے تنوی کے پیدا ہوتے ہی اسے شبیبہ سے منسوب کر دیا تھا۔ اب میں اور مکمل تو شبیبہ کی کسی بات سے پھر بھی انکار کر سکتے ہیں لیکن تنوی ہرگز نہیں۔“
 ”چھا!“ ماویٰ کو تعجب ہوا۔
 ”کیا منسوب ہونے کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ لڑکی اپنے سارے اختیارات چھوڑ دے؟“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔
 ”ارے نہیں!“ حرم ہذا سٹپٹا گئی۔
 ”دراصل تنوی کچھ خود بھی بزدل ہے۔ اسے اپنا حق لینا آتا ہی نہیں ہے اور کچھ شبیبہ بھی بے جا روک ٹوک کر کے زیادتی کر جاتا ہے پھر تنوی کو پالا بھی میری امی نے ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل میری امی کے جیسی ہے یعنی فطرتاً اور عادتاً۔ ہم بہن بھائیوں میں سے تو سچی بات ہے جلال کے علاوہ کسی نے بھی امی کی عادات نہیں لیں۔ ہاں! تنوی ہو سو ان کی کاپی ہے۔ کسی ہی صلہ جو کسی حد تک بزدل۔ شبیبہ کی ہر کھوٹی کھری سن من کرتی ہے۔ اسی لیے اسے سرخڑا لیا ہے ورنہ سچی بات ہے شبیبہ دل کا بڑا ہرگز نہیں ہے۔“
 ماویٰ نے اس بات پر تبصرہ کرنا کچھ ضروری نہ سمجھا۔
 ”اور تنوی کے پیرئس؟ اس کی ممی کو تو میں نے اب تک نہیں دیکھا۔“
 ”یہ بھی بڑی افسوس ناک بات ہے کہ تنوی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں تنوی کے والد نے زریں پھمو کو طلاق دے دی تھی اور تنوی شاید بمشکل ڈیڑھ سال کی ہوئی جب پھمو کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔“
 ”اوہ۔“ ماویٰ فقط یہ ہی کہہ سکی۔ یہ بڑی افسوس ناک خبر تھی۔ ممی کے اصرار کے باوجود وہ بنیادی طور پر زریں کی تلاش میں ہی حویلی آئی تھی اور اب ان کے انتقال کی خبر نے اسے ایزد و کمی اور مایوس کر دیا تھا۔ معاہدے سے تسنیم دکھائی دی وہ لان سے گزر کر حویلی کے اندر رونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔
 یکایک ماویٰ کے ذہن میں کون سا ناک۔
 ”حرم! تم نے کہا ہمارے دو تیا ذہنی طور پر معذور ہیں لیکن میں نے تو ابھی تک انہیں بھی نہیں دیکھا۔“
 ”نجیب مایا کی تو خیر چھوٹی عمر میں وفات ہو گئی تھی جبکہ زبیر تیا جی حیات ہیں مگر حویلی کے اندر ان کا اتنا آنا جانا نہیں۔ اب تو خیر! کچھ بیماری اور کچھ بڑھتی عمر کی وجہ سے ضعیف بھی ہو گئے ہیں۔ خود سے چل پھر بھی نہیں سکتے۔ تم نے ابھی بی جان کو نہیں دیکھا۔ زندگی میں اتنے مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود انہوں نے خود کو بہت فٹ رکھا ہے۔ اگر کسی کو تیا جی ان کے بیٹے ہیں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔“
 حرم اسے جو تفصیلات بتا رہی تھی ان سے ماویٰ کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کی پر سوچ نگاہیں تو تسنیم کے تعاقب میں تھیں۔
 ”تو اگر حویلی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے تو زبیر تیا جی کہاں رہتے ہیں؟“ اس نے اگلا سوال اٹھایا۔
 ”حویلی کے پچھلے حصے میں بی جان نے کچھ کمرے بنوا رکھے ہیں ان ہی میں سے ایک کمرے میں تیا جی رہتے ہیں۔ ملازمین ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ہیں۔“
 ”ہوں۔“ ماویٰ نے محض اتنا ہی کہا تھا۔ گو کہ ذہن میں سوال سر اٹھا رہے تھے کہ باقی کمروں کو کس مقصد کے

لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس سوال کا جواب اسے خود ڈھونڈنا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی محرم اسے خاطر خواہ جواب نہیں دے سکے گی۔



شام سے ذرا بعد کا وقت تھا جب ملازمہ مستقیم بھٹی کا بلاوا لیے چلی آئی۔
 ماویٰ ابھی سو کر اٹھی تھی۔ موسم کی مناسبت سے ہلکے نیلے رنگ کی لانگ شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ متوقع اعتراضات سے بچنے کے لیے گلے میں اسٹول بھی ڈال لیا تھا اب کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے ملازمہ سے اپنے لیے کافی بھجوانے کے لیے کہا اور اسی کی ہمراہی میں مستقیم بھٹی کی اسٹڈی میں آئی۔
 ”السلام علیکم!“
 مستقیم بھٹی چشمہ لگائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جب ماویٰ نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام! او ماویٰ! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ مستقیم بھٹی نے کتاب بند کرتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
 ”کیسا گزر رہا ہے وقت؟ کوئی دقت تو پیش نہیں آرہی؟“
 ”ازے بدقت کیسی۔ یہاں سب اپنے ہی تو ہیں۔ اور سچ بات ہے کہ مجھے یہاں اچھا بھی بہت لگ رہا ہے۔ آفٹر آل میرے بابا کی یادیں جڑی ہوئی ہیں اس حویلی سے اور آپ سب لوگوں سے۔“ ماویٰ نے ہنس کر کہا اور صاف محسوس کیا کہ اس آخری بات پر مستقیم بھٹی کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات دکھائی دیے ہیں۔
 ”نن میرا خیال ہے کچھ لوگوں کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔“
 اس نے معصومیت سے پتا چلایا۔ ”آئی مین۔ دیکھیے! میں سمجھ نہیں پا رہی کہ مجھے آپ سے یہ کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی حویلی میں رہنا چاہتی ہوں اور سب لوگوں کے ساتھ اچھا ٹائم گزارنا چاہتی ہوں مگر۔“ وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے کچھ رہی ہو بات کا سراپا سے نہ ملتا ہو۔
 ”تم کو جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔“ مستقیم بھٹی نے دلچسپی اور سنجیدگی سے کہا۔ ”کسی سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ڈر یا گھبراہٹ والی تو کوئی بات نہیں ہے تیا جان! لیکن مجھے عجیب سا لگا جب لڑکیوں نے بتایا کہ شبیبہ العباس نے انہیں مجھ سے بات چیت کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ بہت انسٹنگ لگا مجھے۔“
 ”کیا؟ شبیبہ العباس نے ایسا کہا ہے؟“ مستقیم بھٹی نے اچھنبے سے پوچھا۔
 ”جی ہاں بالکل۔ اور میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے ایسی بات کس بیس (بنیاد) پر کی ہے۔ میری اس سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔“
 اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ اب یہ ماویٰ کی خوش قسمتی تھی یا شبیبہ کی بد قسمتی کہ وہ اسی وقت کسی کام سے اسٹڈی میں چلا آیا اور ماویٰ کو وہاں موجود پاکرائی ناپسندیدگی کے تاثرات چھپا نہیں سکا۔
 ”آپ شاید مصروف ہیں۔ میں پھر آ جاؤں گا۔“
 ”روک شبیبہ!“ مستقیم بھٹی کی آواز اس کے پلٹتے قدم تھم گئی۔
 ”جی؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مستقیم بھٹی کی طرف دیکھا۔
 ”تم نے حرم، تنوی اور مکمل کو ماویٰ سے بات چیت کرنے سے منع کیا ہے؟“ ان کا لہجہ سخت تھا۔ شبیبہ اتنی

واضح جواب طلبی کی توقع نہیں کر رہا تھا لختہ بھر کو گڑبڑایا تھا، لیکن اگلے ہی پل اس کا اکل کھراپن عود کر آیا۔

”جی۔“

”وجہ جان سکتا ہوں؟“ مستقیم بھٹی کالجہ سخت تھا۔

”ماوی کو دل ہی دل میں گد گدی سی ہونے لگی۔“

”میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے وابستہ کوئی بھی انسان اس سے بات کرے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”ان تینوں کا جو رشتہ تم سے ہے وہی ماوی سے بھی ہے پھر تمہیں کس نے اتنا حق دیا ہے کہ انہیں ماوی سے بات کرنے سے روکو؟“ مستقیم بھٹی نے بھڑک کر کہا۔

”لیکن اب اسے“ شبیہ نے کہا چاہا۔

”بس۔“ مستقیم بھٹی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”تم جاسکتے ہو۔ مجھے تم سے فی الحال کوئی بات نہیں کرنا۔ اور ہاں! اگلی بار بھول کر بھی کسی کو ہدایات جاری کرنے کی کوشش مت کرنا۔ خصوصاً ”ماوی“ کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔“

شبیہ کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر ماوی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اطمینان سے دامن ٹانگ بائیں پر رکھے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

شبیہ تن فرین کرتا ہر نکل گیا۔

”ماوی!“ مستقیم بھٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”جی۔“ وہ قدرے گڑبڑا کر متوجہ ہوئی کہ شبیہ کی درگت بنتے دیکھ کر بری طرح مسکرا رہی تھی۔

”شبیہ کی طرف سے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ ذرا سر پھرا ہے لیکن تمہیں دوبارہ اس کی طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”پلیز تبا جان اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ اس نے ہوشیاری سے کہا اور دل ہی دل میں خود سے بے حد متاثر ہوئی، کیونکہ وہ ہرگز نہ جانتی تھی کہ وہ اتنی باصلاحیت ہے۔ بھٹی! ایک تیرن سے دشکار کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔

اگر مستقیم بھٹی سامنے نہ ہوتے تو یقیناً وہ اپنا کندھا تھک چکی ہوتی۔ وہ مزے سے مستقیم بھٹی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ تب ہی تنیم ماوی کے لیے کافی لے کر آئی۔

”چوہدری صاحب! آپ سے بات کر رہی تھی۔“ وہ مودب ہو کر بول رہی تھی۔

”ماوی نے پرسوج نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ہلکا گھونٹ لیا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ اس قدر بد مزہ کافی۔“

”تنیم! یہ کافی تم نے بنائی ہے؟“ بد مزہ کافی کے گھونٹ کے باوجود اسے خیال آیا تو پوچھ لیا۔

”جی ہاں!“

”بہت اچھی کافی بنائی ہے تم نے۔“ اس نے مرے دل سے بلکہ جوش کے ساتھ کہا۔ ”سنو۔ اب سے ہر بار میرے لیے کافی تم ہی بنانا۔“

”ہاں بھٹی بی بی کو تمہارے ہاتھ کی کافی پسند ہے تو تم ہی بی بی کے لیے کافی بنانا۔ خیال رہے ماوی بی بی کو کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔“

مستقیم بھٹی نے فوراً اس کی مشکل آسان کر دی۔ ماوی اطمینان سے کافی کے کڑے کسے گھونٹ بھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

انیسوا بے حد پریشان تھی۔ ولید کی طرف سے اس کی فکر مندی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، مگر وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ ساری الجھنیں کس سے ڈسکس کرے۔ مگر بیمار تھیں اور پھر دور بھی جبکہ ڈیڈی کو تو لگتا تھا کسی معاملے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ وہ صبح جلدی آفس جاتے اور رات گئے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ ماوی اور شبنم آنٹی بھی بہت دن ہوئے انیسویں چھوڑ کر جا چکے تھے ورنہ وہ ضرور ماوی سے ڈسکس کرتی۔

اس روز بھی وہ ولید کے لیے فکر مند ہو کر نماز کے بعد رونے لگی۔ اچھی خاصی پرسکون زندگی کی جھیل میں اتنے سارے پتھر ایک ساتھ۔ تلاطم تھا کہ تمہارا ہی نہ تھا۔ پتھروں کے تہ میں بیٹھنے کا انتظار کرتا تھا لیکن یہاں تو ایک کے بعد ایک پتھر تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی کہ ڈور بتل نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت چار بجے تھے۔ ڈیڈی یا ولید کی آمد بھی غیر متوقع تھی اور کسی مہمان کے آنے کا تو چانس ہی نہ تھا۔ بڑے شہوں میں تو اب اچانک اگر سربراہان زندگی کا رواج بھی نہیں رہا۔

وہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی اور عادتاً ”بالائی منزل کی رینگ سے نیچے لاؤنج میں جھانکا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ اس وقت صبح چھ ایک سربراہان اس کا منتظر ہو گا۔

☆ ☆ ☆

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے شبیہ؟“

مستقیم بھٹی بنا دستک دے جا رہا نہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ شبیہ اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا اس نے گردن موڑ کر لا تعلق سی نگاہ ان پر ڈالی۔

”اس دو گنے کی لڑکی کے سامنے میری انسٹل کر کے آپ کی تسلی نہیں ہوئی جو آپ پھر مجھ سے سوال جواب کرنے آگئے ہیں؟“ اس کالجہ گو کم سرد مہر، لیکن تمیز سے عاری تھا۔

مستقیم بھٹی کا چہرہ اشتعال سے سرخ ہو گیا۔

”دو گنے کی لڑکی؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ ماوی کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرو۔ عورت کی عزت کرنا سیکھو شبیہ! ورنہ ساری زندگی نقصان اٹھاؤ گے۔“ ان کا لبہ لاجبہ ان کے غصے کا غماز تھا۔

”آپ بھول رہے ہیں آپ نے مجھے عورت کی عزت کرنا کبھی نہیں سکھایا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں جیسے جو تا ان کے منہ پر دے مارا تھا۔

”ایک وقت پر میں اپنی سگی ماں کے لیے آپ کے منہ سے اس سے کہیں زیادہ بڑے لفظ سنتا رہا ہوں جیسے لفظ میں اس لڑکی کے لیے بول رہا ہوں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جب آپ کو ایک عورت کے لیے کچھ بولتے ہوئے برا نہیں لگا تو دوسری عورت کے لیے سنائیوں برا لگ رہا ہے؟“

”یہ تم نہیں۔ تمہارے منہ میں اماں کی زبان بول رہی ہے۔“ مستقیم بھٹی نے تنفر سے کہا۔ ”مجھے ساری عمر پچھتاوا رہے گا کہ میں نے تمہاری تربیت کا زمہ انہیں سونپ دیا۔ انہوں نے تمہیں بھی اپنے جیسا خود سرادر ضدی بنا دیا۔“

”آپ کو پچھتاوا بھی چاہیے، لیکن افسوس اس پچھتاوے کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کس نے کہا تھا مجھے

بی جان کی گود میں ڈالیں؟ انہیں میری تربیت کرنے دیں؟ میری ماں کو کیوں نہیں رہنے دیا آپ نے میری زندگی میں؟ اچھا ہوتا برا ہوتا، کم سے کم میری تربیت تو ان کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ نے آپ کی سابقہ بیوی نے اپنے جھگڑے میں میری پرورش نہیں کی۔ ایسے میں بی جان نے مجھے سنبھالا۔ اب میں انہیں کیسے برا کہہ سکتا ہوں۔ جبکہ مجھے اپنی

پوری زندگی میں نہ بھی ماں کی محبت کا احساس ہوا اور نہ بھی باپ کی موجودگی کا۔
مستقیم بھٹی بے حد غصے میں آئے تھے، لیکن اس وقت اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا شبیہ۔
اس کی بظاہر اس متوازن پرکشش شخصیت کے پیچھے جو ٹوٹ پھوٹ مچی رہتی تھی اس میں سراسر قصور ان ہی کی
کو تاہیوں کا تھا، پھر آخر وہ کیوں بار بار ہر بات کا الزام اماں کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جانا چاہتے تھے۔
شبیہ کہہ رہا تھا۔

”بی جان کی شخصیت کی خامیوں سے آپ تو واقف تھے، پھر آپ نے کیوں مجھے انہیں سونپ دیا؟ کیوں نہیں
مجھے اپنے جیسا بنا لیا؟ افسوس تو یہ ہے کہ نہ میں مکمل طور پر بی جان کے قالب میں ڈھل سکا۔ نہ آپ جیسا بنا
اور نہ اور نہ اپنی ماں جیسا۔ میری تو کوئی انفرادی شخصیت بھی نہیں ہے ابا! اور آپ مجھ سے خدا معلوم کیا کیا
توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ مجھے آپ کی بیٹی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہمیں کوئی نہ
کوئی نقصان ضرور پہنچائے گی۔ بی جان نے زندگی میں بھلے ہی بہت سے غلط فیصلے کیے ہوں، لیکن ان کے کیے
ہوئے درست فیصلوں کو بھی آپ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس لڑکی کو حویلی میں ٹھہرانے جیسا فیصلہ بی جان
سے پوچھے بغیر آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا۔ اب اس معاملے پر میں آپ سے مزید کچھ
نہیں کہوں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔“

مستقیم بھٹی جب اس کے کمرے سے نکلے تو ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور الفاظ گم ہو چکے تھے۔ ہمیشہ
بڑے آرام سے دوسروں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے احتساب کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ خود
کٹہرے میں کھڑے ہو کر احتساب دینا بھی پڑ سکتا ہے۔

انیسا فیضان کو اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح کوئی خواب کا منظر اس کے سامنے ہو۔ بن مانگی دعا مجسم ہو کر
اس کے سامنے آگئی تھی۔

”آپ کب آئے؟“ بے یقینی اور دلی دلی خوشی اس کے لبے اور آنکھوں سے جھلکتی تھی۔
فیضان خوبصورتی سے مسکرا دیے اور اس کے معصوم چہرے کو آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے بولے۔
”اب تو کافی سال گزر چکے۔“

”جی۔“ انیسانے نا سمجھی سے انہیں دیکھا، پھر کھسیانی ہو کر ہنس دی۔
”آپ پلیز! بیٹھیں۔ کیسے ہیں آپ؟“
”میں ٹھیک ہوں اور تم؟“

اس نے بس اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ دل چاہتا تھا ان کے چہرے سے نظریں ہی نہ ہٹائے۔ اس نے تو سوچا تھا
شاید یہ قصہ ختم ہو چکا، لیکن فیضان کو موجود کیا کرل دماغ کو ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی جو بیان سے باہر تھی۔
”میں انیکسی کی طرف گیا تھا، لیکن وہ لاگڈ ہے۔ شاید ٹینسہ آپا اور ماویٰ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ اسی لیے میں ادھر
آگیا۔ اگر تمہارے پاس ڈپلکیٹ کی ہے تو۔“

”ہاں۔ شاید۔ آپ نے اچھا کیا ادھر آگئے۔ میں انیکسی کھلا دیتی ہوں۔ شازیہ۔“ پھر ساتھ ہی کچھ خیال
آنے پر بولی۔

”آپ کھانا کھائیں گے؟“
”نہیں! کھانا تو میں فلاٹ میں کھا چکا ہوں۔ ابھی تو سوویں گا، پھر اس کے بعد چائے۔ اس وقت تک تو شاید
ٹینسہ آپا اور ماویٰ بھی آچکی ہوں اور دانیال بھائی بھی۔“ فیضان نے کہا۔

”اوہ ہاں“ انیسانے کچھ خیال آنے پر بہت سی باتیں ٹال دیں اور شازیہ کو بلا کر انیکسی سے متعلق ہدایات دینے
لگی۔

ماویٰ کو حویلی میں رہتے تقریباً ”تین ہفتے گزر چکے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان تین ہفتوں میں اس نے بہت
انجوائے کیا تھا گو کہ شہروز اور شہزاد کے ساتھ بھی اس نے بہت یادگار وقت گزارا تھا لیکن یہاں کی بات ہی اور تھی
حرم، تنوی اور نمل کے ساتھ ساتھ دونوں بھابیہوں سے بھی اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ سب کے ساتھ مل
کر حرم کی شادی کی تیاریوں میں بھرپور حصہ لے رہی تھی اور ان سب کے زرق برق کپڑے اسے بہت متاثر کرتے
تھے۔

عالیہ نرم طبیعت کی مہمان خاتون تھیں۔ وہ بالکل ماویٰ کی سی شفقت کے ساتھ اس کا خیال رکھتیں، لیکن اتنی
اچھائی کے باوجود ان کے اندر بے قونی کی حد تک سادگی موجود تھی جو سچ جلال اور تنوی میں دکھائی دیتی تھی۔
تنوی نے اپنی نانی یعنی جنت بیگم کا صرف نام اور خود بصورتی لی تھی فطرتاً ”وہ اس عورت کے بالکل برعکس
تھی۔“

حویلی میں ٹڈی دل کی طرح ملازمین بھرے ہوئے تھے اور اتنے ملازمین کی کھپ میں سے وہ کسی نہ کسی طرح
تسلیم کا اعتماد حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئی گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ ہاتھ تسلیم کا اپنا بھی تھا۔ وہ
پراسرار سی لڑکی تھی۔ مالکان کے ڈر سے غالباً ”کھل کر بات نہ کرتی تھی“ البتہ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور
گر جاتی تھی کہ ماویٰ اور محتاط ہو جاتی۔

شبیہ العباس نے اس کے بعد دوبارہ اس کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی، البتہ ماویٰ دقتاً ”فوقاً“
اس پر طنزیہ فاتحانہ نگاہیں ڈال لیتی تھی جس سے وہ سلگ کر رہ جاتا مگر مصلحتاً ”خاموش رہتا۔ چند روز بعد وہ واپس
لاہور چلا گیا ان تین ہفتوں کے دوران وہ صرف ایک مرتبہ ایک دن کے لیے آیا تھا۔

ماویٰ شروع میں ہر چھوٹی چھوٹی تفصیل ٹینسہ کو بتاتی رہی تھی، مگر پھر اس نے یہ سلسلہ محدود کر دیا۔ جب تک
جنت بیگم نہ آجائیں اس کے پاس بتانے کے لیے ایسی کوئی تفصیل نہ تھی جسے سن کر ٹینسہ خوش ہوتیں۔
ماویٰ یہاں جنت بیگم سے ملنے آئی تھی اور اس عورت کے متعلق اتنا کچھ جان لینے کے باوجود وہ کسی قسم کی
گھبراہٹ یا ڈر کا شکار نہ تھی، البتہ جلال کا سامنا کرنے کے خیال سے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی تھی اور وہ
شرمندگی کا شکار ہو جاتی تھی۔

ایک عام سے دن وہ جب صبح بیدار ہوئی اور ساتھ ہی اپنی بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ آج اسے بیدار ہونے میں
تھوڑی تاخیر ہو گئی تھی۔ تیز چمکی دھوپ کی کرنیں بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے جو کمرہ دیا گیا وہ حویلی کی دوسری
منزل پر تھا اور یہاں سے حویلی کے مرکزی پھانک کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ معا ”اسے ڈرا میوے پر کچھ گاڑیاں
کھڑی دکھائی دیں۔ ایک گاڑی کے پاس شبیہ العباس کھڑا کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔

ماویٰ کی چھٹی جس یکدم بیدار ہوئی۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور اس نے بغور اس عورت کو دیکھا جس کے
نقوش تو اتنی دور سے بہت واضح نہیں ہو رہے تھے مگر اس کا مجموعی تاثر خوبصورتی کا تھا اور اس کی شخصیت سے
شاہانہ پن اور رعونت جھلکتی تھی۔

”ہونہ ہو۔ یہی جنت بیگم ہے۔“ ماویٰ نے زیر لب کہا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سلیمان صاحب کے دو بیٹے ہیں، حیا اور رحیل۔ رحیل بڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو یورپی یونین نے اسکا لرشپ کے لیے متعجب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جا رہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں بین پچھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ بین پچھو ترکی میں رہتی ہیں۔ مینے میں ایک آدھ بار فون پر رابطہ کر لیتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داؤد کی ہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں۔ مجرا احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ وہ حیا کے بارے میں ہر بات جانتا ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان اپنی بیٹی ارم کو سر پر دوپٹہ اوڑھنے کی سختی سے تاکید کرتے ہیں، جبکہ سلیمان صاحب قدرے آزاد خیال ہیں۔ سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سکر اڈولی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سکر حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے ترکی جا رہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کر کے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہو جاتی ہے۔



ایچینج کا فارم بھرنے کے بعد حیا اور خدیجہ ترکی کے لیے روانہ ہوتی ہیں اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں۔ ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور احمدت انہیں ترکی میں رہیو کرتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی مسز عبد اللہ اپنے گھر دعوت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں مگر ہالے اس بیان کی تردید کر دیتی ہے۔ ہالے حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سرو مزاجی سے حیا سے ملتا ہے جبکہ بین پھچھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملتے ہیں جس پہ جہان خفا ہوتا ہے۔

حیا تک سب سے تیار ہو کر اپنے ہاسٹل سے باہر نکلتی ہے تو جہان مل جاتا ہے۔ وہ گزشتہ دن کے برعکس کافی خوش اخلاقی سے ملتا ہے اور اسے کھانا کھلاتا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ بھی پاشا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔

ہاسٹل میں خدیجہ اور حیا کورات کا کھانا خود پکا کر لیتا ہے۔ یونیورسٹی میں ان کی ملاقات انجمن نامی انڈین خاتون سے ہوتی ہے ان کے شوہر جاوید پروفیسر ہیں۔ حیا اپنی پھچھو کے گھر ان سے ملنے جاتی ہے تو کسی کام سے اسٹور میں جانا پڑتا ہے وہاں ایک شخص آکر حیا کی گردن دیوچ لیتا ہے۔

تیسری قسط

”چھوڑیں۔“ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور کوئی غصے سے چلا تا ندر آیا۔ اس کی گردن کے گرد جکڑے ہاتھ کو کھینچ کر الگ کیا اور اوہ کھلا ڈھکن پورا کھول کر دوہری ہو کر اوندھی جھکی حیا کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔

”کیا کر رہے تھے آپ؟ وہ آپ کی بیٹی کی طرح ہے“ ایک بات میری دھیان سے سنیں۔ آئندہ اگر آپ نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

انگشت اٹھا کر سختی سے وہ انہیں تنبیہ کر رہا تھا۔ جہان کو دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر خاموشی سے اسے سنتے گئے۔

”اور تم؟“ وہ حیا کی طرف پلٹا۔ ایک غصیلی نگاہ اس پہ ڈالی اور کہنی سے پکڑ کر کھینچتا ہر لایا۔ اوپر کیوں آئی تھیں؟ کس نے کہا تھا ادھر آؤ؟“

سیڑھیوں کے وہانے پہ لا کر اس نے حیا کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چہرہ ہشت سے اس کا رنگ لباس کی مانند زرد پڑ چکا تھا۔

گردن انگلیوں کے سرخ نشان پڑے تھے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

”وہ پھچھو نے۔“

”پھچھو کا بیٹا مر گیا تھا جو انہوں نے تمہیں بھیجا؟“ منع بھی کیا تھا مگر یہاں کوئی سنے تو۔ ”وہ غصے میں بولتا“ اسے کہنی سے پکڑے نیچے سیڑھیاں تیزی سے اترنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آرہی تھی۔

پھچھو پریشان سی آخری سیڑھی کے پاس کھڑی تھیں۔

”میں بکواس کر کے گیا تھا تا مگر میری سنتا کون ہے اس گھر میں؟ دو دن کے لیے نہ ہوں تو سارا نظام الٹ جاتا ہے۔ پورے گھر کو پاگل کر دیا ہے انہوں نے۔“

وہ آگے بڑھا اور سینٹر ٹیبل پہ رکھی میز سے پانی کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

وہ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی۔ جہان کو اتنے شدید غصے میں اس نے پہلی دفعہ دیکھا اور اتنی شستہ اردو بولتے ہوئے بھی۔

”میں۔ میں انہیں دیکھتی ہوں۔“ پھچھو پریشانی سے کہتے ہوئے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

وہ گھونٹ۔ گھونٹ چڑھا تا گیا۔ بوتل خالی کر کے میز پہ رکھی اور اس کی طرف دیکھا۔

”باہر آؤ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ ڈری سہمی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آئی۔

وہ بیرونی دروازے کے آگے بنے اسٹیمپس پہ بیٹھا تھا۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ آئی تھی۔

زرد فراک پھسل کر اس کے ننگے پاؤں کو ڈھانپ گیا۔ باہر سردی تھی مگر اسے نہیں لگ رہی تھی۔

”جو بھی ہوا“ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

نیلی جینز کے اوپر پہنے بھورے سویٹر کو عادتاً“ کمینوں سے ذرا آگے تک موڑے، وہ ہمیشہ کی طرح وجیہ اور اسارٹ لگ رہا تھا۔ غصہ اب کہیں نہیں تھا وہ ہمیشہ ولادھیما اور سنجیدہ جہان بن گیا تھا۔

”باہر کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔ کئی دفعہ انہوں نے می کو بھی مارنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے کچھ نہیں کہتے۔ ڈرتے نہیں ہیں شاید نفرت کرتے ہیں۔“

سامنے سبزہ تھا۔ اس سے آگے سفید لکڑی کی باڑ اور باڑ سے ہی بتا گیٹ باڑ کے تختوں کی وزروں سے باہر نکلی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ نم ہوا گھاس پر سے سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے چہرہ جہان کی جانب۔ موڑے بیٹھی تھی۔ فراک کا فرش کو چھو تا دامن ہوا کی لہروں سے پھڑپھڑاتا ہوا اور اٹھ جاتا تو پا جاسے کی تنگ چوڑیوں میں مقید اس کے نچنے اور پاؤں جھلکتے۔

”میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں پاکستان جاؤں۔ اپنے رشتہ داروں کے درمیان رہوں، اپنا آبائی گھر دیکھوں، مگر ہم پاکستان نہیں جاتے اور تم اس روز می کو طعنہ دے رہی تھیں کہ ہم پاکستان نہیں آتے۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ گڑبڑا گئی، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”حیا! ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جاسکتے۔“

”مگر کیوں؟“ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ چند لمحے چپ رہا، پھر آہستہ سے کہنے لگا۔

”میرے دادا نے کاروبار کے سلسلے میں استنبول آیا کرتے تھے۔ اس گھر کی زمین انہوں نے ہی خریدی تھی بعد میں ابانے ادھر گھر بنوایا۔ تب وہ پاکستان آری کی طرف سے یہاں پوسٹڈ تھے۔ میں استنبول میں ہی پیدا ہوا تھا اور ابائی دوبارہ اسلام آباد پوسٹنگ ہونے کے بعد بھی میں اور می ادھر دادا کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے دادا بہت اچھے بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ دین و نیا عزت، بہادری اور وقار سے جینے اور شان سے مرنے کا سبق انہوں نے ہی مجھے دیا تھا۔ میں آٹھ سال کا تھا جب دادا فوت ہوئے تو میں اور می کچھ عرصے کے لیے پاکستان آگئے اور تب ہی وہ واقعہ ہوا جس نے ہماری زندگی بدل دی۔“

حیا کا سانس رک گیا۔ تب ہی تو ان کا نکاح ہوا تھا تو کیا وہ باخبر تھا؟

”جن دنوں میں اور می پاکستان میں تھے، بلکہ تمہارے گھر میں تھے، ابا آتا“ فنا“ ترکی فرار ہو گئے۔ فرار اس لیے کہ انہوں نے ایک حساس مقام کے بلو پرنس ان کو بیچ دیے تھے جو ہمیشہ خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ثبوت انہوں نے کوئی نہیں چھوڑا، مگر نفی شروء ہوئی تو بہت کچھ کھلنے لگا۔ ابا نے ترکی سے ہی اپنا اسٹیفنی بھجوا دیا۔ پیچھے عدالت میں مقدمہ چلا اور وہ غدار ٹھہرائے گئے۔ ان کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی۔ ان کو سزائے موت سنائی گئی اور انہوں نے ترکی میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ کچھ تعلقات کام آئے اور کچھ رشوتیں ابا کو ترک حکومت کبھی ڈی پورٹ نہ کر سکی، نہ ہی انٹرپول نے کوئی قدم اٹھایا۔ قصہ مختصر ابا جس دن پاکستان کی سرزمین پہ قدم رکھیں گے، وہ گرفتار ہو جائیں گے اور ان کو پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ بات تمہارے والدین کو بتا ہے“

مگر بدنامی کے ڈر سے کسی کو تائی نہیں جاتی۔
وہ کسی بھی جذبے سے عاری نگاہوں سے سامنے
باڑ کو دیکھتا کہ رہا تھا۔ حیا ایک ٹک سے دیکھے گئی۔
”میں ایک غدار کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ ایک ملک
و دشمن ہے۔ اس ذلت کے باوجود ہم ابا کے ساتھ رہنے
پر مجبور ہیں۔ احساس جرم ہے یا قدرت کی سزا؟ وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ذہن کھوتے جا رہے
ہیں۔ سزائے موت کا خوف ان کے لیے ناسور بنتا جا رہا
ہے جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا“ اس پر ان کو
معاف کر دیا۔ وہ میرے باپ ہیں اور باوجود اس کے کہ
یہ حقیقت بہت جگہ پر میرا سر جھکا دیتی ہے، میں ان
سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔“
حیا نے گہری سانس لی۔ اس کے کسی قصے میں اس
کا قصہ نہیں تھا، کسی داستان میں اس کی داستان نہ
تھی۔
”میں کام سے باہر جا رہا ہوں“ آج کھانا کھا کر جانا۔
وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شاید وہ صرف
ابھی تھائی چاہتا تھا۔
حیا گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ
ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پہ چلتا سیڑھیوں کی طرف
برہہ رہا تھا۔

”حیا۔ خدیجہ!“

ٹالی نے انہیں اس وقت پکارا، جب وہ دونوں ڈی
جے کے بینک پہ بیٹھی ”ڈی جے کی شاپنگ پہ بیٹھو
کر رہی تھیں۔ وہ تیو فروری کی وہ سہرگئی۔ انہیں ترکی
آئے آٹھواں روز تھا اور ڈی جے جو وہلنٹائن ڈے
کی رونق دیکھنے آج ٹاقسم گئی تھی مایوس سی واپس آئی
تھی۔ پاکستان کے برعکس ترک ہر کام چھوڑ کر سرخ
رنگ میں نہا نہیں جاتے تھے بلکہ سوائے سرخ
پھولوں کی فروخت کے استنبول میں وہلنٹائن ڈے کے
کوئی آثار نہ تھے۔ جب ڈی جے خوب مایوس ہو چکی تو

اس نے یہ کہہ کر اپنے خیالات میں ترمیم کر لی کہ
”بھاڑ میں گیا سینٹ وہلنٹائن“ ہمیں اس تہوار سے کیا
لینا رہا۔“
ان کی اس گفتگو میں نخل ہونے والی اسرائیلی
ایکچینج اسٹوڈنٹ تھی۔
”ہاں؟“ وہ دونوں رک کر نیچے دیکھنے لگیں، جہاں
ٹالی ان کے بینک سے نیچے لگتی سیڑھی کے ساتھ کھڑی
تھی۔
”وہ لڑکے تمہارا پوچھ رہے تھے۔“
حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر
ٹالی کو۔
”کون سے لڑکے؟“
”وہ فلسطینی ایکچینج اسٹوڈنٹس جو ساتھ والے
ڈورم میں رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ وہ
پاکستانی لڑکیاں کیسی ہیں اور یہ کہ ان کو کوئی مسئلہ وغیرہ
تو نہیں ہے“ اور یہ بھی کہ تم دونوں آج شام کی چائے
کامن روم میں ان کے ساتھ ہو۔ وہ تمہارا انتظار کریں
گے، اوکے بائے۔“ ایک اسرائیلی مسکراہٹ ان کی
طرف اچھلتی ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گئی۔
”یہ فلسطینیوں کو ہمارا خیال کیسے آگیا؟“
”اس ٹالی کے درخت سے دل بھر گیا ہو گا شاید۔“
ڈی جے نے قیاس آرائی کی۔
”نیکو مت! وہ ہمیں صرف اپنی مسلمان بہنیں سمجھ
کر بلا رہے ہوں گے۔“
”اتنے ہند سم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار
نہیں ہوں۔ یہ بھائی چارہ ہمیں ہی مبارک ہو۔“ ڈی
جے بدک اٹھی تھی۔
”چلو پھر تیار ہو جائیں تاکہ وقت پہ پہنچ سکیں۔“
حیا لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی۔
”صرف ہمیں ہی بلایا ہے یا یہ عرب اسرائیل
دوستی کی زندہ مثل بھی موجود ہوگی؟“ ڈی جے کا اشارہ
ٹالی کی طرف تھا۔
”ہاں نہیں۔“ حیا نے شانے اچکا دیے۔ وہ الماری

سے کپڑے نکالنے لگی۔ ہر موقع کی مناسبت سے مکمل
ڈریسنگ کرنا اس کا جنون تھا۔ کپڑوں پہ ایک سلوٹ
تک نہ ہو اور میک اپ کی ایک لکیر بھی اوپر نیچے نہ ہو
وہ ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ البتہ لڑکوں کی دعوت پہ
جانے کی اجازت پاکستان میں ابایا تیا فرقان کبھی نہ
دیے مگر وہ ادھر کون سا دیکھ رہے تھے۔ یہ ترکی تھا اور
یہاں سب چلتا تھا۔
وہ تین لڑکے تھے۔ معتمد المرتضیٰ، حسین اور
مومن، ان کے دو فلسطینی دوست محمد قادر اور نجیب
اللہ جانی دعوت کے شروع میں موجود رہے، پھر اٹھ کر
چلے گئے، مگر ان تینوں میزبانوں نے احسن طریقے سے
میزبانی نبھائی۔
وہ تینوں اسمارٹ اور گڈ لکنگ سے لڑکے ایک
جیسے لگتے تھے۔ معتمد ان میں ذرا الباتا تھا۔ (اس کا نام
معتمد المرتضیٰ تھا، مگر یہ ڈی جے نے بعد میں نوٹ کیا
کہ وہ فیس بک پہ اپنا نام معتمد اینڈ مرتضیٰ لکھتا تھا۔
وجہ انہیں کبھی سمجھ نہ آئی۔) حسین اور معتمد ان
دونوں کو بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کر رہے
تھے۔ البتہ اس بھائی چارے سے مومن متفق نہ تھا۔
وہ فلرٹی، نظریا ز سار کا کچھ بھی تھا، مگر مومن نہ تھا۔
البتہ وہ دونوں اس کو اپنی موجودگی میں سیدھا کیے ہوئے
تھے۔ وہ دونوں اتنے لٹسار اور مہذب لڑکے تھے کہ حیا
کو اپنے سارے کزنز ان کے سامنے بے کار لگے۔
البتہ جہاں کی بات اور تھی۔ اس نے فوراً اپنی رائے
میں ترمیم کی۔
”اگلے ہفتے حسین کا برتھ ڈے ہے۔“ حسین
موبائل پہ فون سننے باہر گیا تو مومن نے بتایا۔
”پھر تو ہمیں اسے ٹریٹ دینی چاہیے۔“ ڈی جے
سوچ کر بولی۔
”اور گفت بھی۔“ حیا کو خیال آیا۔
”ہم دونوں اس کے لیے ایک گھڑی خریدنے کا
سوچ رہے ہیں جو ہم نے جو اہر میں دیکھی ہے۔
130 لیرا کی ہے۔“ معتمد نے چائے کا آخری
گھونٹ پی کر کپ میز پہ رکھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بہا دل	آصفہ اعلیٰ	500/-
درد و موم	ماہدہ جمیل	600/-
دعویٰ ایک روشنی	رحمانہ رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رحمانہ رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ عہدری	400/-
حیرت نام کی شہرت	شازیہ عہدری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاطمہ انصار	500/-
بہول بھلیاں میری گیاں	فاطمہ انصار	500/-
بھلاں دوسرے رنگ کالے	فاطمہ انصار	250/-
یہ گیاں یہ چہارے	فاطمہ انصار	300/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اسے دھوٹ لایا	آسیہ ذاتی	350/-
نکمرہ جانی خباب	آسیہ ذاتی	200/-
دھم کو خدیجی سہائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماؤں کا چاند	ہمزی سعید	200/-
رنگ خوشبو بہا دل	انصاف آفریدی	450/-
دوسرے قافلے	رضیہ جمیل	500/-
آج کلن پہ چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
دو کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حسین عہدری	300/-
خیریت نامہ شہر دل کی	میونہ غور شیدیل	225/-
شام آواز	ایم سلطانہ عمر	400/-

ناول نکھانے کے لیے کتاب ڈاک ٹرغ - 30 روپے

نکھانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر 32216361

”یعنی کہ پاکستانی روپوں میں۔“ حیا نے سوچتے ہوئے پرس میں ہاتھ ڈالا تاکہ موبائل کے کیلکولیٹر سے حساب کر سکے۔

”سات ہزار ایک سو پچاس پاکستانی روپے۔“ معتمم جھک کر پیئر کی پلیٹ سے ایک فلوا اٹھاتے ہوئے بولا۔ حیا کا پرس کو کھنگالتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے حیرت و بے یقینی سے معتمم کو دیکھا۔

”تم نے اتنی جلدی حساب کیسے کیا؟“

”میں میتھس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔“ وہ جینپ کر مسکرا دیا۔

”اور معتمم کا ایک ہی خواب ہے کہ وہ میتھس میں ٹیبل پر اتر لے۔“ مومن حیا کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد معتمم سے آنکھ بچا کر حیا کے سر پرے کا جائزہ لے لیتا تھا۔ حیا قدرے رخ موڑ کر معتمم کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تو میتھس کے اسٹوڈنٹ! جلدی سے بتاؤ کہ اس مہنگی گھڑی کو خریدنے کے لیے اگر ہم چاروں پیسے تقسیم کریں تو ہر ایک کے حصے میں کتنے۔“

”32 لیر اور پچاس کرش۔“

”اوکے!“ حیا نے گہری سانس لی اور پرس کھولا۔ ان کو پیسے انہوں نے زبردستی تھمائے۔ مومن کو تو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر معتمم ان سے رقم لینے پر متذبذب تھا، مگر یہ ایک ان کی بات تھی کہ بغیر اس کارڈ شپ کے استنبول جیسے مہنگے شہر میں وہ سب اتنا ہی افورڈ کر سکتے تھے۔

وہ تینوں جواہر کے لیے نکل رہے تھے۔ معتمم نے بتایا کہ وہ ابھی حسین سے نظر بچا کر گھڑی خرید لائیں گے۔ ان کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی اور ڈی جے ہاں کرنے ہی والی تھی کہ حیا نے اس کا پاؤں اسے جوتے سے زور سے پکڑتے نظر ہر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔

”نہیں! آپ لوگ جائیں، ہم آج ہی ہو کر آئے ہیں۔“

وہ تینوں چلے گئے تو ڈی جے نے برا سامنے بنا کر اسے دیکھا۔

”تم نے انکار کیوں کیا؟“

”پاکل عورت! تم پاکستان سے آئی ہو یا نیویارک سے؟ ان کی دعوت قبول کر لی ہے ہی بہت ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ سیر سپاٹوں پہ بھی نکل جائیں، داغ ٹھیک ہے؟“

”مگر وہ تو ہمارے بھائیوں کی طرح ہیں۔“

”بیچھے ہمارے اصلی والے بھائیوں کو ہتا چلا تو کل ہی پاکستان واپس بلوائیں گے۔ اس لیے اپنی اوقات میں واپس آؤ اور رات کے کھانے کی تیاری کرو۔“ وہ موبائل کے ساتھ نتھی ہینڈ فری کانوں میں لگاتے ہوئے بولی۔

”زہر ملا کروں گی تمہیں۔“ ڈی جے بھناتی ہوئی پیئر پکرا تھی۔

”اور اگر تم چاولوں پر آلیٹ ڈال کر لائیں تو میں ساری ڈش تمہارے اوپر آٹھ دوں گی۔“

وہ وہیں صوفے پر لمبی بیٹھی، اب موبائل کے ٹیبلن دبا رہی تھی۔ دھیمامیوزک اس کے کانوں میں بجنے لگا۔ ڈی جے غصے میں بہت کچھ کہتی گئی، مگر اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ہوئے ہولے ہولے پاؤں جھلانے لگی۔

ڈی جے پیئر پکرا کر ہر نکل گئی۔

وہ رات ویلنٹائن کی رات تھی۔ ڈی جے کا سن روم میں منعقدہ اس آل گرلز پارٹی میں جا چکی تھی جو لڑکیوں نے مل کر دی تھی، جبکہ حیا آئینے کے سامنے کھڑی اپنا کاجل درست کر رہی تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی، لیکن جب تک وہ اپنی آنکھوں کے کٹورے کا جل سے بھر نہ لیتی، اسے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ابھی وہ کاجل کی سلائی کی نوک آنکھ کے کنارے سے رگڑ رہی تھی کہ دروازہ بجا۔

دھیمی سی دستک اور پھر خاموشی۔

اس نے کاجل کی سلائی نیچے کی اور پلیٹ کر دیکھا۔ یہ انداز ڈی جے کا تو نہیں تھا۔ وہ یوں ہی کاجل پکڑے

آگے بڑھی اور تاب گھما کر دروازہ کھولا۔

باہر بالکونی میں روشنی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، بالکونی تاریک ہو گئی۔ غالباً ”سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب بجھ گیا تھا۔ کیا کوئی آگرواپس پلٹ گیا تھا؟“

”کون؟“ اس نے گردن آگے کر کے راہ داری میں دیوڑوں سمت دیکھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ بالکونی ویران تھی۔ وہاں سردی تھی اور اندر کرا کر گرم تھا۔

وہ چند ٹانے کھڑی رہی، پھر دھیرے سے شانے اچکا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ۔

”اوہ نہیں!“ اس کے لبوں سے ایک اکتائی ہوئی کراہ نکل۔

جو کھٹ پہ اس کے قدموں کے ساتھ سفید گلابوں کا بے اور ایک بند لافافہ رکھا تھا۔ وہ جھکی، دونوں چیزیں اٹھا لیں اور جارحانہ انداز میں لفافے کا منہ پھاڑا۔ اندر رکھا جو کور سفید کاغذ نکالا اور چرے کے سامنے کیا۔

”ہیپی ویلنٹائن ڈے۔ فرام یور ویلنٹائن۔“

اس نے لب بھینچ کر تنفر سے وہ تحریر پڑھی اور پھر بے حد غصے سے کاغذ موڑ کر گلدستے سمیت پوری قوت سے راہ داری میں دے مارا۔

”آؤ ج!“ وہ واپس مڑنے ہی لگتی تھی، جب کسی کی بو کھلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

گلدستہ اور کاغذ سیدھے ہاتھ والے کمرے سے نکلتے معتمم کو جا گئے تھے اور اس سے ٹکرا کر اب اس کے قدموں میں پڑے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

”آئی ایم سوری معتمم!“ وہ شدید بے زاری سے بمشکل ضبط کر کے بولی۔ معتمم کو وضاحت دینے کا سوچ کر ہی اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

”یہ میں نے تمہیں نہیں دیے بلکہ کسی فضول انسان نے مجھے بھیجے ہیں۔ تم برامت ماننا اور ان کو ڈسٹ بن میں ڈال دینا۔“ وہ ایک ہاتھ دروازے پر رکھے، دوسرے میں کاجل پکڑے ذرا رکھائی سے بولی۔

معتمم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا اور سیدھے ہوتے

ہوئے اس کی شکنیں درست کر کے چرے کے سامنے کیا۔ حیا کوفت ہونے لگی۔

”میں کہہ رہی ہوں نا سوری۔“ اس نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں پھر معتمم کو پکارا۔ وہ جو بھنوس بکھرے کاغذ کو دیکھ رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”نہیں! اس لو کے مگر یہ۔ تمہیں کوئی سبائچی میں تنگ کر رہا ہے؟“ وہ تحریر پہ نگاہیں دوڑاتے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ یہ بہت پہلے سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ لمبی کہانی ہے، جانے دو۔ اس کو کوڑے میں پھینک دینا۔ گڈ نائٹ۔“

وہ مزید مروت کا مظاہرہ کیے بغیر دروازے کا کواٹر بند کرنے ہی لگی تھی جب وہ ہولے سے بولا۔

”یہ گیلایوں ہے؟ تم روئی ہو؟“

کچھ تھا اس کی آواز میں کہ دروازہ بند کرتی حیا ٹھٹک کر رہی، پھر پٹ۔ سمجھا کیا اور باہر بالکونی میں قدم رکھا۔

”میں کیوں روؤں گی؟“ وہ کاغذ کو دیکھ کر بولی۔

معتمم کاغذ کے پچلے دائیں طرف کے کنارے پر انگلی پھیر رہا تھا۔

”پھر یہ گیلایوں ہے؟ شاید پھولوں پہ پانی تھا؟“

حیا نے میکا کی انداز میں نفی میں گردن ہلائی۔

”نہیں یہ تو موملے لفافے میں مہربند تھا۔“

معتمم نے وہ نم حصہ ناک کے قریب لے جا کر آنکھیں موندے سانس اندر کو کھینچی۔

”سنس؟ لیموں؟ لائم؟“ وہ متذبذب سا حیا کو دیکھنے لگا۔

”کیا کہہ رہے ہو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”کسی نے اس کے نچلے کنارے۔ لیموں کا رس لگایا ہے۔“ پھر اس نے ذرا چونک کر حیا کو دیکھا۔

”تمہارے پاس ماچس ہے؟“

وہ جواب دیے بنا لٹے قدموں پیچھے آئی اور دروازہ پورا کھول کر ایک طرف ہو گئی۔ معتمم قدرے جھجکا، پھر کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا۔

حیاء نے اپنی اور ڈی جے کی میز کی کرسیاں کھینچ کر آمنے سامنے رکھیں اور پھر ٹالی کی میز پر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

”کیا تم بھی بچپن میں لیووں کے رس اور آگ والا کھیل کھیلتے تھے؟“ وہ اب میز کی دروازہ کھول کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

”معتصم دیر سے ہوا۔“

”بہت کھیل کھیلے ہیں اور ان میں سے اکثر آگ والے ہوتے تھے۔ فلسطین میں بہت آگ ہے شاید تم نہ سمجھ سکو۔“

”چلو“ تاج ان ترکوں کے کھیل اسرائیلی آگ سے کھیلتے ہیں۔“ وہ دروازے سے ایک سگریٹ لائٹر نکال کر اس کے سامنے کرسی پہ آئی تھی اور لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

”معتصم نے لائٹر کا پیسہ انگوٹھے سے دبا کر گھمایا تو آگ کا نیلا زرد سا شعلہ جل اٹھا۔“

”احتیاط سے۔“ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

”معتصم نے جواب نہیں دیا۔ وہ خط کے غم سے کو جواب تک سوکھ چکا تھا۔ شعلے کے قریب لایا۔ ذرا سی پیش ملی اور الفاظ ابھرنے لگے۔ بڑے بڑے کر کے لکھے انگریزی کے تین حروف۔ ”آے آر پی۔“

وہ حروف عین ”فرام یور ویلنٹائن“ کے نیچے لکھے تھے۔

وہ دونوں چند لمحے کانڈ کے ٹکڑے پہ ابھرے بھورے حروف کو تکتے رہے، پھر ایک ساتھ گردن اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”آر پی۔ آر پی؟ کیا لفظ ہے یہ؟“ حیا نے ممکنہ ادائیگی کے دونوں طریقوں سے حروف کو ملا کر پڑھا۔

”شاید کوئی نام!“

”کیا آر پی کوئی ترک نام ہے؟“

”معلوم نہیں۔“ معتصم نے شانے اچکا دیے۔

حیا سوچی نگاہوں سے کانڈ کو دیکھتی رہی۔

”کیا میں تمہاری کوئی بددعا کر سکتا ہوں؟“

اس نے ایک نظر معتصم کو دیکھا، پھر نرم سا

مسکرائی۔

”ہم کر چکے ہو۔“

وہ ہونٹوں سے مسکرا کر کھڑا ہوا اور کانڈ میز پر رکھا۔

وہ جو بھی ہے شاید تمہیں اپنا نام بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے یہ تم بہتر سمجھ سکتی ہو گی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”ہوں۔“ تھینک یو معتصم!“

معتصم نے ذرا سی سر کو جنبش دی اور باہر نکل گیا۔

دروازے کا کیچر ست روی سے واپس چوکھٹ تک جانے لگا۔

حیا چند لمحے میز پر رکھے کنارے سے بھورے ہوئے کانڈ کو دیکھے مگر پھر بے اختیار کسی میکا کی عمل کے تحت اس نے ہاتھ میں پکڑی کا جل کی سلائی کو سیدھا کیا اور بائیں ہتھیلی کی پشت پہ وہ تین حروف اتارے۔

”آے آر پی۔“

دروازہ چوکھٹ کے ساتھ لگنے ہی والا تھا۔ ذرا سی دور سے باہر راداری میں گرا گلدستہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دوپل مزید گزرے اور زوردار ”ٹھاہ“ کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔

وہ اپنی ہتھیلی کی پشت پہ سیاہ رنگ میں لکھے وہ تین الفاظ دیکھ رہی تھی۔

”آے آر پی۔“

☆ ☆ ☆

اس نے اوپر سے کینٹ کا دروازہ کھولا۔ چند ڈبے الٹ پلٹ کیے۔ نچلے خانے میں سرخ مرجوں کا ڈبا نہیں تھا۔ وہ ایریاں اٹھا کر ذرا سی اونچی ہوئی اور اوپر والے خانے میں جھانکا۔ وہاں سامنے ایک پلاسٹک کے بے رنگ ڈبے میں سرخ یا ڈور رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ڈبا نکالا اور کانڈ کی طرف آئی۔ وہاں ڈی جے کھڑی، سلیب پہ کنگ بورڈ کے اوپر پاز رکھے کھانکھٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

”بریانی کی مقدار زیادہ ہے، چار چھ سرخ مرج کے ڈال دیتی ہوں شاید ذرا سا زائقہ آجائے۔“ ٹھیک؟“ وہ خود کلائی کے انداز میں کھتی ٹوکری سے چھوٹا چھج ڈھونڈنے لگی۔

”ہاں ٹھیک!“ ڈی جے نے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے دندھی آواز میں کہا اور آستین سے آنکھیں رگڑیں۔

حیا اب ڈبے سے چھج بھر کر دھوئیں اڑاتے قیلے میں ڈال رہی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اس کی پیچھے گردن پہ جھول رہا تھا۔ ساہ شلوار قمیص پہ وہ ڈھیلا ڈھالا سا سبز سوٹر پہنے ہوئے تھی جس کی آستینیں اس نے کینیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ وہ بٹا ایک طرف دروازے پہ لٹکا تھا اور چند لٹیں جوڑے سے نکل کر چرے کے اطراف میں لٹک رہی تھیں۔

گوشت میں چھج ہلاتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔

وہ دونوں اس وقت انجم باجی کے کچن میں موجود تھیں۔ صبح انجم باجی ڈی جے کو ڈانٹنگ ہال میں ملیں تو شام اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی جو کہ ڈی جے نے یہ کہہ کر قبول کر لی کہ وہ اور حیا مل کر بریانی بنائیں گی۔ اب سر شام ہی وہ دونوں ہالے کو لیے انجم باجی کے اپارٹمنٹ آگئی تھیں۔

ایک بیڈ روم لاؤنج اور کچن پہ مشتمل وہ چھوٹا مگر بے حد نفیس اور سلیقے سے سجا اپارٹمنٹ تھا۔ ہالے کو انہوں نے لاؤنج میں انجم باجی کے ساتھ بیٹھا رہنے دیا اور خود کچن میں آکر کام میں مصروف ہو گئیں۔

”یہ پینٹنگ جویدی لائے تھے انڈیا سے۔“ اندر لاؤنج میں انجم باجی کی ہالے کو مطلع کرتی آواز آرہی تھی۔

”ڈی جے! یہ جویدی کیا ہے؟“ اس نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

”ان کا مطلب ہے، جاویدی جی۔ ان کے ہنرینڈ!“ ڈی جے نے سرگوشی کی تونہ مسکراہٹ دباتی پلٹ کر ایلے چادلوں کو دیکھنے لگی۔

جس وقت انجم باجی اور ہالے کچن میں داخل

ہوئیں، حیا قیلے کا ڈھکن اخبار لگا کر احتیاط سے بند کر رہی تھی۔ آہستہ پہ پٹی اور مسکرائی۔

”بس دھوے رہی ہوں۔“

”بہت خراب ہو تم دونوں، مجھے اٹھنے ہی نہیں دیا۔“

”بس اب آپ کو کھانے کے وقت ہی اٹھانا تھا۔ وہ جوید۔ جاوید بھائی آگئے؟“ وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ڈی جے کے پاس آئی۔

ڈی جے کا سلاوا ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ اب کہیں جا کر وہ ٹائٹل پہ پہنچی تھی۔

”بس آنے والے ہیں لاڈا! یہ سلاوا تو مجھے بنانے دو۔“

”نہیں! میں کر لوں گی۔ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔“ ڈی جے نے بڑی بے فکری سے کہا تو حیا نے اسے جتنی نظروں سے گھورا۔

”آپ نے اس تھوڑے میں بھی صبح کر دینی ہے، لاڈ مجھے دو اور پلٹیں لگاؤ۔“ اس نے ٹائٹل اور چھری ڈی جے کے ہاتھ سے لے لی۔

ہالے از خود نہایت پھرتی سے سارا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی تھی۔ وہ میلے برتن اب سنگ میں جمع کر رہی تھی۔

ڈی جے کینٹ سے پلٹیں نکالنے لگی اور انجم باجی راستہ بناتے لگیں۔

حیا نے ٹائٹل کو کنگ بورڈ پہ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر رکھا اور چھری رکھ کر دباتی۔ وہ سرخ ٹکڑے الگ ہو گئے اور ذرا سا سرخ رس اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پہ بہہ گیا، جہاں کا جل سے لکھے تین مٹے مٹے سے حروف تھے۔

اسے آس پی

وہ دو تین روز سے اسی ”آے آر پی“ کے متعلق سوچے جارہی تھی اب بھی کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھائی۔

”انجم باجی!“

وہی کو کھٹے سے پھینٹیں انجم باجی نے ہاتھ روک

کرا سے دیکھا۔
”آپ نے کسی ”میرپ“ کے متعلق سنا ہے؟“
”میرپ؟“ انجم باجی نے حیرت بھری الجھن سے
دہرایا۔

”جی، میرپ۔ اے آر پی۔“ اس نے وضاحت کے
لیے ججے کر کے بتایا۔

”اوہ ناٹ اکیں حیا!“ ہالے جو سنک کے آگے
کھڑی تھی، قدرے آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں
جھاگ بھرا اسفنج تھا جسے وہ پلیٹ پر مل رہی تھی۔ ”تم
پھر وہی موضوع لے کر بیٹھ گئی ہو؟“ اس کے انداز میں
خفگی بھرا احتجاج تھا۔

”مگر ہالے!“ اب کے وہ الجھی تھی۔ یہ موضوع تو
اس نے ابھی تک ہالے کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا
تھا؟ پھر؟

”میں نے کہا تھا نا، یہ سب بے کاری باتیں ہیں۔“
”مگر میں نے پوچھا ہی کیا ہے؟“

”اے آر پی۔ عبدالرحمان پاشا اور کون؟ میں نے
بتایا تھا نا کہ یہ گھریلو عورتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ
نہیں ہے۔ یہ استنبول ہے، یہاں قانون کا راج ہے،
ماٹیا کا نہیں۔ اب اس کے بعد میں اس موضوع پر کچھ
نہیں سنوں گی۔“

ہالے اب پلیٹ کر جھاگ سے بھری پلیٹ کو پانی سے
کھجال رہی تھی اور وہ وہ حیرتوں کے سمندر میں
گھری کھڑی تھی۔

اے آر پی۔ عبدالرحمان پاشا۔ اوہ۔ یہ خیال
اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

”او کے او کے!“ وہ بظاہر سر جھکائے ٹماٹر کاٹنے لگی
مگر اس کے ذہن میں بہت سے خیال گنڈھور رہے
تھے۔ ہالے اور جہان دونوں ایک جیسے تھے اور اپنے
استنبول کے دفاع کے علاوہ وہ کبھی کبھی نہیں کہیں گے،
اسے یقین تھا مگر کسی کے پاس تو کچھ کہنے کے لیے ہو
گا اور اسے اس ”کسی“ کو ڈھونڈنا تھا۔

وہ میز لگا رہی تھی جب جاوید بھائی آگئے۔
وہ بھی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور سب انجی میں

پڑھاتے بھی تھے۔ بے حد منسلک، سادہ اور خوش اخلاق
سے ویسی مرد تھے۔ پرانے پاکستانی ڈراموں کے شوقین
اور پرستار۔ لی وی کے ساتھ ریک میں ان کئی
تہائیاں، دھوپ کنارے، آنگن، ٹیرھا، الف لون
سمیت بہت سے کلاسک ڈراموں کی ڈی وی ڈیز قطار
میں سجی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا ایک دوسرے
کے لیے طرزِ خطاب بہت دلچسپ تھا۔ ”جوید جی“ اور
”انجم جی“۔ اسے بہت ہنسی آتی۔ باقی تینوں بچن میں
تھیں، جب حیا پانی رکھنے میز پر آئی تو جاوید بھائی کو تنہا
بیٹھ پایا۔ وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔
”جوید سی۔ جاوید بھائی!“ وہ کڑبڑا کر تصحیح کر لی ان کے
ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھی اور محتاط نگاہوں سے بچن کے
دروازے کو دیکھا۔ ”ایک بات پوچھنی تھی آپ
سے۔“

”جی جی۔ پوچھیے۔“ وہ فوراً کتاب رکھ کر سیدھے
ہو بیٹھے۔

”استنبول میں ایک انڈین مسلم رہتا ہے
عبدالرحمان پاشا نام کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟“ وہ
محتاط سی کرسی کے کنارے کئی بولتے ہوئے بار بار بچن
کے دروازے کو بھی دیکھ لیتی۔
کون پاشا؟ وہ بیوک ادا والا؟

اور حیا کو لگا اسے اس کے جواب ملنے والے ہیں۔
”جی جی وی۔ وہ خاصا مشہور ہے۔“

ہاں اُسناتو میں نے بھی ہے۔ بیوک ادا میں اس کا
کافی ہولڈ ہے۔ وہ مل امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہے۔
”کیا وہ ماٹیا کا بندہ ہے؟“ اسلحہ اسمگل کرتا ہے؟

”ایک برو فیئر کو ماٹیا کے بارے میں کیا معلوم ہوگا
حیا جی؟“ وہ تھکاپٹ سے مسکرائے۔

”یعنی کہ وہ واقعی ماٹیا کا بندہ ہے؟“ اور آپ کو معلوم
بھی ہے مگر آپ اعتراف نہیں کرنا چاہ رہے۔ شاید
ایک اور داؤد ابراہیم؟“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا
اور وہ عین نشانے نہ بیٹھا۔

”داؤد ابراہیم۔ شاید!“ انہوں نے سادگی سے
ہتھیار ڈال دیے۔

”دفعنا“ بچن سے انجم باجی کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو
کرسی کے کنارے پہنکی تھی، گھبرا اٹھی اور بچن کی
طرف لپکی۔
”کیا ہوا؟“

انجم باجی سرخ بھجھو کا چہرہ اور آنکھوں میں پانی لیے
کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی چمچ تھا۔

”مرچیں۔ اتنی مرچیں حیا!“
”نہیں۔ یہ ترکی کی مرچیں پھینکی ہوتی ہیں
تو میں نے صرف چار چمچے۔“

”چار چمچے؟“ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”یہ
ترکی کی نہیں، خالص ممبئی کی مرچیں ہیں، میں
سارے سالے وہیں سے لاتی ہوں۔“

”اوہ نہیں!“ اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا
جبکہ ڈی جے ہنس ہنس کر دھری ہو رہی تھی۔



سردی کا زور پہلے سے ڈرا ٹوٹا تھا۔ اس صبح بھی
سنہری سی دھوپ ناقص اسکوائر پہ بکھری تھی۔ مجسمہ
آزادی کے گرد ہر سو سونے کے ذرات چمک رہے
تھے۔ وہ دونوں ست روی سے سڑک کے کنارے چل
رہی تھیں جب ڈی جے نے پوچھا۔

”حیا۔ یہ ناقص، نام کتنے مزے کا ہے اس کا
مطلب کیا ہوا بھلا؟“

”میں شرکی میسر ہوں جو مجھے پتا ہو گا؟“
”نہیں، وہ میری گائیڈ بک میں لکھا تھا کہ ناقص عربی
کا لفظ ہے اور اس کے معنی شاید بانٹنے کے ہیں، کیونکہ
پہاں سے نہیں نکل کے سارے شہر میں بٹ جاتی
تھیں۔ تمہیں عربی آتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہی
ہوں۔“

”عربی میں تو ناقص نام کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور عربی
میں بانٹنے کو تقسیم کہتے ہیں۔“ وہ ایک دم رکی اور بے
اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔ ”اوہ ناقص، یعنی تقسیم۔ اگر
گوروں کی طرح منہ ٹیرھا کر کے پڑھو تو تقسیم ناقص
بن جاتا ہے۔“

”ناقص۔ ادا۔“ وہ دونوں اس بات پر خوب ہنسی
ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ وہ شاپنگ کے ارادے سے
آج استقلال اسٹریٹ کی طرف آئی تھیں۔

استقلال حدیسی (اسٹریٹ) ناقص کے قریب سے
نکلنے والی ایک لمبی سی گلی تھی۔ وہ گلی دونوں اطراف
سے قدیم آرکیٹیکچر والی ادنیٰ عمارتوں سے گھری
تھی۔ گلی بے حد لمبی تھی، وہاں انسانوں کا ایک رش
بیشہ چلتا دکھائی دے رہا ہوتا۔ بہت سے سامنے
جارہے ہوتے اور بہت سے آپ کی طرف آرہے
ہوتے۔ ہر شخص اپنی دھن میں تیز تیز قدم اٹھا رہا
ہوتا۔

گلی کے درمیان ایک پڑی بنی تھی، جس پہ ایک
تاریخی، مسرخ رنگ کا چھوٹا سا ٹرام چلتا تھا۔ وہ
پیدل انسان کی رفتار سے دگنی رفتار سے چلتا اور گلی کے
ایک سرے سے دوسرے تک پہنچاتا۔ اس گلی کو ختم
کرنے کے لیے بھی گھنٹہ تو چاہیے تھا۔

وہاں دونوں اطراف دکانوں کے چمکتے شیشے اور اوپر
قمقمے لگے تھے۔ بازار، ٹائٹ کلیڈ، ریسٹورنٹس، کافی
شاپس، ڈیزائنڈ ویئر غرض ہر برانڈ کی دکان وہاں موجود
تھی۔ چند روز پہلے وہ ادھر آئیں تو صرف ونڈو شاپنگ
میں ہی دھماکی لگنے لگے، اور تب بھی وہ استقلال
حدیسی کے درمیان پہنچی تھیں، سو تھک کر واپس
ہوئیں۔

”حیا! تم نے دیکھا استقلال اسٹریٹ جیسے ماڈرن
علاقے میں بھی ہر تھوڑی دور بعد پر تیر ہال ضرور
ہے۔“

”بڑے نیک ہیں بھی ترک!“ وہ قدرے طنزیہ
ہنسی اور پھر متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
استقلال اسٹریٹ آنے کا اصل مقصد جہان سے ملنا تھا،
اور وہ صرف اس لیے یہاں آئی تھی کہ برگر کنگ جائے
اور ”میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا۔“ کہہ کر اس
سے مل لے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے
چل رہی تھیں۔ وہاں ہوا تیز تھی اور حیا کے کھلے بال
اڑاڑ کر اس کے چہرے پہ آرہے تھے۔ وہ بار بار کوٹ کی

جیب سے ہاتھ نکالتی اور انہیں کانوں کے پیچھے اڑتی تب ہی اس نے برگرنگ کا بورڈ دکھا تو ڈی جے کو بتائے بنا ریٹورنٹ کے دروازے تک آئی اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ پہنچے ہاتھ رکھتی دروازے اندر سے کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ وہ بے اختیار ایک طرف ہوئی۔ وہ جہاں تھا وہاں سے پہچان گئی تھی مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ اس کے سامنے سے آتا تھا سے نکل کر گزر گیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ڈی جے نے اسے رکھتے نہیں دیکھا تھا وہ اپنی دھن میں دکانوں کو دیکھتی چلتی گئی اور لوگوں کے ریلے میں آگے بڑھ گئی۔

حیا یونہی اپنے گھٹنوں تک آتے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ہوا کے سرخ پہ کھڑی تھی تو اس کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے تھے۔

جہاں اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد لڑکی بھی تھی۔ کوٹ اسکرٹ میں ملبوس اپنے سرخ بالوں کو اونچی پونی میں باندھے وہ لڑکی ناگواری سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

جہاں نے اسے نہیں دیکھا اسے یقین تھا۔ وہ دوڑ کر ان کے پیچھے گئی۔ وہ دونوں بہت تیز چل رہے تھے۔ ان کی رفتار سے ملنے کی سعی میں وہ ایشیائی لڑکی ہانپنے لگی تھی، بمشکل وہ ان کے عین عقب میں پہنچ پائی۔

لڑکی بلند آواز میں نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ جہاں بھی خلاصا جھنجھلا رہا تھا۔ "بحث کر رہا تھا۔ وہ ترک بول رہے تھے یا کوئی دوسری زبان؟ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید ترک نہیں تھی۔ وہ بہت لمبے لمبے فقرے بول رہے تھے اور جتنی ترک جانتے اب تک سنی تھی وہ ایسی نہیں تھی، ترک میں فقرے چھوٹے ہوتے تھے۔ بس فعل استعمال کیا اور اس کے آگے پیچھے سابقے لاحقے لگا لگا کر ایک بڑا سا لفظ بول دیا جو معنی میں کئی فقروں کے برابر ہوتا تھا۔

"جہاں۔ جہاں۔" وہ شور اور رش میں بمشکل اتنی آواز سے اسے پکار پائی کہ وہ سن سکے۔ اس کی تیسری پکار پہ وہ رک۔ لڑکی بھی ساتھ ہی رکی۔ وہ دونوں ایک

ساتھ چلے۔

"جہاں۔" اس کے ہونٹ جہاں کو دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے سنجیدہ اکھڑے اکھڑے انداز میں ابھرا اٹھا۔ اس کے چہرے پر اتنی سختی اور ناگواری تھی کہ حیا کے مسکراہٹ میں ٹھٹھکتے لب بند ہو گئے۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میں۔ حیا۔" وہ بے یقینی سے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک گزرا کہ جہاں نے اسے نہیں پہچانا۔

"ہاں تو پھر؟" وہ مہنوس سیڑھے بولا۔

وہ لڑکی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھیں۔

"پھر؟" حیا نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ وہ شدید سی جہاں کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی کام ہے؟" وہ بمشکل ضبط کر کے بولا۔

حیا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

"تو میری شکل کیا دیکھ رہی ہو جاؤ؟" وہ شانے جھٹک کر پلٹ لڑکی بھی ایک اچھتی نگاہ اس پر ڈال کر مڑ گئی۔

استقلال اسٹیٹ۔ لوگوں کا ریل آگے بڑھتا گیا۔ جہاں سکندر اور اس لڑکی کے پیچھے بہت سے لوگ اس سمت جا رہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑی بہت سے سروں کی پشت کے درمیان ان دونوں کو دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی پلکیں جھپکتا بھول گئی تھیں۔

ان دونوں کے سراب جھوم میں گم ہو رہے تھے۔ وہ دو نقطے بنے جا رہے تھے۔

"حیا۔ حیا۔" ڈی جے کہیں دور اٹھل پھل سی سانسوں کے درمیان چلا رہی تھی مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی طرح بھیڑ کے درمیان پھر ہوئی کھڑی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت دور جا چکے تھے۔ ساکت پتلیوں میں اب دور ہونے لگا تھا۔ بالآخر بوجھ سے اس کی پلکیں گریں اور جھک کر انھیں تو منظر بھگ چکا تھا۔ اس نے پھر سے پلکیں جھپکائیں تو بھیجی آنکھوں سے

قطرے رخساروں پہ گرنے لگے۔ سامنے کا منظر قدرے واضح ہوا مگر۔

لحے بھر کی تاخیر سے اس کا تعاقب ہار گیا تھا۔ وہ دونوں بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ اپنا منظر کھو چکی تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی ٹھوڑی سے نیچے گرنے لڑھکتے گئے۔

"حیا۔ کدھر تھیں تم؟" ڈی جے نے نڈھال سی آگراں کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔ مگر حیا ابھی تک اسی سمت دیکھ رہی تھی۔

اس نے ایک ہاتھ سے اودن کا ڈمکن کھولا دوسرے ہاتھ سے گرم ٹرے باہر نکالی۔

ٹرے پہ بھوری تختہ گرم جنجر بریڈ تیار ہوئی تھی۔ اور گ کی ہلکی سی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔

وہ دوسرے ہاتھ سے جنجر بریڈ کو چیک کرتی سیدھی ہوئی اور ٹرے لا کر کاؤنٹر پہ رکھی۔ وہ سفید ڈھیلی سی آؤٹے یا زوؤں والی ٹی شرٹ اور کھلے سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا اور انجھی انجھی سی لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر پہنے ایپرن پہ جگہ جگہ چاکلیٹ اور کریم کے دھبے لگے تھے۔

مستقیم کاؤنٹر کے ایک طرف کھڑا پیالے میں انڈے کی سفیدی پھینٹ رہا تھا۔ ڈی جے دوسری طرف کھڑی سجادت کے لیے لی گئیں "ہی بیجلی اور ہینڈ کے پکٹ کھول کھول کر پلیٹ میں انڈیل رہی تھی۔ ہر رنگ کی ہینڈ کینڈیز اور سرخ جیلی لیٹنز کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

آج حسین کی سالگرہ تھی۔ روایتی طریقے سے کیک بنانے کی بجائے حیا اس کے لیے جنجر بریڈ ہاؤس تیار کر رہی تھی۔ ایک فٹ کا جنجر بریڈ سے بنا کھرجو چاکلیٹ کریم اور رنگ برنگی جیلیز سے سجانا تھا۔ وہ

پچھلے چار گھنٹے سے لگی ہوئی تھی اور اب بالآخر اس کی جنجر بریڈ کے چھ کے چھ کٹڑے بیک ہو چکے تھے۔ چار دیواروں کے لیے اور دو مخروطی چھت کے لیے۔

"آؤ اب اس کو جوڑتے ہیں۔" اس نے کہا تو مستقیم جو آؤٹنگ بنا چکا تھا پیالہ رکھ کر اس کی طرف آیا۔ ڈی جے اب ایک دیوار اٹھا کر اس میں سے مستطیل دروازہ کاٹ رہی تھی۔

حیا اور مستقیم نے احتیاط سے دو دیواریں متصل کھڑی کیں اور ان کے جوائنٹس پہ بطور گرم، مخصوص سیرپ لپ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے دونوں نے اپنے ہاتھ ہٹائے۔

دیواریں سیدھی کھڑی رہیں۔ سیرپ نے ان کو چپکا دیا تھا۔

"زبردست!" وہ پر جوش سی ہو گئی۔ اس کا گھبرن رہا تھا یہ خیال ہی اس کی ساری تھکاوٹ بھگا کر لے گیا۔

وہ دونوں اب اگلی دیوار جوڑنے لگے۔ حیا کے ماتھے سے جھولتی لٹ بار بار آنکھوں کے سامنے آتی وہ بار بار ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹاتی۔ پوروں پہ لگے چاکلیٹ سیرپ کے دھبے اس کے رخسار پہ لگ گئے مگر پروا کے تھے۔

چار دیواریں بن گئی تھیں۔ اب انہوں نے وہ مستطیل ٹکڑوں کو اوپر اٹے "وی" کی طرح رکھا اور جوڑ پر سیرپ لگایا۔ کافی دیر بعد انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

چھت برقرار رہی۔ سیرپ سوکھنے لگا تھا۔ چھت مزید مضبوط ہوئی گئی۔

"حیا! تم گرے ہو۔" وہ بھورا سا گھبرنا رنگ یا آرائش کے بھی اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ مستقیم بے اختیار ستائش سے بولا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

وہ تینوں اب الہا کینڈیز ہینڈز گور جیلیز سے دیواروں کی سجاوٹ کرنے لگے۔ وہ ہر ڈیکوریشن کے کٹڑے کے پیچھے ذرا سا سیرپ لگا کر اسے دیوار سے چپکا دیتے۔ بھورے گھر پہ جگہ جگہ سرخ، سبز اور نیلے

یشن کی مانند آنکھیں ابھرنے لگی تھیں سوزا سی دیر میں گھر چ گیا تھا۔ ڈی جے نے سفید کریم سے کھڑکیوں کی چو کو جو کھٹیں بنائیں اور اندر نیلی کریم کا رنگ بھر دیا۔ ”اب استنبول کی برف باری کا مزا اپنے گھر کو بھی چکھائیں۔“

حیا آنسنگ شوگر اور چھلنی لے آئی۔ اس نے سفید سوکھے آٹے کی شکل کی آنسنگ شوگر چھلنی میں ڈالی اور گھر کے اوپر کر کے چھلنی آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ چھلنی کے سوراخوں سے سفید ذرے نیچے گرنے لگے۔ بھورے گھر پہ برف باری ہونے لگی اور ایک ہلکی سی سفید تہ چاکلیٹ سے ڈھکے گھر پہ بیٹھنے لگی۔ ”حیا! جبر بریڈ ہاؤس تیار تھا۔“

اس نے احتیاط سے ٹرے اٹھائی۔ گھر پر قرار رہا۔ اس کی ساڑھے چار گھنٹوں کی محنت کا ثمر تھا۔ کسی سالگرہ کی تقریب سے پہلے حیا سلیمان تک سک سے تیار نہ ہو، حیرت انگیز بات تھی، مگر آج اس کی تیاری وہ گھر ہی تھا۔ اسے اپنے رف جیلے ایپرن اور چہرے پہ لگے دھبوں کی پروا نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ ٹرے میں رکھے جبر بریڈ ہاؤس پہ تھی۔

وہ ڈی جے اور معتمد کے پیچھے چلتی کامن روم میں داخل ہوئی۔

وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے درمیانی میز پہ گفٹس اور حسین کا لایا ہوا ایک رکھا تھا۔ بارہ ممالک کے ایک پیچھ اسٹوڈنٹس آچکے تھے۔ وہ کوئی سربراہنہ نہ تھی۔ سو حسین بڑی میز کے پیچھے کھڑا ہوتا ہوا ٹال کا گفٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا جسے ٹال بار بار پیچھے کر رہی تھی۔

”سربراہنہ!“ حیا نے پکارا تو سب نے اوہر دیکھا۔ معتمد اور ڈی جے کے پیچھے وہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائی ٹرے میں وہ فیری ٹیل ہاؤس رکھا تھا اور حیا کو پتا تھا وہ ہینسل اور گرٹل کے جبر بریڈ ہاؤس سے زیادہ خوب صورت تھا۔

”واؤ!“ بے اختیار بہت سے لبوں سے ستائش نکلی۔

”حیا۔ تم نے میرے لیے اتنا کیا؟“ حسین بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا اور سردی اندر آ رہی تھی۔

”آؤ حیا! اسے میز پہ نلے آؤ۔“ معتمد بڑی میز پہ گفٹس، ٹیک اور دو سری ڈشز کے درمیان چیزیں ہٹا کر جگہ بنانے لگا۔

سردی کی لہر دروازے سے اندر گھس رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ٹرے پکڑے، دایاں ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلا ناچا۔ وہ بد قسمتی کا لمحہ تھا۔

دروازے کے تاب کو اس نے چھوای تھا کہ دروازہ زور سے پورا کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کھلتے دروازے نے اس کا بڑھا ہاتھ پیچھے دھکیلا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی اور تب ہی اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی ٹرے سیرم می ہوئی۔

”اؤہ! بہت سی دلدوز چینی بلندی ہوئیں اور ان میں سب سے دل خراش اس کی اپنی چیخ تھی۔

الٹی ہوئی ٹرے اس کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہلکی سی ٹھڈ کی آواز کے ساتھ جبر بریڈ ہاؤس زمین پہ جا گرا۔ ہر دیوار ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ہینڈ اور جہلاز اوہر اوہر بکھر گئیں۔

فرش پہ بریڈ چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگ ہینڈیوں کا ایک طبع پڑا تھا اور وہ سب شانے کے عالم میں پٹی پٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

کتنے ہی بل وہ شاک کے عالم میں اس طبع کو دیکھے گئی، پھر اس کے پار نظر آتے جو گرز کو دیکھا اور اپنی ششدر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

وہ جہان سکندر تھا اور اتنی ہی بے یقینی و شاک سے اس طبع کو دیکھ رہا تھا۔ حیا کے دیکھنے پہ بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”حیا۔ آئی ایم سوری۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سامنے آؤ۔“

گاڈ۔“ متاسف ملال کے مارے وہ کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔

وہ جو پٹی پٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، ایک دم لب بلب گئی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر کی جگہ فحش نے لے لی۔ خون کی سرخ لکیریں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ وہ ایک دم جھکی، بریڈ کا ٹوٹا کریم میں لتھڑا ٹکڑا اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے پوری فوت سے جہان کے منہ پہ دے مارا۔

وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کریم میں لتھڑا ٹکڑا اس کی گردن پہ لگا تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ ٹکڑا اس کی شرٹ پر سے پھسلنا نیچے قدموں میں جا گرا۔

اس نے گردن پہ لگی کریم کو ہاتھ سے چھوا اور پھر انگلیوں کے پوروں کو بے یقینی سے دیکھا۔

”حیا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔“ وہ سرخ آنکھوں سے لب بلب جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لب اتنی سختی سے پیچھنچ رکھے تھے کہ گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں اور کپٹی پہ نیلی لکیر نظر آرہی تھی۔ وہ بالکل چپ کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

”حیا۔ اٹس اوکے۔“ حسین پریشانی سے آگے بڑھا۔ ڈی جے اور معتمد اس کے ساتھ تھے۔

”حیا! میں نے واقعی نہیں دیکھا تھا کہ تم۔“

”شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ!“ وہ اتنی زور سے چلائی کہ آگے بڑھتا حسین وہیں رک گیا۔

”چلے جاؤ تم یہاں سے۔ کہیں بھی چلے جاؤ مگر میری زندگی سے نکل جاؤ۔ تم میرے لیے عذاب اور دکھ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لائے۔ نکل جاؤ اس کمرے سے۔“ اس نے اردو میں چلا کر کہا تھا۔ بارہ ممالک کے ایک پیچھ اسٹوڈنٹس میں سے اردو کوئی نہیں سمجھتا تھا سوائے ڈی جے کے، مگر وہ تمام متاسف کھڑے طلبا سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”حیا۔!“ جہان کی آنکھوں میں دکھ ابھرا۔

”میرا نام بھی مت لو۔“ اس نے گردن کے گرد

بندھے ایپرن کی ڈوری ہاتھ سے لوجی، ایپرن ایک طرف اتار پھینکا اور بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب اس کے آتے ہی جل اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے چکر دار سیڑھیاں اترنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے پہ بہہ رہے تھے۔ آخری سیڑھی پھلانگ کر وہ اتری اور برف سے ڈھکی گھاس پہ تیز تیز چلنے لگی۔

باہر تیز سرد ہوا تھی۔ ہلکا ہلکا سا کھرہ سوچھایا تھا۔ وہ سینے پہ بازو کیٹے، سر جھکائے روتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ وہ ایک جبر بریڈ ہاؤس کے لیے نہیں رو رہی۔

پہاڑی کی ڈھلان اتر کر سامنے سبانی کی مصنوعی جھیل تھی۔ جھیل اب خاصی پکھل چکی تھی، پھر بھی فاصلے فاصلے پہ بڑے بڑے برف کے ٹکڑے تیرتے نظر آرہے تھے۔

وہ جھیل کے کنارے رک گئی۔ تیز دوڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ تکی ٹی شرٹ میں سردی لگنے لگی تھی۔ ڈھیلہ جوڑا آدھا کھل کر کمر پہ گر گیا تھا۔

وہ کھکی ماندی سی گھاس پہ بیٹھ گئی اور سیلہ ز سے پاؤں نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ وہ خود اذیتی کی انتہا تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر نیچے جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مصنوعی جھیل کا پانی رات کے اندھیرے میں چاندی کی روشنی سے چمک رہا تھا، گویا چاندی کا ایک بڑا سا ورق سیاہ پانی پہ تیر رہا ہو۔ دور جنگل سے برندوں کی آواز دھن دھن سے سنائی دیتی تھی۔ کئی لمحے ریت کی طرح پھسل کر جھیل کی چاندی میں گم ہو گئے تو اس نے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اس کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

اس نے بھیجا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب کاٹا سنجیدہ سا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

”سوری حیا! میں تو معذرت کرنے آیا تھا کہ اس روز کام کی پریشانی میں تم سے مس بی ہو کر گیا مگر۔“

وہ جب چاہے آواز دیتی اسے دیکھ گئی۔
 ”آئی ایم ریلی سوری۔ میں نے تمہارا اتنا نقصان
 کر دیا۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا، مجھے معلوم
 نہیں تھا کہ تم دروازے کے پار کھڑی ہو۔ میں نے
 تمہارا برعہا ہوا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنی دانست میں
 میں بہت تیز چل رہا تھا اور انجانے میں تمہارا ہاتھ
 دھکیل دیا۔ تمہاری ساری ریاضت ضائع کر دی۔“
 شاید وہ صرف جنجر ریڈ ہاؤس کی بات کر رہا تھا یا شاید
 ان کے تعلق کی۔

”مگر میں مدد کروں گا۔“
 ”مدد؟“ اس کے ہتے آنسو پل بھر کو تھے۔
 ”ہاں! میں تمہیں بالکل ایسا جنجر ریڈ ہاؤس بنا کر
 لا دوں گا۔“

اور اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر پھر سے دو

”مائی فٹ جمن سکندر!“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی
 اور کیلے پیر پانی سے نکل کر سہلہ ز میں ڈالے۔
 ”میری زندگی میں جنجر ریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل
 ہیں۔“

وہ تیزی سے پٹی توڑ دھیلے جوڑے کا آخری بل بھی
 کھل گیا اور سارے بل آبشار کی طرح کربہ سیدھے
 کرتے گئے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اوپر دھلانہ پہنچنے لگی۔
 جہاں لب کاٹا اسے دور جاتے دیکھا رہا۔

وہ نیکی سے ٹیک لگائے پاؤں لے کے کبل میں
 لپٹی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے موبائل تھامے وہ نیم
 کھیل رہی تھی۔

ساتھ والے بینک پہ ٹلی مینہ پہ تکیہ رکھے سوری
 تھی، چیری اسٹڈی دوم میں تھی۔ خدیجہ نیچے اپنے
 بینک کی کرسی پہ بیٹھی میز پہ رکھے لیپ ٹاپ کی سنجیوں
 پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

”حسین کا برتھ ڈے جنجر ریڈ ہاؤس ٹوٹنے سے

خراب نہیں ہوا“ اس کا برتھ ڈے تمہارے اوور ری
 ایکشن سے خراب ہوا ہے۔ تم نے اپنے کرن کے
 ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس کا تصور نہیں تھا۔ اس نے
 تمہیں واقعی نہیں دیکھا تھا۔ اگر تم تھوڑا سا ضبط
 کر لیتیں اور کھلے دل سے اپنے کرن کو دیکھ کر قریں تو
 ہم اسی ٹوٹے جنجر ریڈ ہاؤس کو یاد گار بنالیتے۔ اسے ایک
 دوسرے کے چروں پہ ملتے، اس کے ساتھ تصویریں
 کھینچتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں،
 ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے
 ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان
 کو کوئی چیز نہیں ہر اسکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان
 لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر ریڈ ہاؤس
 سے ہار مان لی۔“

لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ لگا ہیں جمائے ڈی جے
 تیزی سے کچھ ٹاپ کرتی کہہ رہی تھی۔

حیا اسی طرح بل چباتی موبائل کے بٹن دباتی
 رہی۔

”تمہارے جانے کے بعد سب اتنے شرمندہ تھے
 کہ مت پوچھو کس طرح میں نے بمشکل سب کو منا کر
 حسین سے ٹیک کٹوایا۔“

ولعتنا ”حیا کا موبائل بجاتا ڈی جے خاموش ہو گئی۔
 حیا نے لب بھیجے اسکرین کو دیکھا۔ وہاں جہاں کا
 موبائل نمبر لکھا آ رہا تھا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ کل
 مسترد نہ کر سکی۔

”کیا ہے؟“ اس نے فون کلن سے لگا کر بت آہستہ
 سے کہا۔

”بھی تک خفا ہو؟“ وہ ایک دم اتنی اپنائیت سے
 پوچھنے لگا کہ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ حلق میں آنسوؤں کا
 گولہ سا نکلنے لگا۔

”خفا ہونے کا اختیار اپنوں کو ہوتا ہے، مجھے یہ اختیار
 کبھی کسی نے دیا ہی نہیں۔“

”تنے لے مکالے مت بولو۔ مجھ سے اب سردی
 میں نہیں کھڑا ہوا جا رہا۔ فوراً باہر آؤ۔“
 وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”تم کہاں ہو؟“ آنسو غائب ہو گئے۔
 ”تمہارے دورم کے باہر بالکونی میں کھڑا ہوں۔“
 ”میرے اللہ! تم اب تک یہیں ہو؟“ وہ فون
 پھینک کر اٹھی، تیزی سے سیڑھیاں پھلا نکلتی نیچے
 اتری اور دوڑ کر دروازہ کھولا۔
 وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، سینہ پہ بازو لپیٹے
 کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”اف جہاں!“ حیا دروازہ بند کر کے اس تک آئی۔
 اس نے ٹی شرٹ کے اوپر ایک کھلا سیاہ سویٹر پہن
 لیا تھا اور بالوں کا پھر سے ڈھیلا جوڑا باندھ لیا تھا۔
 آنکھیں ہنوز متورم تھیں۔

”کب سے کھڑے ہو اوھر؟“ وہ حلق سے کستی اس
 کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

”جب سے تم نے بتایا تھا کہ تمہاری زندگی میں جنجر
 ریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔ میں نے سوچا جان کو
 حل کیے بغیر نہ جاؤں۔ چائے تو نہیں پلاؤ گی؟“
 وہ کچھ ایسے ڈرتے ڈرتے بولا کہ وہ ساری تلخی بھلا
 کر خس دی۔

”آؤ! تمہیں ایل ٹی پلائی ہوں۔ تمہارے ترکی کی
 سوغات ہے ورنہ پاکستان میں تو ہم نے کبھی سیب دانی
 چائے نہیں پی تھی۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ اندرونی
 سیڑھیاں اترنے لگے۔

”اور ہم یہی بی کر بڑے ہوئے ہیں۔ کتنا فرق ہے
 ناہم میں۔“ وہ شاید یونہی بولا تھا۔ مگر کچن کا دروازہ
 کھولتی حیا نے مڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا۔

”ہاں بہت فرق ہے ہم میں۔“ اس نے تسلیم کر لیا
 تھا۔ اس نے ہار مان لی تھی اور انسان کو کوئی چیز نہیں
 ہر اسکتی جب تک۔ اف یہ ڈی جے کے سنہری اقوال
 بھی نا۔!

وہ سر جھٹک کر کچن میں داخل ہوئی۔
 ”ایل ٹی تو ختم ہے اب ساہ چائے پیو۔“ اس نے

کیبنٹ کھول کر چند ڈبے آگے پیچھے کیے اور پھر باؤسی
 سے بتایا۔

”دودھ نکالو، میں چائے کا پانی چڑھاتا ہوں۔“ وہ

آگے بڑھا، دیکھی ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکلی، اس میں پانی اور
 جی ڈال کر چوڑے پہ چڑھایا اور چولہا جلادیا۔ وہ ایسا ہی
 تھا۔ فوراً سے کام کر دینے والا۔ اس کے ہاتھ بہت
 سخت اور مضبوط سے لگتے تھے۔ کام کے، محنت اور
 مشقت کے عادی۔ وہ استنبول کی ورکنگ کلاس کا
 نمائندہ تھا۔ اب وہ سلیب پہ رکھے برتن جمع کر کے
 سنک میں ڈال رہا تھا۔

”رہنے دو جہاں میں کر لوں گی۔“
 ”تم نے کرنے ہوتے تو اب تک کر چکی ہوتیں۔
 اب اس سے پہلے کہ پانی سوکھ جائے، دودھ ڈال دو، بلکہ
 مجھے دو۔“ اس نے پلیٹ دھوتے ہوئے دوسرے ہاتھ
 سے دودھ کا ڈبا اٹھایا اور خود ہی دیکھی میں اٹھیل دیا۔ وہ
 اسے دیکھ کر رہ گئی۔

وہ کھلے تل تلے پلیٹ کھنگال رہا تھا۔ جینز اور جوکرز
 بنے سویٹر کی آستینوں کینیوں تک موڑے، وہ ٹاسم
 اسکوائر کی میٹرو میں موجود اس ایگزیکٹو سے قطعاً
 مختلف لگ رہا تھا جس سے چند ہفتے قبل حیا ملی تھی۔
 ”حیا۔ حیا۔“ ڈی جے حواس باختہ سی چلاتی ہوئی
 کچن میں داخل ہوئی۔

”تمہارا فون مر جائے گا بیج بچ کر۔“ وہ السلام
 علیکم۔ ”جہاں کو دیکھ کر وہ کڑ بڑا گئی اور رک کر سانس
 لینے لگی۔ اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔

”و علیکم السلام!“ جہاں پلیٹ کر اسے جواب دیا۔
 ”تمہارا فون!“ وہ حیا کو موبائل تھما کر واپس مڑ گئی۔
 حیا نے موبائل پہ دیکھا۔ پانچ مسئلہ کالز۔ ترکی کا
 کوئی غیر شناسا نمبر۔

اسی وقت اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے
 اسکرین کو دیکھا۔ وہی ترکی کا نمبر۔ اس نے کال وصول
 کر لی۔

”ہیلو؟“ جب وہ بولی تو اس کی آواز میں تذبذب
 تھا۔

”حیا سلیمان؟ بندے کو عبدالرحمان پاشا کہتے
 ہیں۔ اب تک تو آپ مجھے جان گئی ہوں گی۔“ وہ شستہ
 اردو میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں محبتی کے

باسیوں کا تیکھا بن تھا اور لہجہ بہت ٹھنڈا۔
 حیا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر جہان کو
 دیکھا۔ وہ بہت عورتوں سے اس کے چہرے کے آثار چہاؤ
 دیکھ رہا تھا۔
 ”رائنگ نمبر!“ اس نے کہہ کر فون رکھنا چاہا مگر وہ
 آگے بڑھا اور موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
 ”کون؟“ وہ فون کان سے لگا کر بولا۔ تو اس کے
 چہرے پہ بے پناہ سختی تھی۔
 ”کون؟“ اس نے دہرایا۔ شاید وہ سری جانب سے
 کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا جہان لب بھنجے چند لمحے
 انتظار کرتا رہا پھر اس نے فون کان سے ہٹایا۔
 ”بند کر دیا ہے۔“ اس نے موبائل حیا کی طرف
 بڑھاتے ہوئے جانتی، مشکوک نگاہوں سے اسے
 دیکھا۔ ”کون تھا؟“
 ”تمہیں نہیں بتایا تو مجھے کیوں بتاتا۔ شاید رائنگ
 نمبر تھا۔“ وہ اب سنبھل چکی تھی۔
 ”ہوں! تمہیں کوئی تنگ تو نہیں کر رہا؟“ پھر جیسے
 وہ چونکا۔ ”وہ پھول۔۔۔“
 ”پتا نہیں کون ہے۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔
 ”جائے دو۔“
 ”ہر اس منٹ ایک جرم ہے، ہم اس کے لیے
 پولیس کے پاس جاسکتے ہیں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔
 کسی مسئلے کا حل جہان سکندر کے پاس نہ ہو، یہ
 ممکن تھا بھلا؟
 ”جائے دو۔ میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ خود
 ہی تھک کر رک جائے گا۔“ گوکہ وہ مطمئن نہیں ہوا
 تھا مگر سر ہلا کر پلٹ گیا اور تل پھر سے کھول دیا۔
 حیا نے موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر جیب میں ڈال
 دیا۔ وہ اس نازک رشتے میں مزید بدگمانی کی متحمل نہ
 تھی۔
 ”چولہا کیوں بند کر دیا؟ ابھی پکنے دیتیں، میں زیادہ
 کڑھی ہوئی چائے پینے کا دعاوی ہوں۔“
 ”میں نے نہیں بند کیا، یہ آٹومیک ہیں، ہر بندہ
 منٹ بعد دس منٹ کے لیے بند ہو جاتے ہیں، مودس

منٹ بعد خود ہی جل اٹھے گا۔“
 ”یہ اچھا کام ہے!“ اس جیسے کو فٹ ہوئی، پھر آخر
 برتن کھنگالتے ہوئے وہ بار بار چولہے کو سوچتی نظروں
 سے دیکھتا رہا۔ جب برتن ختم ہو گئے تو ہاتھ دھو کر
 چولہے کی طرف آیا۔
 ”برتن دھل گئے ہمارے، اب تمہاری زندگی کے
 اگلے مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کون سا
 مسئلہ ہے، وہ بھی بتاؤ۔“ وہ چولہے کو پھر سے جلائے کی
 کوشش کرنے لگا۔
 ”میری زندگی کے مسئلے ٹوٹے کیبنٹ یا ٹھنڈے
 چولہے کی طرح نہیں ہیں جو تم حل کر لو۔“
 ”اچھی بھلی زندگی ہے تمہاری، کیا مسئلہ ہے
 تمہیں، سوائے اس بے کار چولہے کے، کوئی تو حل ہو گا
 اس کا بھی۔“ وہ نچلا لب دبائے جھک کر سوچ سے چھینر
 چھاڑ کر رہا تھا۔
 ”اس کا کوئی حل نہیں ہے۔“
 ”یہ ناممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو۔
 ٹھہرو! میں کچھ کرتا ہوں۔“ وہ بچوں کے بل نشن پہ
 بیٹھا اور جھک کر نیچے سے چولہے کا جائزہ لینے لگا۔
 ”جہان! رہنے دو!“
 ”میری کار سے میرا ٹول بکس لے آؤ۔ ڈیش بورڈ
 میں پڑا ہو گا۔ تب تک میں اسے دیکھتا ہوں۔“ وہ جینز
 کی جیب سے چابیوں کا پچھا نکال کر اس کی طرف
 بڑھائے گردن نیچے جھکائے چولہے کے ارد گرد جیسے
 کچھ تلاش کر رہا تھا۔
 وہ جہان ہی کیا، جو کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پھر کسی
 کی سنے۔ اسے میٹرو میں اپنے جوتے کے تسمے کھولتا
 جہان یاد آیا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر ہاتھ بڑھا کر
 چابی پکڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
 جہان کی چھوٹی سفید سی کار ہاسٹل کی سیڑھیوں کے
 آخری زینے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس میں سے
 ٹول بکس نکالتے ہوئے حیا نے بے اختیار سوچا تھا کہ وہ
 اتنا امیر نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی، یا پھر شاید یورپ
 میں رہنے والے رشتہ داروں کے بارے میں عمومی

دریہا ہوتا ہے کہ وہ خاصے دولت مند ہوں گے،
 کہ جہان اور سین پھپھو اس کے برعکس محنت کش،
 اور لنگ کلاس کے افراد تھے۔
 وہ واپس آئی تو وہ چھری سے ہی شروع ہو چکا تھا اور
 ہاپ، ساکٹ اور پتا نہیں کیا کیا کھولے بیٹھا تھا۔
 چند منٹ وہ خاموشی سے سلیب کے ساتھ ٹیک
 گائے کھڑی اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ وہ دائیں گھٹنے
 اور بائیں پنجے کے بل زمین پہ بیٹھا ہاپ کے دہانے پہ
 آج کس سے کچھ کھول رہا تھا۔ ٹول بکس اس کے پاؤں
 کے ساتھ فرش پہ کھلا پڑا تھا۔
 چند مبر آزما پل بیٹے اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں ہاتھ
 بھاڑتے ہوئے اٹھا۔
 ”یہ چوتھا چولہا جو کونے میں ہے، یہ فکس کر دیا
 ہے، اب یہ خود سے نہیں بجھے گا۔“ اس نے کہنے کے
 ساتھ ہی عملی مظاہرے کے طور پہ چوتھے چولہے کو جلا
 دیا اور پھر چائے کی کیتلی اسی پہ رکھ دی۔
 ”یہ جو تم نے حرکت کی ہے نا جہان سکندر! یہ غیر
 قانونی ہے اگر کسی کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟“
 ”سبائچی میں اسموکنگ بھی غیر قانونی ہے، مگر
 اسٹوڈنٹس کرتے ہیں نا؟ ڈرنک بھی غیر قانونی ہے،
 اسٹوڈنٹس وہ بھی کرتے ہیں اور کمروں میں چھوٹے
 چولہے اور مائیکرو ویو رکھنا بھی غیر قانونی ہے، وہ بھی
 رکھتے ہیں نا؟ سو تم بھی کرو!“ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے
 کھڑا بڑی لاپرواہی سے بولا تو وہ ہنس دی۔ اسے اپنا
 سروے فارم یاد آ گیا تھا۔
 ”تم سبائچی سے پڑھے ہو جو اتنی معلومات ہیں؟“
 ”سبائچی سے پڑھا ہوتا تو ایک چھوٹا سا ریٹورنٹ
 نہ چلا رہا ہوتا۔ ہم تو عام سی سرکاری یونیورسٹیز میں
 پڑھنے والے مل کلاس لوگ ہیں مادام!“ وہ جب بھی
 اپنی کم آمدن یا کام کا ذکر کرتا اس کے بظاہر مسکراتے
 لہجے کے پیچھے ایک تلخ اداسی سی ہوتی۔ ایک احساس
 کمتری یا پھر شاید یہ اس کا وہم تھا۔
 ”خیر!“ حیا گہری سانس لے کر چولہے کی طرف آئی
 اور چائے کی کیتلی اٹھالی۔ ٹرے میں پیالیاں اس نے

پہلے سیٹ کر رکھی تھیں، اب وہ چھلنی رکھ کر چائے
 انڈیلنے لگی۔
 ”اس دیک اینڈ۔ ڈنر کریں ساتھ؟“
 اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، ذرا سی چائے
 چھلنی کے دہانے سے پھسل کر پیالی پکڑے اس کے
 ہاتھ پہ گری، مگر وہ بے حد حیرت و بے یقینی سے جہان کو
 دیکھنے لگی۔
 ”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ نہیں کرتے۔ غلطی سے کہہ
 دیا۔“ وہ جیسے شرمندہ ہو گیا۔
 ”نہیں! نہیں! میرا مطلب ہے، ٹھیک ہے شیور،
 مگر کہاں؟“ وہ جلدی سے بولی مبادا وہ کچھ غلط نہ سمجھ
 لے، پھر اپنی جلد بازی پہ بھی خفت ہوئی۔
 ”استقلال جدی میں کہیں بھی۔ تمہیں بس ٹائم
 پہ اتارتی ہے نا؟“ حیا نے اس کی پیالی اٹھا کر اسے دی تو
 اس نے سر کے ذرا سے اثبات کے ساتھ تھام لی۔
 ”ہاں۔“ وہ اپنی پیالی لے کر اس کے بالقابل
 سلیب سے ٹیک لگائے کھڑی ہو گئی اور چائے میں کچ
 ہلانے لگی۔
 ”پھر میں تمہیں ٹائم سے پک کر لوں گا۔ ہفتے کی
 رات، آٹھ بجے ٹھیک؟“
 ”ٹھیک۔“ وہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا دی۔
 جب وہ اسے واپس باہر تک چھوڑنے آئی تو دونوں
 کو اپنے نیچے پا کر بالکونی کی بتی خود سے جل اٹھی۔ وہ
 سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ ہولے سے کہہ
 اٹھی۔
 ”آئی ایم سوری، میں آج اور ری ایکٹ کر گئی تھی،“
 جہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
 ”کچن کے سارے برتن دھوا کر، چولہا ٹھیک کروا کر
 اور چائے کے دو کپ بنوا کر تم نے بالآخر مان ہی لیا۔
 بہت شکریہ۔ اب میں سکون سے سو سکوں گا۔“ وہ گویا
 بہت تشکر اور احسان مندی سے بولا تھا۔
 وہ خفت سے ہنس دی۔ ”کہنا سوری۔“
 ”سوری مجھے بھی کرنی چاہیے، مگر وہ میں ڈنر پہ کر
 دوں گا، ادھار رہا۔ ہفتے کی شام آٹھ بجے، شارپ!“

”مجھے یاد رہے گا۔“ وہ سیڑھیاں اترنے لگا اور حیا سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ جب اس کی کارنگاہوں سے اوچھل ہو گئی تو وہ کمرے کی طرف مڑ گئی۔ بالکونی کی بنی بجھ گئی۔ سارے میں تاریکی چھا گئی۔ ڈی جے وہیں کرسی پہ بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

وہ زیر لب کوئی دھن گنگنائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بنگ کے زینے چڑھنے لگی۔

”تمہارا کزن بڑا پنڈ سم ہے۔“ ڈی جے نے مصروف انداز میں بھروسہ کیا۔

”سو تو ہے۔“ اس نے بستر میں لیٹ کر ڈی جے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ وہی پچھو کا بیٹا ہے نا؟“ ڈی جے اسکرین کو دیکھتی لیپ ٹاپ کی سنجیوں پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

”ہوں!“

”وہی شادی شدہ؟“

”ہاں۔“ اس کے لبوں پہ ایک دبی دبی مسکراہٹ در آئی۔

”اچھا!“ ڈی جے مایوسی سے خاموش ہو گئی۔

حیا زیر لب وہی دھن گنگنائے لگی۔

”بکومت۔“ مجھے اسانمنٹ بنانے دو۔“ کچھ دیر بعد ڈی جے جھنجھلا کر بولی مگر وہ مسکراتے ہوئے گنگنائے جا رہی تھی۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے وحشیلا تو وہ ایک ناگوار مگر آہستہ آواز کے ساتھ کھلا چلا گیا۔

سامنے لاؤنج میں ابتری پھیل چکی تھی۔ چھوٹا سا کچن بھی ساتھ ہی تھا جس میں اس کی بیوی کام کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ہاشم قدم قدم چلتا کچن کے دروازے پہ آکھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اس کی جانب پشت کیے چولہا جلا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح تھی۔ دروازہ کھٹکھٹا لے

سیاہ بال اور اٹل جیشہ کی سی مخصوص مولی سیاہ

آنکھیں۔

”ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟“

وہ چونک کر بٹنی۔ پھر اسے ویکہ کر گہری سانس لی اور واپس چولہے کی طرف مڑ گئی۔

”سرجری ہوگی اور اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔“

وہ خاموشی سے کھڑا انتظار کیا۔

”پیسوں کا انتظام ہوا؟“ وہ کپڑے سے ہاتھ پونچھتی ہاشم تک آئی اور پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

”تو اب کیا ہوگا؟ ہمیں انہی چند ہفتوں میں ہزاروں لیرا جمع کرنے ہیں۔ تم نے پاشا سے بات کی؟“

”کی تھی۔“

”تو کیا کہتا ہے وہ؟“ وہ بے قرار ہوئی۔

”نہیں دے گا۔ جو کام میں کر رہا ہوں، بس اس کی قیمت دے گا۔ اور ایک کرش بھی نہیں۔“

”کیوں؟ اتنا تو پیسہ ہے اس کے پاس۔ پورا محل تو کھڑا کر رکھا ہے بیوک اوا میں، پھر ہمیں کیوں نہیں دے گا؟“

”وہ کہتا ہے اس نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا اور پھر مزید کس کھاتے میں دے؟ میں نے ابھی تک اس کی پچھلی رقم نہیں لوٹائی۔“

”ہاں تو وہ حادثہ کے علاج پہ لگ گئے تھے کوئی جوا تو نہیں کھیلتے ہم۔“ اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کپڑا میز پر دے مارا۔

”وہ نہیں دے گا میں کیا کروں؟“ وہ بے حد مایوس تھا۔

”مجھے نہیں پتا ہاشم! کہیں سے بھی ہو، تم پیسوں کا بندوبست کرو ورنہ حادثہ مرجائے گا۔“

ہاشم نے بے چارگی اور کرب سے سر جھٹکا۔

”ہاشم! کچھ کرو۔ ہمارے پاس دن بہت کم ہیں۔ ہمیں پیسے چاہییں ہر حال میں۔“

”گرتا ہوں کچھ۔“ وہ جس شکستگی کے عالم میں آیا تھا اسی طرح واپس پلٹ گیا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ نظر

لی لکیوں کا جل۔ بچھا تھا اور چال میں واضح مایوسی تھی۔ وہ مضطرب سی انگلیاں موڑتی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی، پھر ایک نظر کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی، مہل ان کا بیٹا سو رہا تھا اور سر جھٹک کر واپس سنگ کی طرف پلٹ گئی، جہاں بہت سے کلام اس کے فتنہ گر تھے۔

ڈی جے نے دروازہ کھولا تو وہ اسے آئینے کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے آئی اور حیا کے سامنے کھڑے ہو کر پوری فرصت سے اور بہت مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں مسکارا برش تھا اور وہ آئینے میں دیکھتی، آنکھیں کھولے احتیاط سے پلکوں سے برش مس کر رہی تھی۔ مگر اکا جمل سیاہ سنہری سا آئی شیڈ اور لبوں پہ چمکتی گلابی لب اسٹک وہ بہت محنت سے تیار ہو رہی تھی۔

بال یوں سیٹ کر رکھے تھے کہ اوپر سے خند سے آتے بال کانٹوں کے نیچے سے مڑ کر ٹھنکریا لے ہو جاتے تھے۔ بالوں پہ اس نے کچھ لگا رکھا تھا کہ وہ گیلے گیلے سے لگتے تھے اور جو فراک اس نے پہن رکھا تھا اس کی اوپری بیٹی قدیم طرز کے سنہری سکوں سے بھری تھی۔ آستین بہت چھوٹی تھیں اور ان پہ بھی سنہری سکہ لٹک رہے تھے۔

نیچے لمبے فراک کی کلیاں سیاہ تھیں۔ ٹخنوں سے ذرا سا جھٹکلیا جامہ بھی سیاہ تھا۔

”کدھر کی تیاریاں ہیں؟“ ڈی جے نے سر سے پیر نکال کر دیکھا۔

”ڈنر کی!“ اس نے لب گلوں کے چند قطرے لبوں پہ لگائے اور آئینے میں دیکھتے ہوئے ہونٹ آپس میں مس کر کے کھولے۔

”کس کے ساتھ؟“

”جہان کے ساتھ!“ بے ساختہ لبوں سے پھسلا،

لمبے بھر کو وہ چپ ہو گئی، پھر لاپرواہی سے شانے اچکائے، ویسے وہ شادی شدہ ہے۔“

”اچھا! وہ دو گھنٹے سردی میں بالکونی میں کھڑا رہتا ہے، چولہے کے تاروں میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹھیک کر دیتا ہے، سارا کچن صاف کر کے جاتا ہے، پھر تمہیں ڈنر پہ بلاتا ہے اور تم اس ساری تیاری کے ساتھ جا رہی ہو۔ پھر سوچ لو وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟“

”بکومت!“ وہ ہنستے ہوئے کرسی پہ بیٹھی اور جھٹک کر اپنی سیاہ ہائی ہیملز پہننے لگی۔

”نہ بتاؤ، میں بھی ہالنگا کر رہوں گی۔“ ڈی جے منہ پہ ہاتھ پھیرتی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

حیا نے گنگنائے ہوئے میز پہ رکھا اپنا چھوٹا سنہری کلچ اٹھایا۔ وہی داور بھائی کی مہندی والا کلچ جو اس نے جہاز میں بھی ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ اسے وہ زیادہ استعمال نہیں کرتی تھی، اب بھی کھولا تو اندر ایک حیرت کیا ہوا وزینگ کارڈ اور اتصالات کا کانٹنگ کارڈ بھی رکھا تھا جو انہوں نے اہوظ بھی میں خریدا تھا۔ اس نے موبائل

پیسے اور سبائچی کا آئی ڈی کارڈ اندر رکھا۔ کلچ چھوٹا تھا، موبائل پورا نہیں آ رہا تھا تو اس نے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا اور ”اچھا میں جلی“ کہہ کر بیٹگر پہ لٹکا اپنا سفید نرم کوٹ ایک ہاتھ سے کھینچ کر اتار اور باہر لگی۔

باریک لمبی ہیل سے پھیر لی سڑک پہ چلتے ہوئے اس نے کوٹ سیدھا کیا اور پہنا پھر چلتے چلتے سامنے سے ٹھن بند کیے۔ گور سل کا اسٹاپ ڈر اور تھا۔ اسے وہاں تک پیدل جانا تھا۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھٹکائے تیز تیز سڑک پہ چلتی جا رہی تھی۔

شام کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے گیلے ٹھنکریا لے بل کر پہ اڑ رہے تھے۔

جس لمحے وہ گور سل اسٹاپ کے قریب پہنچی اسے گور سل دور سبائچی کے گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔

ہالے نے کہا تھا جس دن تمہاری گور سل چھوٹے گی اس دن تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔ اور اس بل بے بسی و دکھ سے اس دور جانی گور سل کو دیکھ کر اسے واقعی ہالے نور بہت یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے موبائل نکالا اور جہان کو پیغام

لکھا۔
”میری گور سل چھوٹ گئی ہے مجھے پک کر لو میں اسٹاپ یہ کھڑی ہوں۔“
وہ گنتی ہی دیر وہاں سڑک پہ شملتی رہی مگر اس کا جواب نہیں آیا شاید اس غریب کے پاس جواب دینے کا بھی کریڈٹ نہیں تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ ہر موقع خوشی پر کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ ہو جاتا۔ شروع سے اب تک وہ عجیب و غریب قسم کے حالات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ وہ خواجہ سرا ڈولہ۔ وہ سفید پھولوں اور چند حرفوں کے خط کا سلسلہ۔ اور سب سے زیادہ حیران کن بات خدیجہ کے ساتھ شاپنگ مال میں اپنی ماں اور بہن کے ہمراہ وہ نوجوان جس کی گلابی پر کانٹے کا سرخ گلابی سا نشان تھا۔ جیسے جلا ہوا۔ یا۔۔۔ کوئی برتھ مارک۔

ایسا نشان تو اس نے پنکی کے ہاتھ پر دیکھا تھا۔ پھر جب وہ میٹ پر سے اپنی ویڈیو ہٹانے کے سلسلے میں میجر احمد سے ملی تو۔

حیا کے ذہن میں یکدم وہ دن کسی کوندے کی طرح لپکا۔ وہ لمحوں میں وہیں پہنچ گئی۔ اس نے بہت آہستہ سے نگاہ اٹھا کر اس نوجوان کو دیکھا تھا۔

وہ اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ گلابی کپڑے کو ہاتھ میں مسل کر چیک کرتا ہوا وہ مکمل طور پہ اپنی فیملی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ یہاں سے اس کا نیم رخ ہی دیکھ سکتی تھی۔

وہ دراز قد تھا، رنگت صاف اور آنکھوں پر فریم لیس گلاسز تھے۔ چہرے پہ متانت اور سنجیدگی تھی۔ جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا سمارٹ نوجوان تھا۔

حیا نے دوبارہ اس کے ہاتھ کو دیکھا، جس میں اس نے کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ اسی بل اس کی بہن نے وہ کپڑا نرمی سے اپنی جانب کھینچا۔ گلابی ریشم اس کی ہتھیلی

سے پھسل گیا۔ اب اس کی انگلیاں سامنے تھیں جن کے اوپری پوروں کی قدرتی لکیر پہ بھوری سی لکیر پڑی تھی۔

اسے بے اختیار شیشے میں آئی وہ انگلیاں یاد آئیں۔ بہت احتیاط سے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ خدیجہ قدرے فاصلے پہ کھڑی ڈمی کا لباس دیکھ رہی تھی۔ اس پاس کوئی اس کا جاننے والا نہ تھا۔ وہ یہاں تماشا کر سکتی تھی۔

”پنکی!۔۔۔“
اس نے دانستہ قریب کھڑے نوجوان کی طرف چہرہ کر کے با آواز بلند پکارا۔ وہ اپنی بہن کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ البتہ اس کی بہن حیا کو اپنی جانب کھٹاپا کر کچھ بولتے بولتے رکی تھی۔

”پنکی!۔۔۔“
اس نے ذرا زیادہ زور سے پکارا۔
لڑکی نے نا بھیجی سے اسے دیکھا۔ اس کی والدہ بھی بیٹی کی نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھنے لگی تھیں۔ ان دونوں کے یوں رک کر حیا کو دیکھنے کے باعث اس نوجوان نے گردن موڑ کر دیکھا۔ تو اس کا پورا چہرہ سامنے آیا اور حیا نے دیکھا اس کا آدھے سے ذرا کم چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ جھلنے کا نشان بہت گہرا نہ تھا، بس اتنا کہ آدھا چہرہ صاف گندی رنگ کا لگتا تو وہ سرا حصہ گہرا سا ڈولہ۔

”پنکی! ڈولی کہاں ہے؟“ وہ سینے پہ بازو لیٹے بڑے تکیے انداز میں بولی اور چونکہ وہ اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی تو وہ ذرا الجھ سا گیا۔

”موری؟“
”میں نے پوچھا ہے ڈولی کہاں ہے؟“
”کون؟ میں سمجھا نہیں!“ وہ جیسے مگر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اگر آپ کے دماغ پہ چوٹ آنے کی وجہ سے آپ کی یادداشت کھو گئی ہے تو بے فکر رہیے میں آپ کو یاد کرائے دیتی ہوں۔ ڈولی آپ کا وہ خواجہ سرا دوست ہے جس کے ساتھ مل کر آپ اس روز خواجہ سرا بنے سڑک پہ بھیک مانگ رہے تھے۔ پنکی نام بتایا تھا آپ

نے اپنا نہیں؟“
اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ آنکھوں میں غصہ ور آیا، تاہم وہ ذرا برداشت کر کے بولا۔
”میزم! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں آپ کو ہانسا تک نہیں ہوں۔“

”مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ آپ کی انگلیوں پہ نشان میری گاڑی کی کھڑکی کے شیشے میں پھنسنے کا باعث ہی آئے تھے۔ مجھے یاد ہے مسٹر!“
”آپ کون ہیں اور پراہم کیا ہے آپ کو؟“ وہ لڑکی مزید برداشت نہیں کر سکی تھی۔

”میں وہ ہوں جس نے آپ کے ان بھائی صاحب کو خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔“

”اٹس انف!“ اس نوجوان نے غصے سے جھڑکا۔
”میں شرافت سے آپ کی بکواس سن رہا ہوں اور آپ بے لگام ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سے آگے اگر آپ نے کوئی فضول گوئی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”اتنی ہی شرافت ہے آپ میں تو خواجہ سرا کیوں بنے ہوئے تھے؟“ کسی نے اس کے عقب میں کہا تو وہ چونکی۔ خدیجہ بہت اعتماد سے کہتی اس کے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حیا کو ایک دم ہی جیسے ڈھارس سی ملی۔

”آپ کا دماغ خراب ہے۔ اپنی بہن کو سمجھائیں، میرے بھائی سے تعارف کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے انہوں نے۔“ لڑکی بھڑک کر بولی۔

شاپ میں بہت سے لوگ سب کچھ چھوڑ کر ان کو دیکھ رہے تھے۔

”تعارف! مائی فٹ!“ جواباً خدیجہ بھی اونچی آواز میں بولی۔ ”آپ کے بھائی کو میں نے بھی خواجہ سرا بنا دیکھا تھا۔ میں ابھی دس اور لوگ لا سکتی ہوں جو اس بات کی گواہی دیں گے۔“

”عجیب خاتون ہیں آپ، خواجہ خواجہ کیے جا رہی ہیں۔ یہ تعارف کے بہانے کسی اور کے سامنے جا کر بتائیے۔“

”سر، میڈم!“ شاپ کا فیچر تیزی سے ان کی طرف آیا تھا۔ ”پلیز آپ ادھر تماشا نہ کری ایٹ کریں۔ دوسرے کسٹمرز ڈسٹرب۔۔۔“ وہ میجر صاحب۔ ”اب اس نے اس نوجوان کا چہرہ دیکھا تو شناسائی بھری حیرت سے بولا!“ ”بہت معذرت سر! آپ محترمہ۔“ وہ حیا کی طرف مڑا۔ ”آپ پلیز شور نہ کریں۔ اگر آپ نے خریداری نہیں کرنی تو آپ جا سکتی ہیں۔“ حیا کے تو ٹوٹو دیا۔ ”مگر میں کئی سہ ماہی۔“

”آپ ہونے کون ہیں مجھے شاپ سے نکالنے والے؟“
”احمد بھائی! چلیں ہم ہی چلتے ہیں۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔“ لڑکی نے حق سے اسے دیکھتے ہوئے کپڑا پھینکا اور پٹی۔ وہ نوجوان ایک تنفر بھری نگاہ اس پہ ڈال کر اپنی ماں کا شانہ تھا۔ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ احمد بھائی۔ میجر صاحب۔ تو کیا۔۔۔

”توبہ ہے! ان آج کل کی لڑکیوں کی۔“ والد صاحبہ مسلسل ناپسندیدگی سے برید پاتی نکل گئیں۔

وہ لب بھینچے کھڑی انہیں جاتے دیکھے گئی۔ اسے اس شخص کے میجر احمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

”حیا! اس سے پہلے کہ یہ فیچر ہمیں دھکے دے کر نکالے، ہم بھی کھسک جائیں۔“ ڈی جے نے اس کے قریب سرگوشی کی تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

باہر کھلی فضا میں آکر اس نے بے اختیار کہا تھا۔ ”تھینک یو ڈی جے!“ اور یہ وہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے خدیجہ کو اس کے معروف نام سے پکارا تھا۔

ڈی جے بے ساختہ ہنس دی۔
”مجھے پتا تھا آپ جھوٹ نہیں بولتیں۔ آپ نے واقعی وہی دیکھا ہو گا جو کہہ رہی تھیں۔“

”مگر ڈی جے! میں نے واقعی اسے خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔“

”جیا! آپ نے اسے بس خواجہ سرا بنے دیکھا تھا؟
تو ہو سکتا ہے وہ صرف ایڈوکر کے لیے ایسا بنا ہو۔“
”ہاں نہیں!“ اس نے بے زاری سے شانے
اچکائے۔ ”چلو چلتے ہیں۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کا
دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔
ہارن کی آواز پر وہ اپنے حال میں لوٹ آئی جہاں
ایک سیاہ چمکتی ہوئی کار اس کے عین سامنے کھڑی
تھی۔

مڈرا نیور نے ہٹن
دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور چہو ذرا سا موڑ کر
اسے مخاطب کیا۔

”مادام سلیمان؟“ ناقسم اسکوائر، جہاں سکندر۔“
ترک لب و لہجے میں ڈرا نیور نے چند الفاظ ادا کیے تو
اس نے سر ہلا دیا اور دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر
بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً ”جہاں کا ڈرا نیور تھا“ کو کہ اس نے مقرر
چہرے کے گروپسٹ رکھا تھا اور سر پر ٹوپی بھی لے رکھی
تھی۔ جیسا اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی پھر
بھی اسے گمان گزرا کہ اس نے اس سیاہ قام حبشی کو
کیس دیکھ رکھا ہے۔ کہاں یہ سوچنے کا وقت نہیں
تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے جہاں کو ”بہت شکریہ۔ میں
پہنچ رہی ہوں۔“ کہنے لگی۔

ڈرا کی ذرا اس نے نگاہ اٹھا کر بیک دیو مر میں ایک
دوبارہ دیکھا بھی مگر ڈرا نیور نے اسے کچھ یوں سیٹ کر
رکھا تھا کہ وہ صرف اپنا چہرہ ہی دیکھ سکتی تھی۔

ناقسم اسکوائر نے ہارن کی کچھنی نے اپنے پر پھیلا
رکھے تھے اور اسی مناسبت سے ہر سو بیاں جھگڑا رہی
تھیں۔ پورا اسکوائر ان مصنوعی روشنیوں سے چمک
رہا تھا۔ مجسمہ آزادی کے اطراف سے مخالف سمتوں
میں سڑکیں نکل رہی تھیں وہاں ہر سو ٹریفک کا رش
تھا۔

مجسمہ آزادی کو چاروں اطراف سے گھاس کے

ایک گول قطعہ اراضی نے گھیر رکھا تھا، جیسے کسی پھول
کی چار پتیاں ہوں اور ہر پتی کے کناروں کی لکیر پر پھریلی

روشنی تھی۔ وہاں لوگوں کی خوب چمک چمک رہی تھی۔
ڈرا نیور نے اسکوائر کے مقابل ایک عمارت کی
بیرونی دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دی۔
”جہاں سکندر!“ اس نے انگلی سے اسی دیوار کے
ساتھ ساتھ دور اشارہ کیا، جہاں جہاں کی سفید کار کھڑی
تھی۔ یوں کہ وہ دیوار کے اس کنارے پر تھی تو یہ سیاہ
کار اس کنارے پر۔

اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل احتیاط سے باہر
سڑک پر رکھی۔ ناقسم اسکوائر کو اس کی ہینڈلز پسند نہیں
تھیں اسے اندازہ تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہی موجود تھا۔ بوٹ کھول کر
وہ جھک کر کچھ تاریں جوڑ رہا تھا۔ سیاہ جیکٹ اور جینز
میں لمبوس ہمیشہ کی طرح عام سے چلتے ہیں۔

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ”سج سج چلتی
اس تک آئی۔“ وہ کچھ گنگناتے ہوئے ایک تار کو
دوسری کے ساتھ جوڑ رہا تھا۔ ہیل کی ٹکٹ ٹک پتہ رکھا
اور گردن گھما کر دیکھا۔

”السلام علیکم!“ اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے
سیدھا ہوا۔

”وعلیکم السلام!“ اس تارک کو نے میں کیا کر رہے
ہوں؟“

”میری کار ہر خاص موقع پر دعا دے جاتی ہے اب
بھی مسئلہ کر رہی ہے، خیر میں فکس کر لوں گا۔“ وہ
ہاتھ جھاڑتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

”وہ تو تم کو لوگے، تم مجھے پتا ہے۔ جہاں سکندر کے
پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”تم بتاؤ، پورے اسکوائر پر مجھے تلاشتے تمہیں کتنی
دیر لگی؟ اور بس یہ ہی آئی ہو؟“

”نہیں، تمہاری بھیجی گئی شو فرڈون کار میں آئی
ہوں۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔
”یہ طنز کرنا کہاں سے سیکھ لیے ہیں تم نے؟ میں اتنا

لہجہ بھی نہیں ہوں کہ تم یوں مذاق اڑاؤ۔“ وہ ہنس کر
سر ہٹا کر اب بوٹ بند کر رہا تھا۔
جیانے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا۔ طویل دیوار کے
اس سرے پر وہ سیاہ کار اسی طرح کھڑی تھی۔
”تمہیں میرا میسج نہیں ملا تھا؟“ وہ قدرے بے
پہلی سے بولی۔

”میسج؟“ جہاں نے جیب پتھریائی۔ ”میرا
موبائل کہاں لیا؟“ اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا
اور اپنا اسمارٹ فون نکالا، پھر اس کی اسکرین کو انگلی سے
پھولا۔

”نہیں!“ اس نے اسکرین جیا کے چہرے کے
سامنے کی۔ وہاں ان باکس کھلا تھا اور جیا کا کوئی پیغام نہ
تھا۔ جیانے بے اختیار اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کو
دیکھا۔ اس پر پیغام رخصتے کا نشان نظر آ رہا تھا، اس نے
جلدی سے بین دباتے ہوئے آؤٹ باکس کھولا۔ اس
کے دونوں پیغام وہیں پھنسے ہوئے تھے۔ غالباً ”ہیلنس
بالکل ختم تھا۔“

”کوئی خاص بات تھی کیا؟“ وہ کار کو لاک کر رہا تھا۔
”تم نے مجھے اس پارکنگ ایریا میں ڈنر کرانا ہے یا
کسی مہذب جگہ پر؟“ وہ بات بدل گئی۔ کٹھنیوں سے
اس نے اس لٹل ہنسن چمکتی سیاہ کار کو دیکھا، جو دور
کھڑی تھی۔ اسے کس نے بھیجا؟ وہ کچھ بھی سمجھنے سے
قاصر تھی۔

”اگر یہ کار میرا اتنا وقت ضائع نہ کراتی تو میں اب
تک کسی ریستورنٹ میں جگہ ڈھونڈ بھی چکا ہوتا۔ لیکن
اب بھی دیر نہیں ہوئی۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ سڑک
کے کنارے چلتے گئے۔

استقلال اسٹریٹ تھی وہ طویل گلی ناقسم اسکوائر کے
ساتھ سے ہی نکلتی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی، سو
استقلال اسٹریٹ روشنیوں میں نہائی، رنگوں اور
لعموموں سے سچی رونق کے عروج پر تھی۔ وہاں لوگ
ہمیشہ کی طرح دونوں اطراف میں تیز تیز چلتے جا رہے
تھے۔ گلی کی دونوں جانب چمکتے شیشوں والی شاہیں اور
ریستورنٹس میں خاصا رش تھا۔

وہ آغاز میں ہی دائیں طرف کی قطار میں بنے ایک
ریستورنٹ میں چلے آئے۔

زرد روشنیوں سے مزین چھت اور جھگڑاتے
فانوس نے ریستورنٹ کے ماحول کو ایک خواب ناک سا
تاثیر دے رکھا تھا۔ اس کو نے والی خالی میز کے ساتھ
رکھے اسٹینڈ پر جیانے کوٹ اتار کر لٹکایا اور جہاں کے
مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ زرد روشنیوں میں اس کے
فراک کے سنہری سسے چمکنے لگے تھے۔ اس نے دائیں
بازو میں ایک سنہری کڑا پہن رکھا تھا اور اسے کہنی میز
پر رکھ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کڑے کو گھما رہی
تھی۔ سنہری کچ اور موبائل اس نے میز پر ہی رکھ دیا
تھا۔

”آؤر میں کروں یا تم؟“

”دعوت تمہاری طرف سے ہے، سو تم کرو۔“ اس
نے ذرا سے شانے اچکائے۔ جہاں نے مسکرا کر سر کو
خم دیا اور مہینو کارڈ کھول کر اسماک سے بڑھنے لگا۔
اپنی عاوت کے مطابق وہ پڑھتے ہوئے نچلے لب کو
دانت سے دبائے ہوئے تھا۔

جیانے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ استقلال
جدی میں کتنے ہی لوگوں نے مرمر کر اس قدیم یونانی
دیویوں کے سے سکھار والی لڑکی کو ستائش سے دیکھا تھا،
مگر یہ عجیب شخص تھا۔ کوئی تعریف نہیں، کوئی اظہار
نہیں، اتنی لا تعلقی و بے خبری کہ بھی اس شخص کی جو
ایک نظر میں سارے منظر کا ہارک بنی سے جائزہ لے
لیا کرتا تھا؟

اسے اپنی ساری تیاری رائیگاں جاتی ہوئی محسوس
ہوئی تھی۔

آؤر کر چمکنے کے بعد وہ میز پر کہنیاں رکھے، دونوں
ہاتھ آپس میں پھنسائے جیا کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا
سامسکرایا۔

”تم نے مجھ سے اس روز پوچھا ہی نہیں کہ میں
تمہارے ڈور مہلاک کیوں آیا تھا؟“

وہ مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے ہلکے
سے بھورے شید لیے سیاہ ہیل نو عمر لڑکوں کی طرح

باتے پہ سیدھے کئے ہوئے تھے اور عموماً وہ ہلکے ہلکے کیلے ہوتے تھے۔ پرکشش آنکھوں میں ایک نرم دھیمسا تاثر لیے وہ اب اتنا کم گو اور محتاط نہیں لگتا تھا جتنا پہلے دن لگتا تھا۔

”ظاہر ہے کسی کام سے ہی آئے ہو گے۔ مجھ سے ملنے بالخصوص آؤ یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔“

”تم سے ملنے بالخصوص ہی آیا تھا اور اس کے لیے می کو پاکستان فاطمہ آنٹی کو فون کر کے تمہارے ڈورم کا نمبر پوچھتا رہا تھا“ ورنہ تم نے تو ہمیں ایڈریس تک نہیں دے رکھا۔“

اور یہ بات تو اماں نے اسے کل ہی فون پر بتادی تھی مگر لمحے بھر کو اس نے سوچا تھا کہ ڈھونڈنے والے تو بنا جتے کے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں جیسے وہ سفید گلاب اسے ہر جگہ تلاش کر لیتے تھے۔

”تو پھر آپ کیوں آئے تھے مجھ سے ملنے؟“

”بس یونہی۔ مجھے لگا تھا کہ تم اس روز استقلال اسٹریٹ میں مجھ سے خفا ہو گئی تھیں۔“

”اچھا تو آپ نے مجھے اس دن پہچان لیا تھا ہو سکتا ہے وہ میری شکل کی کوئی لڑکی ہو؟“ وہ بہت جلدی بھلا دینے والوں میں سے نہیں تھی سو بڑی حیرت سے کڑے کو انگلیوں میں گھماتے بولی تھی۔

”ایک بات ابھی کلیئر کر لیتے ہیں حیا!“ وہ قدرے آگے کو ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”میں بہت ایکسپریسو نہیں ہوں میں لمبی لمبی باتیں نہیں کر سکتا۔ میں بریکسٹیکل سا آدی ہوں ایسا آدی جس کو فکر معاش ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔ میرے پاس بڑی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہوں جس کی ملکیت میری اپنی نہیں ہے میں کئی سالوں سے اس ریسٹورنٹ کی فسطیں ادا کر رہا ہوں جو کہ پوری ہی نہیں ہو رہیں۔ یہ چیز مجھے بہت پریشان رکھتی ہے۔ وہ کرو لڑکی جو اس دن میرے ساتھ تھی وہ میرے ریسٹورنٹ کی عمارت کی اونر ہے اور ہمارے درمیان اس وقت یہی مسئلہ زیر بحث تھا جب تم وہاں آئیں۔ حیا! میں اس دن اتنا پریشان تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ

میری پر اپنی ضبط کرنے کی بات کر رہی تھی اور اگر میں اس کی رقم ادا نہ کر پاتا تو وہ ایسا کر بھی گزرے گی۔ اسی پریشانی میں میں تمہارے ساتھ بھی مس لی ہو کر گیا۔ آئی ایم سوری فار وٹ۔ مگر اپنی تمام پریشانیوں میں بھی مجھے اپنے سے بڑے رشتوں کا احساس ہے اور میں ان کی پروا کرتا ہوں۔“

حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اب بھی خفا ہو اسی بات پہ؟“ وہ قدرے توقف سے بولا۔

”نہیں میں نے تو تمہیں تب ہی معاف کر دیا تھا جب تم نے کچن کے سارے برتن دھوئے تھے اور چولہا فکس کر کے دیا تھا۔“

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”مگر وہ جنجر ریڈ ہاؤس مجھے ادا ہوا ہے۔“

اس سے قبل کہ وہ جواباً ”کچھ کتنی ٹیکویٹر اس کی طرف آیا تھا۔“

”میڈم سلیمان؟“

حیا نے چہواٹھا کر دیکھا اور لے بھر کو پتھر کی ہو گئی۔

وہ ایک سفید گلابوں کا بو کے میز پر رکھ دیا تھا۔

”یہ آپ کے لیے“ ساتھ ہی اس نے ایک دو روپے تہہ کیا ہوا کانڈ حیا کی طرف بڑھایا۔

”لیجے یا دام!“ وہ جو ساکت نگاہوں سے گلدستے کو دیکھ رہی تھی چوکی اور مضطرب سے انداز میں وہ کانڈ تھا۔ اس کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ موڈب سا وٹرواپس پلٹ گیا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کانڈ کی نہیں کھولیں۔

بے سطر کانڈ کے عین وسط میں انگریزی میں تین سطور لکھی تھیں۔

”میری کار میں سفر کر کے یہاں آنے کا شکریہ، لیکن اصولاً مجھ سے لفٹ لینے کے بعد آپ کو ڈر میرے ساتھ کرنا چاہیے تھا تاکہ اپنے کزن کے ساتھ۔“

”فرام یور وینلٹائن!“

جہاں گلاس لبوں سے لگائے گھونٹ گھونٹ پانی پیتا

ہلکیں سکڑے اس کے چہرے کے بدلے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

”کون بھیجتا ہے تمہیں یہ سفید پھول؟“ وہ خامے سرد لمحے میں بولا تو حیا نے چونک کر چہواٹھا یا۔ چند لمحے ہنسنے کی گرم جوشی جہاں کی آنکھوں سے مفقود تھی۔

اس کے چہرے پہ زانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔

”ہمیشہ پتا نہیں۔“

”اور اسے کیسے علم ہوا کہ ہم ریسٹورنٹ میں ہیں؟“ اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ کوئی جواب بن ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

”دکھاؤ!“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اب حیا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کمزور ہاتھوں سے وہ کانڈ جہاں کے ہاتھ پہ رکھا۔

جیسے جیسے وہ تحریر پڑھتا گیا اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھرنی لگیں۔ رنگیں تن گئیں اور لب بھینچ گئے۔

”تم کس کی گاڑی میں ٹائم آئی ہو؟“ اس نے نگاہ اٹھا کر حیا کو دیکھا اور وہ ایک نگاہ اسے سمجھا گئی تھی کہ وہ ایک مشرقی مرد تھا۔ تایا فرقان ابال اور رو حیل کی طرح کا مشرقی مرد۔

”وہ... میں سمجھی وہ تمہاری کار اور ڈرائیور ہے۔ میں سمجھی تم نے ڈرائیور بھیجا ہے۔“

”میرا ڈرائیور؟ کب دیکھا تم نے میرے پاس ڈرائیور؟“ اس نے تنفر سے کانڈ کو ٹٹھی میں موڑ دیا۔

”میں سمجھی اور اس نے کہا تمہارا نام لیا تو۔“

”اس نے یہ کہا کہ اس کو میں نے بھیجا ہے؟“ اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔ نہیں۔“

”یعنی کہ نہیں۔ اس نے نہیں بتایا کہ اسے کس نے بھیجا ہے اور تم اس کے ساتھ بیٹھ گئیں؟ حیا! تم یوں کسی کی گاڑی میں بھی بیٹھ سکتی ہو؟“

”میں نے کہا نا میں سمجھی وہ تمہاری کار ہے۔“ بے بسی کے مارے اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ بے قصور

ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

”میرے پاس تم نے دوسری کار کب دیکھی؟ تم

۔“

”اگر تمہیں مجھ پہ اتنی بے اعتباری ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ۔“ اس نے نہیکن کوچ پھینکا اور کرسی وکیل کرا تھی۔ ”جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتا نہ اس میں میرا کوئی قصور ہے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی برا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے یہاں اکیلے بیٹھو، اکیلے کھاؤ اور اکیلے رہو۔“

اس نے کچن یوں ہاتھ مار کر اٹھایا کہ کرسٹل کا گلدان میز سے لڑھک کر نیچے جا گرا۔ چھٹا کے کی آواز آئی اور وہ کرسیوں میں بیٹ گیا۔

جہاں شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر وہ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے نہیں رکی۔ وہ تیزی سے میز کے ایک طرف سے نکلی اسٹینڈ پر لٹکا کوٹ کالر سے پکڑ کر کھینچا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اگر وہ اس کے پیچھے آنا بھی چاہتا تو ابھی جو نقصان وہ کر کے گئی تھی اسے پورا کر کے ہی آتا اور اس کارروائی میں اسے جتنے منٹ لگتے اتنی دیر میں وہ دور جا چکی ہوتی۔

استقلال اسٹریٹ میں لوگ اسی طرح چل رہے تھے۔ وہ اس رش کے درمیان میں ہی کہیں گئی۔ اس نے کوٹ پہنا نہیں، بانو پہ ڈال دیا اور پھر دونوں بازو سینے لپیٹے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

وہ اس کے پیچھے نہیں آیا اور اگر آیا بھی تو وہ اس شور اور رش میں نہ اسے دیکھ پائی نہ ہی اس کی آواز سن پائی۔ بس اسی طرح چلتی رہی۔ استقلال اسٹریٹ کا آخری کنارہ مڑ کر وہ ٹافسم اسکوائر میں داخل ہوئی اور بالکل سیدھ میں چلتی ہوئی ٹافسم پارک کی طرف بڑھ گئی۔

تاریک پارک کے ایک گوشے میں وہ سگی پنجویران پڑا تھا۔ وہ مگر نے کے سے انداز میں اس پہ بیٹھی اور چہوا دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ فون انہی کے پاس ہے۔" ویٹرنے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا۔
 "اوہ اچھا۔" اس کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ملنے کا ایک اور زمانہ۔ "وہ چلا گیا؟"
 "جی ہاں ملے کر کے فوراً" آپ کے پیچھے باہر دوڑے تھے۔ آپ کو نہیں ملے؟"
 "نہیں۔ شکریہ!" وہ پھولوں کے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے باہر نکل آئی۔ استقلال اسٹریٹ پہ قدم رکھتے ہوئے اس نے کوٹ پہن لیا۔ اب اسے کافی دیر تک ناقص اسکوئر پہ گور سل کے انتظار میں بیٹھنا تھا۔



ڈی جے خاموشی سے موبائل کے بٹن دباتی نمبر ملا رہی تھی۔ بٹنوں کی ٹوٹ ٹوٹوں نے ڈورم کی خاموشی میں ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ کل کا سبز بٹن دبانے سے پہلے اس نے نظر اٹھا کر اپنے مقابل کرسی پہ بیٹھی حیا کو دیکھا جو پوری سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھی۔
 "مگر حیا! میں اسے کہوں گی کیا؟"
 "یہی کہ حیا کو اپنا موبائل چاہیے اور وہ اسے واپس کرے۔"
 "مگر وہ واپس کیسے کرے گا؟"
 "یہ اس کا مسئلہ ہے، تم کل ملاؤ۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔
 ڈی جے نے سر ہلا کر سبز بٹن دیا، اسپیکر آن کر دیا اور فون اپنے لبوں کے قریب لے آئی۔
 وہ سری جانب طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں دم سادھے گھنٹیاں نے گئیں۔
 "ہاں نہیں، تمہارا موبائل کدھر پڑا ہو، اسی کے نمبر پہ کر لیتے ہیں، شاید اس پہ وہ اٹھائے ہی۔" تب ہی کل اٹھالی گئی۔
 "ہیلو؟" وہ جہاں ہی تھا۔ انہی مصروف انداز۔
 "السلام علیکم! میں ڈی۔۔۔ خدیجہ بول رہی ہوں۔"

انا، خود داری، عزت نفس، اور اپنی ذات کے وقار کے وہ سارے اسباق جو وہ ہمیشہ خود کو پڑھاتی اور یاد دلاتی رہی تھی، آج بہت ذلت کے ساتھ چمکتا چور ہوئے تھے۔ وہ شخص کب اس کو یوں ذلیل نہیں کرتا تھا، یوں بے مول، بے وقعت نہیں کرتا تھا؟ اسے ایک موقع بھی یاد نہ آیا۔ ہمیشہ ہر دفعہ وہ یہی کرتا تھا، یا پھر ایسا ہو جاتا تھا۔ آخر کب تک یوں چلے گا؟ بہت گرا لیا اس نے خود کو بہت جھکا لیا بہت بے مول کر لیا، اب وہ مزید نہیں جھکے گی۔ اب اسے جھکنا پڑے گا، بس آج یہ طے ہو گیا۔
 اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا، پھر ارد گرد پھیلی رات کو دیکھا تو واپسی کا خیال آیا۔ اس نے گود میں رکھا سنہری کلچ کھولا تاکہ موبائل نکال سکے، مگر۔۔۔ وہ موبائل تو اس میں پورا ہی نہیں آتا تھا، وہ تو اس نے میز پہ رکھا تھا اور۔۔۔
 وہ کوٹ اٹھائے باہر بھاگی۔ اپنا ترکی والا بھدرا موبائل وہ اس ریٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی، اسے ہر حالت میں موبائل واپس اٹھانا تھا چاہے جہاں سے سامنا ہو یا نہ ہو۔ چند منٹ بعد جب وہ باپٹی ہوئی واپس استقلال اسٹریٹ میں اس ریٹورنٹ کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو گودنے والی میز خالی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میز تک گئی اور ادھر ادھر چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنا موبائل تلاش کیا، مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کرسی کے ٹوٹے گلدان کی کرسیاں بھی اب فرش سے اٹھالی گئی تھیں۔
 "براہیم، میڈم؟"
 وہ آواز پہ بٹنی تو وہی باوردی ویٹرنس کی ناک پہ موٹا ساٹل تھا، منتظر سا کھڑا تھا وہ بو کے اسی نے اسے لا کر دیا تھا۔
 "میرا موبائل تھا اس میز پہ۔" وہ پریشانی سے گھٹکھریالی گئیں کانوں کے پیچھے ازستی ہوئی میز پہ چیزیں پھر سے ادھر ادھر کرنے لگی۔
 "جی ہاں بڑا تھا مگر جب آپ گلدان گرا کر گئیں تو آپ کے ساتھ جو صاحب تھے، انہوں نے وہ موبائل رکھ لیا اور مجھے کہا تھا کہ اگر آپ آئیں تو میں بتا دوں کہ

”دس از جہان۔ خدیجہ! ایسا ہے کہ یہ فون میرے پاس ہے، حیا ریسٹورنٹ میں بھول گئی تھی۔“ وہ مصروف سالگ رہا تھا۔ پیچھے بست سے لوگوں کی بولنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ ریسٹورنٹ میں تھا۔ ”مجھے پتا ہے اسی لیے تو کال کی ہے۔“ ”اوکے!“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”حیا کدھر ہے؟“

”وہ... وہ ذرا مصروف تھی تو میں نے سوچا میں آپ سے بات کر لوں۔“ بات کرتے ہوئے ڈی جے نے ایک نظر حیا پر ڈالی جو دم ساویہ کرسی کے کنارے پہ آگے ہو کر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ ”جی۔ کیسے۔“

”بات یہ تھی کہ میں اور حیا کل پرنسز آئی لینڈز (شہزادوں کے جزیروں) پہ جانے کا سوچ رہے تھے ان فیکٹ ہم پرنسز آئی لینڈز کے سب سے بڑے جزیروں پر ہو کر ادا جائیں گے۔“

حیا نے نا سمجھی سے الجھ کر اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر دیکھا، مگر وہ مزے سے کہے جا رہی تھی۔

”اوکے تو آپ کو فون چاہیے؟“ ”نہیں! فون آپ اپنے پاس رکھیں، پیش کریں، ہمیں بس کہنی چاہیے۔“

”ڈی جے، ذیل!“ وہ بنا آواز کے لب ہلا کر چلائی اور ڈی جے کی کہنی موڑی، مگر ڈی جے ہاتھ چھڑا کر انہی اور دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”کل؟ کل تو میں ذرا مصروف ہوں۔ آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔“ ”تو برسوں بچ جلتے ہیں۔“

”شش... نہیں۔“ وہ ہاتھ سے اشارے کرتی اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”پرسوں تو مجھے شہر سے باہر جانا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”پھر جمعے کو؟“ ”جمعے کو میری ایک بہت اہم میٹنگ ہے اور یوک او امیں تو پورا دن لگ جاتا ہے۔“

”پھر تو آپ ہفتے کو بھی مصروف ہوں گے؟“ ڈی جے نے باؤسی سے کہا تو دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

”ان فیکٹ ہفتے کو میں واقعی فارغ ہوں۔ ٹھیک ہے، ہفتے کو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“ وہ جیسے بہت بادل خواستہ تیار ہوا تھا۔

”بس پھر ٹھیک ہے، ہم صبح والی گورسل سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی سات بجے سے پہلے پہلے تک ادھر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ وہاں سے ہم پھر آکٹھ فیئر میں سوار ہوں گے، ٹھیک؟“ ”ٹھیک، میڈم!“

”اور ہاں، تب تک آپ ہمارا فون استعمال کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ کا احسان تا عمر یاد رکھوں گا۔“ وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

وہ فون بند کر کے واپس آئی تو حیا خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ ڈی جے واپس کر رہی تھی اور بڑے لا پرواہ انداز میں میز سے میگزین اٹھا کر صفحے پلٹنے لگی۔

”کیا ضرورت تھی اسے ساتھ چلنے کا کہنے کی؟ ہم اکیلے بھی تو جاسکتے تھے۔“

”کیونکہ مجھے اس کے شادی شدہ ہونے میں ابھی شک ہے۔“ وہ اب ایک صفحے پہ رک کر غور کوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ ”ویسے اس کی بیوی کہاں ہوتی ہے؟“

”ہمیں استنبول میں۔“ وہ بددلی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

”اس کی کیا اپنی بیوی سے کوئی لڑائی ہے؟ کبھی ذکر نہیں کرتا اس کا۔“

”شاید... میں نے اس موضوع پہ کبھی بات نہیں کی۔ دیکھو بھی جہان کا نکاح بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اب پتا نہیں اس کو خود اپنے نکاح کا علم ہے بھی یا نہیں کیونکہ وہ کبھی ذکر نہیں کرتا، شاید پچھونے اس سے چھپا رکھا ہو۔“

”بچوں والی باتیں کرتی ہو تم بھی۔“ ڈی جے نے جھوٹا کر خفگی سے اسے دیکھا۔ ”آج کے دور میں ایسا کہاں ممکن ہے کہ کسی کا نکاح ہوا ہو اور اسے علم بھی نہ ہو۔ یقیناً اسے پتا ہو گا۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ نکاح اس کا جس سے بھی ہو، تم اس کی اتنی کیڑکیوں کرتی ہو؟“ ڈی جے پھر مسکراہٹ دبائے رسالے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”کیونکہ اس کا نکاح مجھ سے ہوا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولی تو ڈی جے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”یعنی، یعنی وہ گاڈ... تمہارا اس سے نکاح ہوا تھا تو... تو وہ تمہارا کیا گا؟“

”سو تیلاموں لگا۔“ وہ بگڑ کر بولی اور اپنے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

”وہ مائی گاڈ... تم نے مجھے اتنی بڑی بات نہیں بتائی!“ ڈی جے ابھی تک بے یقین تھی۔

”اب جتا تو دی ہے نا۔ اب جاؤ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور میں آج سیمینس نہیں جاؤں گی۔“ وہ اوپر اپنے بستر میں پھر سے لیٹ گئی اور کمبل منہ پہ ڈال لیا۔

”بہت ذلیل ہو تم حیا! ارے آٹھ بج گئے۔“ وہ میگزین پھینک کر انہی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پھر سلائڈ کھول کر چوہا ہرنکالے لبوں کے گرد دونوں ہاتھوں کا پالہ بنائے با آواز بلند چلائی۔

”گڈ آ آ آرنگ۔ ڈی جے۔“

”نی نی نی نی نی۔“ نے نے نے۔۔۔ ”دور نیچے سے کسی لڑکے نے حوالی ہانک لگائی تھی۔“

”ڈا۔۔۔ لیل۔“ وہ جل کر اور زور سے چلائی۔ ”چپ کرو، مجھے سونے دو۔“ حیا نے تکیہ کھینچ کر اسے دے مارا، مگر وہ اسی کھڑکی کے پاس کھڑی صدا میں لگاتی رہی۔

وہ یونیورسٹی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ وہ وہیں بیٹھی سیڑھی پہ رکی فائل اور کتابیں دوسرے ہاتھ میں منتقل کیں اور

باری باری کوٹ کی دونوں جیبیں کھنگالیں، پھر اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چٹکھاڑتا ہوا موبائل باہر نکالا۔ یہ اس کا پاکستانی سم والا فون تھا۔ دوسرا موبائل جہان کے پاس ہونے کے باعث وہ آج کل اسے ہی استعمال کر رہی تھی۔

چمکتی اسکرین پہ ترکی کا کوئی غیر شناسا نمبر لکھا آ رہا تھا۔ نمبر کس کا تھا؟ اسے قطعاً ”یاوندہ آیا۔“ نمبر یاد رکھنے کے معاملے میں وہ بہت چور تھی۔ اسے اپنے پاکستانی موبائل نمبر تک کے آخری دو ہندسے بھولتے تھے اور ترکی والا تو خیر سرے سے یاد نہ تھا۔

”ہیلو؟“ وہ فون کان سے لگائے ہوئے وہیں بیٹھی یہ بیٹھ گئی۔ کندھے سے بیک اتار کر ایک طرف رکھا اور فائلیں گود میں۔

”جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں،“ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں۔“ آواز اجنبی تھی بھی اور نہیں بھی، مگر اس کا لوچ، اتار چڑھاؤ اور انداز۔۔۔ سب شناسا تھا۔ وہ لب پہنچ گئی۔

”عبدالرحمن بات کر رہا ہوں اور بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔“ گو کہ وہ بڑھا لکھا لگتا تھا مگر انداز سے کہیں نہ کہیں معنی کے کسی نچلے طبقے کے شہری کی جھلک آتی تھی۔

”کیا بات کرنی ہے آپ کو؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟“

”ماننا چاہتا ہوں۔ بتائیے کیا یہ ممکن ہے؟“ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرو لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں بے اختیار پسینے میں بھیگ گئیں۔ ”میں نہیں مل سکتی۔“

”کیوں؟ جس فون کال میں آپ کی دوست نے آپ کے کزن کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تھی، اس میں غالباً انہوں نے یوک او کا ذکر کیا تھا۔ پرنسز آئی لینڈز۔ شہزادوں کے جزیروں۔ کیا آپ ادھر نہیں آ رہیں؟“

تو وہ اس کی کالز شیپ کر رہا تھا اور تب ہی اس نے

پاکستان والے موبائل یہ کل کی تھی کیونکہ وہ ترکی والے فون کے جہان کی تحویل میں ہونے کے بارے میں جانتا تھا۔

”میں بیوک ادا نہیں جا رہی۔ آئندہ آپ نہ تو میرا پیچھا کریں گے نہ ہی میری کالز ٹیپ کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی جان لے لوں گی سمجھے!“ اس نے جھلا کر فون کلن سے ہٹایا اور سرخ بن زور سے دیا۔ موبائل آف ہو گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب یہ شخص اس کا پیچھے جھوڑے گا۔

سمندر کی جھاگ بھری نیلی لہروں پر سے ہوا سرسراتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں فیری کی بالکونی میں کھڑے سامنے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جہان قدرے جھک کر ریٹنگ پکڑے کھڑا تھا اور جیا گردن سیدھی اٹھائے لب بھیچے سامنے آتی پہ دیکھ رہی تھی۔

ڈی جے ابھی ابھی کیرا لیے بالکونی کے دوسرے سرے تک گئی تھی، سوان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔

وہ جب سے کدی کوئے کی بندرگاہ فیری میں سوار ہوئے تھے تب سے آپس میں بات نہیں کر رہے تھے۔ فیری ویسے بھی کچا کچا بھرا تھا۔ جگہ ڈھونڈنے میں ہی اتنا وقت صرف ہو گیا۔ فیری کی چلی منزل جو چاروں طرف سے شیشوں سے بندھی پر جڑے تمام صوفے اور کرسیاں بھرے تھے، سو وہ بالائی منزل پہ آگئے جو اوپر سے ایئر کھلا سا وسیع احاطہ جہاں ہر طرف صوفے اور کرسیاں تھیں، مگر ایک نشست بھی خالی نہ تھی۔ ان کو بالآخر فیری کے کنارے پہ بنی تنگ سی بالکونی میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ وہ اتنی تنگ تھی کہ سمندر کی جانب رخ کر کے ایک وقت میں ایک بندہ ہی ریٹنگ کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بالکونی کی گیلری ایسی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار وہاں کھڑی تھی۔

وہ دونوں بالکل دائیں طرف کے کونے میں تھے۔ ہوا بے حد سرد تھی، پھر بھی جہان سیاہ سوئٹری آستین کمنیوں تک موڑے ہوئے تھا۔ مگر اسے بے حد سردی لگ رہی تھی کہ اس نے سیاہ لمبے اسکرٹ کے اوپر صرف سرمئی سوئٹری پہن رکھا تھا، سوا ب سیاہ اسٹول کو سختی سے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بازو سینے پہ باندھ رکھے تھے۔

”گیوی سم سن شان۔ گیوی سم سن۔“ جیا کے بائیں جانب ریٹنگ پکڑے اندھین لڑکیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ وہ لڑکیاں بہت سی تھیں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھیں، مگر ان کی قطار بالکونی کے دوسرے سرے تک جاتی تھی۔ وہ کسی اسٹڈی ٹور پہ اسٹبل آئی ہوئی تھیں اور اب چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند لہک لہک کر وہ گیت گارہی تھی۔

”تم اس روز بغیر پٹائے اٹھ کر چلی گئیں۔ تمہیں بتا ہے میں کتنی دیر استقلال اسٹریٹ میں بہیں ڈھونڈتا رہا؟“ وہ ریٹنگ پہ جھکا سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”تو نہ ڈھونڈتے۔“ جیانے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ہوا سے اس کے پل اڑا کر جہان کے کندھے کو چھو رہے تھے مگر وہ انہیں سمیٹنے کا تکلف بھی نہیں کر رہی تھی۔

”اتنا غصہ؟“ جہان نے گردن موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ تپتے ہوئے نقوش کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔

”ایسا بھی کچھ نہیں کہتا تھا میں نے۔“

”اگر تمہیں خود شرمندگی نہیں ہے تو میں کیوں دلاؤں؟“

”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی پوچھتا۔“

”مجھے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

مرغابیوں کا ایک غول پر پھڑپھڑاتا ان کے سامنے سے گزرا تھا۔ جہان سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پکڑی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر فضا میں اچھالا۔ ایک بڑی سی مرغابی نے

فضا میں ہی غوطہ لگا کر اسے اپنی چونچ میں دیا لیا۔ وہ خاموشی سے پانی کی نیچلی رخ کو دیکھتی رہی۔ پانی میں گلابی جیلی فش تیر رہی تھیں، ان کے سر پانی کے اندر ہی تھے مگر وہ اتنا شفاف تھا کہ وہ واضح دکھائی دیتی تھیں۔

”کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے جیا! کہ میں پوچھ سکوں کہ وہ شخص کیوں تمہارے پیچھے بڑا ہوا ہے؟“

”پوچھو، ضرور پوچھو، مگر اسی سے جا کر پوچھو۔“

”مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟“

”میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔“

آج وہ جہان کے لیے وہی جیا سلیمان بن گئی تھی جو وہ ہر ایک کے لیے تھی۔ خود کو جس شخص کے سامنے جھکا لیا تھا اب اسی کے سامنے اٹھانا بھی تھا۔

”جینے دو۔ کچھ مل تو۔ جینے دو۔“

وہ لڑکیاں ابھی تک لہک لہک کر گارہی تھیں۔ ڈی جے بھی کہیں ان کے ساتھ تھی۔

”اچھا آئی ایم سوری۔“ وہ رخ موڑ کر اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا اور روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

جیانے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے کھیلنے میں اور وہ پکھلی ہوئی موم کا ڈھیر بن گئی۔ بہت دیر سے وہ مسکرا دی۔ خود سے کیے سارے وعدے بھول گئے۔

”اوکے!“ اس نے روٹی کا ٹکڑا کھینچ کر توڑا اور اڑتی ہوئی مرغابی کی سمت پھینکا۔ اس نے اسے فضا میں ہی پکڑ لیا۔

”تمہارا ترکی بہت خوب صورت ہے جہان! مگر یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔“ اب وہ روٹی کے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال رہی تھی۔

”اچھا۔ کیسے ہیں وہ؟“

”اکھڑے لٹا، مغرور، بد تمیز، بد تہذیب، بے موت، لٹے دل کے لوگ ہیں یہاں کے۔“

وہ کہتی گئی اور وہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔ ”اور پاکستان کے لوگ کیسے ہوتے ہیں جیا

سلیمان! خوب ہنس کر وہ بولا تھا۔ ”کم از کم ترکوں سے تو بہتر ہوتے ہیں۔“ اس نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی دور اچھال دیا۔ جہان ابھی تک ہنس رہا تھا۔ ”گیوی سم سن شان۔“

گیوی سم سن۔ گیوی این اور چائس نو گروپ آگین۔ لڑکیاں اسی طرح کلن سی گارہی تھیں۔

وہ تینوں ساتھ ساتھ اس بل کھاتی سرک پہ نیچے اتر رہے تھے۔ جیا ایک ہاتھ سے اسٹول اور دوسرے سے اڑتے بالوں کو سمیٹ کر پکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ پرانے زمانوں میں والہس چلی گئی ہے۔ ایک قدم جزیرے پہ جو ساری دنیا سے الگ تھلک سمندر کے درمیان واقع تھا۔ وہ صدیوں پرانے شہزادوں کے جزیرے تھے اور وہ خود کوئی امر ہوئی شہزادی تھی۔

”شہزادوں کے جزیرے یا پرنسز آئی لینڈز“ مرمر کے سمندر میں قریب قریب واقع نو جزیروں کے گردہ کو کہا جاتا تھا۔ گئے وقتوں میں سلاطین اپنے تخت و تاج کے لیے خطرناک لگتے شہزادوں کو جلا وطن کر کے ان نو جزیروں پہ بھیجا کرتے تھے، جس سے ان کا نام پرنسز آئی لینڈز پڑ گیا۔ ”بیوک ادا“ ان میں سب سے بڑا جزیرہ تھا۔ بیوک یعنی بڑا اور ”ادا“ یعنی جزیرہ۔ بیوک ادا دنیا کے ٹریفک، رش اور ہنگامے سے دور ایک پرسکون، چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہاں گاڑیاں، بسیں، اور دوسری آواز نہیں ہوتی تھیں۔ سفر کرنے کے لیے قدم ہوتوں کی طرح گھوڑا گاڑیاں اور بجلیاں تھیں یا پھر بائیک سائیکل۔

ڈی جے اور جہان اس سے چند قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ قدم زمانوں کے روائس میں کھوئی ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے، ان میں اب تک خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ جہان اسے

ریسٹورنٹس کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔
 ”یہاں بہت زیادہ اقسام کے کباب ملتے ہیں، غالباً“
 ڈیڑھ سو اقسام کے اور ہر ریسٹوران یا تو سوپ فری دیتا
 ہے یا الہلٹی۔“
 وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی قدم اٹھا رہی
 تھی۔

اس جگہ سڑک دونوں اطراف سے ریسٹورنٹس
 میں گھری تھی۔ ان کے دروازے کھلے تھے اور سامنے
 برآمدوں میں شیڈ تلے کرسیاں میزیں بھی تھیں۔
 سیاحوں کا ایک ہجوم ہر سو پھیلا تھا۔
 سڑک کے وسط میں ایک جگہ مجمع سا لگا تھا۔ وہ
 تینوں بھی بے اختیار دیکھنے کے لیے رک گئے۔
 سیاحوں کے ہجوم کے درمیان گھری وہ ایک باج چھ
 سال کی خوب صورت سی ترک بچی تھی۔ وہ گھرے
 جامنی بغیر آئینہ فراک میں ملبوس تھی اور ٹھنکھریالے
 بال کندھے پہ آگے کو ڈالے ہوئے تھے۔ وہ ریڈ کارپٹ
 پہ کھڑی کسی اداکارہ کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے ایک
 معصوم سا بوز بنائے کھڑی تھی اور ارد گرد دائرے میں
 کھڑے سیاح کٹھا کٹھ اپنے کیمروں میں اس کی
 تصویریں مقید کر رہے تھے۔

وہ ہر تصویر کے بعد ذرا مختلف انداز سے کھڑی ہو
 جاتی اور چہرے پہ معصومیت طاری کیے کبھی آنکھیں
 پٹپٹاتی، کبھی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھتی، کبھی مسکراتی،
 کبھی ناک سکوڑتی، شاید ایک دو سیاح اس کی تصویر
 بنانے رکے ہوں گے تو دیکھا دیکھی۔ مجمع لگ گیا ہو گا۔

وہ اور ڈی جے بھی فوراً اپنے کیمرے نکال کر
 تصویریں بنانے کھڑی ہو گئیں۔ اس بچی کے پوز اتنے
 پیارے تھے کہ تصویریں بنانا کبھی ان کا دل نہیں بھر
 رہا تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد حیائے لمحے بھر کا توقف کرتے
 ہوئے چہرہ اٹھایا تو دیکھا، جہاں ساتھ ہی کھڑا لب بھینچے
 قدرے ناگواری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ شانے اچکا کر پھر سے سیاحوں کے جمع گھٹنے میں
 گھری بچی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یار! عمر دیکھو اس کی“ اور ایکشن کیسے پار رہی ہے؟“
 ڈی جے جھپٹتے ہوئے تصویریں کھینچ رہی تھی۔
 دفعتاً ”مجمع کو چیر کر ایک لڑکی تیزی سے آگے بڑھتی
 دکھائی دی۔ اس نے لمبے اسکرٹ اور کھلے سے سویٹر
 کے اوپر بھورا سا وہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا
 تھا۔ اس کی رنگت سنہری تھی اور آنکھیں بھوری۔ وہ
 سولہ سترہ برس کی لگتی تھی۔ پائیں کہنی پہ اس نے
 نوکری ڈال رکھی تھی جس میں جنگلی پھول تھے۔
 وہ ماتھے پہ تیوریاں لیے آگے بڑھی اور سختی سے اس
 بچی کا بازو پکڑا۔ بچی گھبرا کر پٹی اور جیسے ہی اس لڑکی کو
 دیکھا اس کے لبوں سے ہولے سے نکلا ”عائشہ گل!“
 ”جو بابا“ وہ بھوری آنکھوں والی لڑکی ترک میں غصے
 سے کچھ کہتی ہوئی اس کا بازو پکڑ کر مجمع میں سے راستہ بنا
 کر اسے لے جانے لگی۔ وہ ترکی میں جو کہہ رہی تھی وہ
 ایسا تھا کہ سیاح فوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ ریڈ کارپٹ شو
 ختم ہو گیا تھا۔

بچی اب مزاحمت کرتی، چڑچڑے پن سے کچھ کہہ
 رہی تھی۔ وہ لڑکی، جس کا نام شاید عائشہ گل تھا،
 مسلسل بولتی ہوئی اسے لے کر جا رہی تھی۔ اس کی
 بھوری آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی اور شاید
 غمی بھی۔

حیا گردن موڑ کر ان کو جاتے دیکھتی رہی۔
 ”او! تمہیں اپنا بیوک ادا دکھانا ہوں۔“ جہان کی
 آواز پہ وہ چونکی، پھر خفیف سا سر جھٹک کر اس کے
 ساتھ آگے بڑھ گئی۔

جہان نے ایک تبکھی روک دی تھی۔ ڈی جے نے
 البتہ چار لیبرازنی ٹخنہ کے حساب سے سائیکل کرائے
 پر لے لی تھی اور اب وہ اسی پہ سوار ہو رہی تھی۔ حیا
 تبکھی کے قریب آئی تو جہان نے ایک طرف ہو کر
 راستہ دیا۔

وہ شاہانہ سی تبکھی اوپر سے کھلی تھی۔ آگے ایک
 گھوڑا جاتا تھا اس کے ساتھ تبکھی بان لگام تھامے بیٹھا
 تھا۔ پیچھے ایک خوب صورت سی دوا فراد کے بیٹھنے کے
 لیے نشست بنی تھی جس پہ سنہری نقش و نگار بنے

تھے۔
 وہ احتیاط سے اوپر چڑھی۔ ٹھنلیں، شاہی نشست
 نہایت گداز تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی اس پہ بیٹھے۔

تبکھی بان نے گھوڑے کو ذرا سی چابک لگائی تو وہ چل
 دیا۔ پھر بلی سڑک پہ اس کے پاپوں کی آواز گونجنے لگی۔
 ”تو چھ پاکستان کے اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟“
 حیائے گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ ہاتھ میں
 پکڑتے اسمارٹ فون پر نگاہیں جمائے پوچھ رہا تھا۔ وہ
 اسے کبھی بھی مکمل توجہ نہیں دے گا، یہ تو طے تھا۔
 ”پاکستان اور پاکستان کے اچھے لوگ!“ حیا گھری
 سانس لے کر سامنے کو دیکھنے لگی۔

سڑک دو روہ سبز درختوں کی قطار سے گھری تھی۔
 چند پیلے زرد پتے سڑک کے کناروں پہ بکھرے پڑے
 تھے۔ درختوں کی دونوں قطاریوں کے درمیان تبکھی
 ست روہ سے آگے بڑھ رہی تھی۔

”ہم بہت ترقی یافتہ نہیں ہیں بہت بڑھے لکھے بھی
 نہیں ہیں۔ دھوکہ دہی، رشوت زنی، قتل و غارت اور
 بہت سی برائیوں میں بھی ملوث ہیں۔ ہمارے ہاں ظلم
 کھلے عام کیا جاتا ہے اور مظلوم بھی ہم ہی ہوتے ہیں
 ۔ ہم پسماندہ بھی ہیں اور پست ذہن کے بھی، مگر اس
 سب کے باوجود جہان سکندر! ہم دل کے برے نہیں
 ہیں۔ ہمارے دل بہت سادہ، بہت معصوم، بہت
 پیارے ہوتے ہیں۔“
 پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔

”کیا تم نے واقعی ابا سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں ہر
 روز ہم بلاسٹ ہوتے ہیں؟“
 ”میں نے؟“ موبائل کی اسکرین کو انگلیوں میں
 پکڑے وہ ذرا سا چونکا، پھر زیر لب مسکرا دیا۔ ”شاید“
 کیا نہیں ہوتے؟“

”ہوتے تو ہیں۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک
 یونیورسٹی کے کیفے میں بھی بلاسٹ ہوا تھا۔ اس دن
 ہماری ایک فیوول پارٹی تھی اور ہم فرینڈز بلاسٹ سے
 دس منٹ پہلے کیفے سے نکلی تھیں۔ بہت برا منظر تھا وہ۔“

خون ٹوٹا کالنج، جلی ہوئی دیواریں۔۔۔ اس نے یاد کر
 کے جیسے جھرجھری پل۔
 ”تو سیکورٹی ادارے کیا کرتے ہیں؟“
 ”لگتا تو نہیں کہ کچھ کرتے ہیں۔ خیر! ترکی کے لوگ
 کیسے ہوتے ہیں؟“

”میں تو ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں۔
 درکنگ کلاس کا ایک مزدور صفت شخص جس کو
 مصروفیت کے باعث گھومنے پھرنے کا وقت بھی نہیں
 ملتا اور باوجود اس کے کہ میرے گھر سے بیوک ادا قریباً
 دو گھنٹے کی مسافت پہ ہو گا، میں تین سال بعد ادھر آ رہا
 ہوں۔“

”واقعی؟“ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
 جہان نے شانے اچکا دیے۔

”دقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے بچت کے لیے
 ریسٹورنٹ میں ورکرز کم سے کم رکھے ہوئے ہیں، سو
 کام کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔“ وہ اسی طرح اسکرین کو
 دیکھتا مسلسل کام کر رہا تھا۔

تبکھی سڑک کی ڈھلان سے نیچے اتر رہی تھی۔ بل
 کھاتی سڑک کے دونوں اطراف میں خوب صورت
 بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ سڑک کے کنارے کتے
 ٹھلٹے پھر رہے تھے۔

”یہ تختہ کمزور ہے۔“ دفعتاً ”جہان نے اپنے جوگر
 سے نیچے موجود تختہ تختہ پھینک دیا اور پھر جھکا۔
 ”پلیز جہان! ساری دنیا کی ٹولی چیزیں تمہارا ہیڈک
 نہیں ہیں۔“

”اچھا!“ وہ جو جھک رہا تھا قدرے خفگی سے سیدھا
 ہوا۔ وہ پھر سے موبائل پہ کچھ لکھنے لگا۔
 ”فون رکھ بھی دو۔“

”مادام! آپ یہ مت بھولا کریں کہ آپ ایک
 غریب ورکر کے ساتھ ہیں جو اگر ایک دن کا آف لے گا
 تو سارے آرڈرز میں ہیر پھیر ہو جائے گی، سو اس بے
 چارے کو بہت سے کام یونہی آن دی موو بھگتا نے
 پڑتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان تمام محنتوں کے
 باوجود وہ اگلے دس سال تک بھی بیوک ادا کے ان

بنگلوں جیسا آواہانگہ بھی نہیں بنا سکتا۔
اس کے کہنے پہ جیانے لاشعوری طور پر سڑک کے
دونوں اطراف بنے بنگلوں پہ نگاہ دوڑائی اور ایک لمحے کو
ٹھٹک کر رک گئی۔

دائیں طرف جہان کے اس جانب جس بنگلے کے
سامنے سے ہمیں گزر رہی تھی وہ اتنا عالیشان اور خوب
صورت تھا کہ نگاہ نہیں ٹپکتی تھی۔

چار منزلہ سفید اونچے ستونوں پہ وہ محل یوں شانہ
انداز میں کھڑا تھا جیسے کوئی ہیر شیر اپنے بچوں پہ بیٹھا ہوتا
ہے۔ اس کے چھوٹے سے باغیچے کے آگے ایک
لکڑی کا سفید گیٹ تھا۔

بکھی آگے بڑھ گئی تو وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔
سفید محل کے لکڑی کے گیٹ پہ نام کی ایک تختی
لگی تھی جس پہ قدیم لاطینی جہوں کے انداز میں ترچھا کر
کے انگریزی میں لکھا تھا۔

”اے آ رہا تھا۔“

اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو رک گئی تھی۔ اس
کے انداز پہ جہان نے پلٹ کر اس کو دیکھا تھا۔
”اب کیا تم ابھی سے میری جیب کا مقابلہ ان
بنگلوں کے ساتھ کرنے لگی ہو؟“

وہ چونکی پھر دوبارہ اس گیٹ کو دیکھا جواب دہ ہوتا
جا رہا تھا۔

”نہیں تو۔“ وہ سر جھٹک کر آگے دیکھنے لگی۔

پھر کتنی ہی گلیوں سے وہ خاموشی سے گزرے
یہاں تک کہ ایک جگہ جہان نے ترک میں کچھ کہہ کر
کوچہ ان سے بکھی روکادی۔

”ہم نے پورے جزیرے کا چکر لگانا تھا پھر ابھی
سے کیوں رک گئے؟“ وہ اترنے لگا تو حیا بول اٹھی۔

”نماز!“ جہان نے سامنے مسجد کی جانب انگلی سے
اشارہ کیا۔

”اچھا!“ وہ سر ہلا کر اٹھی، ایک ہاتھ راڈ پہ رکھا اور
احتیاط سے پاؤں نیچے پیدل پہ رکھ کر اتری۔ جہان پہلے
ہی اتر کر مسجد کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مسجد چھوٹی مگر صاف ستھری سی تھی۔ جہان مردوں

والے حصے میں چلا گیا تو وہ وضو کر کے عورتوں کے پریر
ہال میں آگئی۔ وہ ظہر کا وقت تھا، مگر سورج بہت ٹھنڈا
لگ رہا تھا۔

ہال کے ایک کونے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس
کے سامنے ایک بچی اسی کے انداز میں بیٹھی وہ بھی آواز
میں کچھ کہہ رہی تھی۔

حیا نے کیلے بازوؤں کی آستین نیچے کرتے ہوئے
بغور ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ یہ وہی دونوں لڑکیاں
تھیں جو ابھی دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ اسے نظر آئی
تھیں۔ جانی فراک والی چھوٹی بچی اور دوسری
بھورے اسکارف والی سنجیدہ سی لڑکی۔

بچی منت بھرے شکایتی انداز میں اس لڑکی کے کھٹنے
کو جھجھوڑتی کچھ کہے جا رہی تھی، مگر وہ لڑکی جس کا نام
شاید عائشہ گل تھا، نفی میں سر ہلاتی گویا مسلسل اس
کی تردید کیے جا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت دھیمی آواز
میں باتیں کر رہی تھیں۔ حیا اسٹول کو چرے کے گرد
لیٹتے ہوئے ان دونوں کو دیکھے گئی۔ انہوں نے اسے
نہیں دیکھا تھا شاید وہ آپس میں مشغول تھیں۔

وہ جب نماز پڑھ کر اٹھی تو دیکھا کہ ابھی ابھی تک
اس لڑکی کو منا رہی تھی اور شاید اپنی کوشش میں
کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی اور
زبان انجھان تھی، مگر کبھی کبھی وہ بے بسی بھرے انداز
میں چیخ کر ذرا زور سے عائشہ گل۔ پلیز!“ کہہ اٹھتی
تو حیا کو سنائی دے دیتا۔

ایک آخری نگاہ ان دونوں پہ ڈال کر وہ باہر آگئی۔
مسجد کے برآمدے میں وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ حیا
نگے پاؤں چلتی ہوئی برآمدے تک آئی اور ایک ستون
سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ ہوا سے اس کا سر پہ لیا
اسٹول سر کی پشت تک پھسل گیا تھا۔

سامنے چند قدم کے فاصلے پہ وہ سجدے میں جھکا
تھا۔ نیلی جینز اور اوپر سیاہ سویٹر جہان سکندر کا
خصوص لا پروا سا حلیہ۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ
سرستوں سے نکائے اسے دیکھے گئی۔

وہ اب سجدے سے اٹھ کر تشدد میں بیٹھ رہا تھا۔ ہر

کلم بہت پھرتی سے کرتے دلا جہان سکندر کی نماز بہت
لہری ہوئی اور پرسکون تھی۔ وہ چونکہ اس سے ذرا
بچھے کھڑی تھی۔ تو یہاں سے اس کا صرف ہلکا سا رخ ہی
نظر آتا تھا۔ گردن کی پشت اور چہرے کا ذرا سا دایاں
حصہ۔ وہ گردن جھکائے تشدد پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے
دائیں رخ سلام کے لیے گردن موڑی تو حیا کو بالآخر
اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ زیر لب مسکراتے اسے دیکھے
گئی۔

دوسری جانب سلام پھیر کر اس نے دونوں ہاتھ دعا
کے لیے اٹھائے۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا دعا مانگتا رہا، پھر
ایک گہری سانس لے کر ہاتھ چرے پہ پھیرتا دیکھا ہوا
اور واپس مڑا تو اسے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر
مسکرایا۔

”تم انتظار کر رہی تھیں؟“ وہ ذرا مسکرا کر کہتا ہوا
اس کی طرف آیا تو حیا نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ
دونوں ساتھ ہی باہر آئے تھے۔

”جہان!“ جو کھٹ پر جب وہ جھک کر کھڑا ہو کر پرسن
رہا تھا تو حیا نے اسے پکارا۔

”ہوں؟“

”تمہیں ہی ہو؟“

”تھوڑا بہت۔“ وہ تسمہ باندھ رہا تھا۔

”لگتے نہیں ہو۔“

تسمے کی گرہ لگاتی اس کی انگلیاں تھمیں اس نے سر

اٹھا کر قدرے نا سمجھی سے حیا کو دیکھا۔

”میں کیا کرتا کہ نہ ہی لگتا؟“

”یہ تو مجھے نہیں بتاؤ یے تم نے دعا میں کیا مانگا؟“

”میں نے زندگی مانگی!“ وہ تسمہ بند کر کے اٹھ کھڑا
ہوا۔

”زندگی؟“ حیا نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ

اب عادتاً سوئیٹر کی آستینیں موڑ رہا تھا۔

”انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی اسے کمی لگتی ہے،“

سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔ اگر زندگی ہے تو سب

خوب صورت ہے، نہیں ہے تو سب اندھیر ہے۔“ وہ

دونوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

”خوب صورتی کیا ہوتی ہے جہان!“
یوگ ادا کی سر دھوا اس کے بل پھرے اڑانے لگی
تھی۔ شل سر سے پھسل کر اب گردن کے پیچھے اٹک
گئی تھی اور جب اپنے ٹھہرتے بل دونوں ہاتھوں میں
سمیٹتے ہوئے اس نے یہ سوال پوچھا تھا تو شدید خواہش
کے باوجود وہ جانتی تھی کہ وہ خوب صورتی حیا سلیمان
کی آنکھیں ہیں۔ جیسی کوئی بات نہیں کہے گا، مگر جو
اس نے کہا، وہ حیا سلیمان کے لیے قطعاً غیر متوقع
تھا۔

”علی کرامت کی ماں!“

”کیا؟“ اس نے نا سمجھی سے جہان کو دیکھا۔ وہ

سامنے دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

”میرے لیے خوب صورتی علی کرامت کی ماں پہ

ختم ہو جاتی ہے۔ علی کرامت میرا ایک اسکول فیلو تھا۔

ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تھا تب میں نے اس کی

ماں کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ وہ

ڈاکٹر تھیں اور اس وقت ہسپتال سے آئی تھیں۔ وہ

ٹھکی ہوئی تھیں اور اس وقت بچن میں کھڑی نشو سے

اپنا چہرہ تھپتھا رہی تھیں۔ حیا! وہ چہرہ اتنا مقدس اتنا

خوب صورت تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“ اس کی

بات پہ وہ چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

”وہ۔۔۔ ترک تھیں یا پاکستانی؟“ بہت دیر بعد وہ بولی۔

”وہ سیاہ فام تھیں۔“

”میری سیاہ فام۔“

اور حیا کے حلق تک میں کڑواہٹ کھل گئی، تاہم وہ

لب بھینچے خاموشی سے اس کے ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔

یہ وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے وہ جھک جاتی

تھی، خاموش ہو جاتی تھی، کڑوے گھونٹ پی لیتی تھی

اور۔۔۔ اور پھر بھی سوہن جاتی تھی۔ اگر کی بات کسی

اور نے کی ہوئی تو وہ اپنے انہی طنطنے سے اس کو اتنی

سناتی کہ ایسی بات کرنے کی وہ شخص دوبارہ کبھی ہمت نہ

کرتا۔ حد ہو گئی بھلا سیاہ فام کہاں اتنے حسین ہو سکتے

ہیں۔ یا پھر شاید جہان کا مطلب یہ تھا کہ اسے حیا

سلیمان کے مقابلے میں ایک بد صورت ترین سیاہ فام

عورت بھی خوب صورت لگتی ہے۔ وہ زندگی میں پہلی دفعہ کسی بد صورت عورت کو سوچ کر حسد کا شکار ہوئی تھی مگر چپ رہی۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تو وہ واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ بیوک ادا جزیرے کی گلیوں میں چل چل کر اب اس کے پاؤں دھکنے لگے تھے۔ ڈی جے واپسی پہ پھر سے بالکونی میں کھڑے ہونے کے لیے قطعی راضی نہ تھی اور اس کا بورا ارادہ فیری میں گھس کر چاہے پیار سے چاہے لڑجھڑ کر مگر بیٹھنے کے لیے نشست ڈھونڈنے کا تھا۔ جہان کو ٹکٹ لینے میں خاصی دیر لگ گئی۔ پانچ بجے والی فیری شام کی آخری فیری تھی، سو سیاحوں کا سارا ہجوم ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے موجود تھا۔ اب اس کے بعد اگلا جہاز رات آٹھ بجے چلنا تھا اور پھر اگلی صبح تک کوئی جہاز نہیں آتا تھا۔ جو رہ گیا وہ جزیرے پہ رات بسر کرے یا تیر کر واپس جائے۔

”اگر تم دونوں اسی رفتار سے چلتی رہیں تو فیری نکل جائے گی اور تمہیں واقعی تیر کر واپس جانا پڑے گا۔“ وہ ان دونوں کی سست روی پہ خاصا جھنجھلا کر بولا تھا۔

جواباً ”وہ قدرے خفت سے ذرا تیز چلنے لگیں۔ بندرگاہ کچھ سیاحوں سے بھری تھی۔ وہ تینوں اس رش میں سے بمشکل راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جہان آگے تھا اور وہ دونوں پیچھے۔ اسے اب اپنے ریٹورنٹ کی فکر ہونے لگی تھی کیونکہ بار بار وہاں سے اسے کالز آنے لگی تھیں۔ پراپرٹی کی مالکہ نے آکر پھر سے کوئی ہنگامہ کیا تھا۔ جہان اسے اس سارے معاملے پہ قدرے پریشان و متاسف لگا تھا، گو کہ وہ اپنے تاثرات چھپانے کی مکمل کوشش کر رہا تھا، مگر وہ اس کا ہر رنگ اب پہچاننے لگی تھی۔

وہ تینوں فیری کی طرف جاتے بورڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جب کسی نے حیا کی گھنٹی کو ذرا سا چھوا۔

”ماؤم۔۔۔ ماؤم!“

وہ ٹھٹک کر رہی اور گردن موڑی۔ اس کے عقب میں ایک بارہ تیرہ برس کا ایک ترک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کوئی ٹھہلے والا تھا، اس نے گردن کے

گرد اور دونوں ہاتھوں میں بہت سے ہار اور موتیوں کی لڑیاں ڈوریوں میں باندھ کر اٹھائی ہوئی تھیں اور اب وہ لڑیوں کا ایک گچھا حیا کے چہرے کے سامنے کر کے دکھاتا، ترغیب دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کبھی نہ رکتی مگر وہ موتی اور ان کی چمک اتنی خوب صورت تھی کہ اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ وہ بے اختیار وہ لڑیاں انگلیوں میں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ بالوں میں پروئے والی لڑیاں تھیں اور اتنی حسین تھیں کہ چند لمحے کے لیے وہ لمبے بالوں کی دیوانی لڑکی اور گرد کو فراموش کر بیٹھی۔

”حیا۔۔۔ حیا!“

جہان دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان اور ڈی جے فیری کے تختے پہ چڑھ چکے تھے اور اب جھنجھلا ہٹ بھری کوفت سے اسے بلارہے تھے۔

”ایک منٹ!“ وہ انگشت شہادت اٹھا کر ان کو روکنے کا اشارہ کرتی پلٹ کر جلدی جلدی لڑیاں دیکھنے لگی۔

”ہاؤچ؟“ اس نے دو لڑیاں الگ کر کے پوچھا۔

”میں لیرا۔۔۔ میں لیرا۔“

”یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“ اس نے خفگی سے بچے کو دیکھا۔ پیچھے جہان اسے ناگواری بھرے انداز میں پھر سے آواز دے رہا تھا۔

”تم جاؤ، جگہ تلاش کرو میں دو منٹ میں آرہی ہوں!“ اس نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے جانے کا اشارہ کیا۔ ان تک ان کی آواز شاید پہنچ گئی تھی تب ہی وہ دونوں سر ہلا کر مڑے اور فیری کے اندرونی راستے کی جانب بڑھ گئے۔

فیری نکلنے میں ابھی تین منٹ تھے اور وہ ان تین منٹوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”سیون لیرا۔“ اس نے حتمی انداز میں لڑکے کو کہا اور پیسے نکالنے کے لیے سنہری گچھ کھولا، اس سے قبل کہ وہ نوٹ نکالتی، لڑکے نے ایک دم پرس جھپٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

لمحے بھر کو اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور

جب سمجھ آیا تو وہ۔۔۔

”رکو۔۔۔ رکو۔۔۔ میرا پرس!“ چلاتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ جہان ڈی جے، فیری اس افتاد میں اسے سب بھول گیا۔

لڑکا پھرتی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ سیاح افزا تفری میں فیری کی طرف بڑھ رہے تھے کسی کے پاس توجہ کرنے کو وقت نہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی اس لڑکے کے پیچھے آئی۔ وہ بازار کی طرف مڑ گیا تھا اور اب ایک گلی کے عین وسط میں کھڑا تھا، حیا جیسے ہی بھاگتی ہوئی اس گلی میں داخل ہوئی، لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

”رکو۔۔۔ رکو!“ وہ غصے سے چلاتی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لڑکا خاصا پھرتیلا لگ رہا تھا، مگر وہ اتنا تیز نہیں بھاگتا تھا۔ تین گلیاں عبور کر کے وہ اس رہائشی علاقے میں داخل ہوا اور سرپٹ دوڑتا ہوا دائیں طرف کی قطار کے بنگلوں میں سے ایک کا گیٹ عبور کر گیا۔

وہ ہانپتی ہوئی اس گیٹ تک آئی۔ گیٹ نیم وا تھا۔ لڑکا اندر ہی کہیں گیا تھا۔ دور کہیں فیری کا بگل بج رہا تھا اور تب اسے احساس ہوا کہ فیری نکل چکی ہے۔ ڈی جے اور جہان جزیرے سے چلے گئے تھے اور وہ ادھر تھا۔ وہ گئی تھی۔ لیکن یہ وقت وہ سب سوچنے کا نہیں تھا۔ اسے اپنا پرس اور پیسے واپس لینا تھے ہر صورت۔

اس نے ایک لمحے کو اس نیم وا گیٹ کو دیکھا اور پھر اس کے پیچھے کھڑے اس عالی شان سفید محل کو اور پھر تیزی سے اندر آئی۔ یہ وہی سفید محل تھا جو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔

چھوٹے سے باغیچے میں خاموشی چھائی تھی۔ شام کے پردے اب نیلے پڑ رہے تھے۔ وہ پھولتے سانس کو ہموار کرتی متعذب سی چلتی بیٹھلے کے داخلی دروازے تک آئی اور بیل کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

لکڑی کا اونچا منقش دروازہ قدیم طرز کا بنا تھا۔ اس کے آس پاس نیل ٹامی کوئی شے نہ تھی۔ وہ کیا کرے؟ یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر میں کیسے گھس جائے؟ لیکن وہ اچکا بھی تو اسی گھر میں چھپنے کی نیت سے داخل ہوا تھا،

اسے ہر حال اندر جانا تھا۔

ایک محکمہ ارادہ کر کے اس نے کندھے پہ پھسلتی شل درست کی اور دروازے کا سنہری تاب کھمایا۔ وہ قدیم وقتوں کی کوئی امر ہوئی شہزادی تھی جو راستہ بھٹک کر اس جزیرے پہ آنکلی تھی اور اب سلطان کے محل کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازہ چہر کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہر سو اندھیرا تھا۔ اس نے چوکھٹ۔ قدم دھرا۔

”ہیلو؟“ وہ دو قدم مزید آگے آئی اور پکارا اس کی آواز کی گونج درودوار سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

وہ کسی لابی میں کھڑی تھی۔ وہاں نیم تاریکی سی چھائی تھی۔ صرف کھلے دروازے سے آنی شام کی نیکیوں روشنی میں آگے جاتی راہداری سی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل عجیب سی بے چینی و خوف میں گھرنے لگا۔

”کوئی ہے؟“ اب کے اس نے پکارا تو آواز میں ذرا ارتعاش تھا۔ ایک دم اس کے عقب میں ٹھاہر کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کلک کے ساتھ لاک لگنے کی آواز آئی۔

وہ گھبرا کر پلٹی اور دروازے کی طرف لپکی۔ ڈور تاب تاریکی میں بمشکل اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے زور سے تاب کھینچا، پھر کھمایا، مگر بے سود۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔

”اوہین! اوہین دی ڈور!“ وہ دونوں ہتھیلیوں سے لکڑی کا دروازہ پیسنے لگی۔ ساتھ ہی وہ خوفزدہ سی دہلی دہلی آواز میں چلا بھی رہی تھی۔

”شہزادوں کے جزیرے پہ خوش آمدید!“

بہت آہستہ سے کسی نے اس کے عقب میں کہا تھا۔

وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



”آئی ایم سوری سز حسن! مجھے آپ کے احساسات و جذبات کے مجروح ہونے کا احساس ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں آپ سے سچ چھپا نہیں سکتی، میڈیکل ٹیسٹ کے بعد جو رزلٹ سامنے آیا ہے، وہ یہی ہے کہ آپ میں میں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔“ ڈاکٹر رومینہ کے الفاظ کسی ہم کی طرح اس کی سماعت پر گرے تھے۔

وقار حسن کی آنکھوں تلے بھی جیسے اندھیرے چھا گئے۔ بچنے ہوئے لبوں اور ضبط کی کوشش میں سرخ آنکھیں جھکائے انہیں اپنا دل یکفخت خالی ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ہر سو جیسے تیز ہواؤں کے جھکڑ تھے ان کا بے کل و مضطرب دل جیسے اندر ہی اندر اٹھا گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ ان کی سماعت میں ثانیہ کی آہیں، سسکیں گونج رہی تھیں۔ وہ ان کی

تاؤلٹ

طرح مضبوط اعصاب نہیں رکھتی تھی۔ جب ہی تو اسی روح فرسا انکشاف نے بکھیر کے رکھ دیا تھا اسے۔ ”وقار! سنا آپ نے؟ یہ کہہ رہی ہیں؟ میں کبھی میں نہیں بن سکتی۔“ وہ روتے ہوئے ان کے کاندھے پہ سر رکھ کے گلوگیر آواز میں بولی۔ وقار حسن نے اپنی لہو رنگ آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے پہ بکھرتے آنسوؤں کو دیکھا۔

”ٹیک ایزی سز حسن! ریلیکس، خدا کے ہر فیصلے میں مصلحت ہوا کرتی ہے آپ سمجھ دار ہیں، پلیز! خود کو سنبھالیں۔ پلیز مسٹر وقار!“ ڈاکٹر رومینہ نے بے بسی سے کہتے ہوئے وقار حسن کو مخاطب کیا تو وقار حسن بہت ضبط سے مسکرائے۔

”ٹھیک یو ڈاکٹر!“ پھر وہ ثانیہ سے مخاطب ہوئے۔ ثانیہ! اٹھو۔ چلتے ہیں۔ پلیز! حوصلہ رکھو۔“



وہ ثانیہ کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ڈاکٹر روہینہ نے بہت متاسفانہ نگاہوں سے اس جوڑے کو دیکھا تھا جو اس غیر متوقع خبر کے بعد بکھرے کے مرحلے میں تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ثانیہ! تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں۔ لی برو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وقار حسن نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے تکیوں کے سہارے نیم دراز ثانیہ کو بڑھال سے انداز میں پڑے دیکھ کر ایک بار پھر دل جوئی کی تھی۔

”اب باقی کیا بچا ہے وقار! کیا ٹھیک ہو گا؟“ ثانیہ نے دکھ سے کہتے ہوئے انہیں دیکھا تو وقار حسن نگاہ چراگئے۔

”بہر حال! خدائی کاموں میں کیا زور۔ ہمیں اس کی مصلحت میں ہی اپنی بقاؤں ہونڈنا ہوں گی۔“

”کاش! یہ نہ ہوتا۔ ساری زندگی آس میں بیت جاتی۔ دس سال بھی تو اسی آس کا دامن تھا۔ رکھا تھا وقار! مگر اس چیک اپ نے تو ہر امید توڑ دی ہے۔“ وہ شدید کرب کا شکار تھی۔

”کیوں مایوس ہوئی ہو ثانیہ! ان ڈاکٹروں سے بڑا بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔ اس سے مانگو۔ مایوسی کفر ہے۔ مایوس مت ہو۔“ انہوں نے ثانیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھارس بندھائی۔

”پتا نہیں کیوں میرا دل بہت ہول رہا ہے وقار! اماں جان سے کب تک یہ بات چھپی رہ سکے گی؟ اتنا بینک بیلنس، جاگیریں، وسیع پھیلا ہوا بزنس اور اس کا وارث کوئی ایک بھی نہیں۔ اماں کہاں برداشت کریں گی۔ آپ کی تمام محبت دھری رہ جائے گی۔ وہ آپ کی دوسری شادی کر ادیں گی۔“ پلوں کی ویلیز سے پھیلتی نمی اس کی کنپٹیوں سے ہوتی بالوں میں جذب ہونے لگی۔

وقار حسن نے اس کے خدشات پر ایک ٹھنڈا

سانس بھرا۔

”کیسے یقین دلاؤں ثانیہ! کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا“ چاہے عمر بھر اولاد نہ ہو۔ دیکھو! اگر میرے نصیب میں رب نے یہ خوشی رکھی ہے تو اللہ تمہارے ذریعے سے بھی دے سکتا ہے۔ اس کے گھر میں کی نہیں ہے، ویر ہے، اندھیرا نہیں۔ تم سب اللہ یہ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟“ وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہے تھے اور پتا نہیں وہ کبھی بھی یا نہیں، البتہ خاموشی اختیار کر لی اور وقار حسن کے لیے یہی کافی تھا۔

”اماں! یہ کچھ پیسے ہیں۔“ وہ کچن میں آئی تو ماں کو جو لمبے کے پاس بیٹھے انفریج سے راکھ کریدتے ہوئے دیکھ کر آہستگی سے پکارا۔

”پیسے“ ماں نے سر اونچا کیا۔ ان کی سرمئی آنکھوں میں سرمئی غبار پھیلا تھا۔

وہ نظریں چراگئی۔ یہ آنسوؤں کی نمی تھی جو اس کے باپ کی چار چوٹ کی مار کھا کر اس کی ماں کی آنکھوں میں اتر آیا کرتی تھی۔

”کہاں سے آئے؟“ انہوں نے لپک کر وہ میلے کچیلے نوٹ اس سے جھپٹے۔

”ہیلو اور ننھی سے فیس لی ہے اماں!“ وہ سر جھکائے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہی تھی۔

”مگر ابھی تو مہینہ ختم نہیں ہوا“ انہوں نے فیس کیسے دے دی؟“

”میں نے خالہ سے خود کہہ کر لیے ہیں اماں!“ اس نے سر نیہوڑائے ہوئے جواب دیا اس کی ماں گم سم ہو گئی۔

”کچھ پکانے کو لے آؤ اماں! شام ڈھل رہی ہے۔ اندھیرا ہو گیا تو پکانا مشکل ہو جائے گا“ پھر تیل پہ علیحدہ خرچ اٹھے گا۔ پانچ روپے کا اتنا تھوڑا تیل دیتا ہے چاچا طفیل کہ چراغ بھی پورا نہیں بھرتا۔“ وہ بولتے ہوئے آنے کے کنستروں کے پاس آکر ڈھکن کھول کر اندر

بھاگنے لگی اور جیسے دل ہول گیا۔ آٹا جھشکا اتنا تھا کہ اس اسی وقت پورا پڑتا اور اس کے پاس کل متاع یہ دو سو پیسے۔

اس کا دل یاسیت میں گھرنے لگا۔ آٹا چھان کر پات میں نکالا اور بیٹھ کر گوندھنے لگی۔

”پتا نہیں اتنی آزمائشوں نے ہمارے گھر کا رستہ ہی کیوں دیکھ لیا۔“ مگر اگلے ہی لمحے وہ سہم گئی۔ ”نہیں! یہ تو ناشکری ہے اور ناشکری خدا کو پسند نہیں۔ اللہ ہے نا، وہی مالک ہے۔“ وہ اگلے ہی لمحے سب کچھ اسی رزاق پہ چھوڑ کر بے فکر ہو چکی تھی۔

”ثانیہ! تم تیار نہیں ہوئیں؟“ وقار حسن آفس سے آئے تو اسے اسی یاسیت کے حصار میں گھرے بیڈ پہ لیٹ دیکھ کر استفسار کیا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا وقار پلیز! آپ اکیلے ہی چلے جائیں۔“ وہ نے زاری سے گویا ہوئی اور ریموٹ سے ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔

”ثانیہ! یہ کوئی بزنس کے حوالے سے دی گئی پارٹی یا عشاء ہے نہیں۔ صالحہ تمہاری قریبی دوست اور پھر ہماری عزیزہ بھی ہیں، اگر ان کے بیٹے کی سالگرہ میں شریک نہیں ہوں گے تو کتنا ہرٹ ہوں گی وہ۔“

”یہی تو بات ہے وقار کہ میں نہیں جانا چاہ رہی۔ بیٹے کی سالگرہ ہے۔ نہیں برداشت ہوگی مجھ سے اپنی کئی اپنی خامی کا احساس ایسے سے کتنا دل برداشتہ کرتا ہے مجھے، آپ کیا جانیں!“ وہ ایک دم سے ضبط گنوا کر چلائی اور کرشل کا گلدان فرش پر دے مارا۔

وقار حسن اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ڈھیلے پڑ گئے۔

”اوکے اوکے، ریلیکس ثانی! ٹیک اٹ ایزی۔ مت جاؤ، مگر یوں ٹیچر لوز مت کرو۔“ انہوں نے کرشل واز کی بکھری کرچیوں پہ ایک اچھتی نگاہ ڈالتے ہوئے رسائییت سے کہا۔ ثانیہ گہرے گہرے سانس

بھرتے ہوئے خود پہ قابو پائے لگی۔

وقار حسن نے ملازمہ کو پکار کر کچرا صاف کرنے کا کہا اور خود وارڈروپ سے اپنا سوٹ لٹکانے کے بعد واش روم میں بند ہو گئے۔

”وقار!“ وہ تیار ہونے کے بعد اپنا والٹ اور موبائل جیب میں رکھ رہے تھے، جب ثانیہ بے قراری سے پکارتے ہوئے اٹھ کر قریب آئی۔

”آپ میرے ہیں وقار؟ صرف میرے؟ اگر اماں جان آپ کو فورس کریں تب بھی آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی نہیں کریں گے نا؟“ ثانیہ کی سرخ

میں اضطراب اور وحشت تھی۔

”نہیں! اور اب تم بے فکر ہو جاؤ، جانتی ہونا کہ میں اپنی بات پہ قائم رہتا ہوں۔ ہم بچہ ایڈاپٹ کر لیں گے۔ اماں کو بھلانا اتنا مشکل نہیں ہے مگر ڈونٹ یووری۔“ انہوں نے ثانیہ کا گال سہلا کر آہستگی سے مسکرا کر تسلی سے نوازا۔ ثانیہ ٹھکے ہوئے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی، مگر اس کا زہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

روانے دعا مانگ کر منہ پہ ہاتھ پھیرے اور اٹھ کر جائے نماز پر گئے لگی۔ اماں بچھوٹے کو گود میں دھکائے سر اٹھائے آسمان کو خالی نظروں سے نکلے جارہی تھیں۔

”اماں!“ وہ آکر آہستگی سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ”میں نے کہا تھا اماں! فکر مت کرو، اللہ مالک ہے۔ وہ سب سے بہتر سبب پیدا فرمانے والا ہے۔ اپنے بندوں کا رزق اس کے ذمے ہے۔ پتا ہے اماں! بلی کی امی کی ایک دوست بہت بڑے بچکے میں ملازمہ ہے۔ بلکہ

ملازموں کی ہیڈ ہے یعنی نوکرائیوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس نے بلی کی امی سے کہا تھا کہ اس کی مالکین کو اپنے بچوں کے لیے گھر پہ ٹیوشن بڑھانے کے لیے استانی چاہیے۔ بس تم دعا کرنا اماں! مجھے آج وہاں جانا ہے۔“

”اور وہ تمہارا بابا ہے۔ وہ اور بھی ٹھکو ہو جائے گا

ردا! اور پھر کیا پتا کیسے لوگ ہوں۔ میرا دل ڈرتا ہے۔
 سہتر۔ "اماں نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پہ ڈالی۔
 "بے فکر ہو جاؤ اماں! میں استخارہ کر چکی ہوں۔
 مثبت اشارہ ملا ہے، تب ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔" وہ ان
 کے ہاتھ تھام کر مسکرائی۔ اماں کی آنکھوں میں تشکر
 کے آنسو بھرنے لگے۔

"یہ کباب لوٹا مانی! بہت زبردست ٹیسٹ ہے" نئی
 دہلی کی ٹرائی کی تھی۔ "مسز جبار نے کباب اٹھا کر اس
 کی پلیٹ میں رکھا۔

"تم نے مائنڈ تو نہیں کیا۔ صالحہ! اور اصل مجھے آنا
 تھا، مگر اچانک ہی طبیعت خراب ہو گئی۔" مانیہ نے
 بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

صالحہ اس کی بہت قریبی دوست تھی۔ جس سے کوئی
 بھی بات چھپی نہیں تھی مگر یہ زخم ایسا تھا کہ وہ ابھی
 اس پر وہ ڈالے رکھنا چاہتی تھی۔
 "ہوں! وقار بھائی نے بتایا تھا۔ اس اوکے! میں
 نے مائنڈ نہیں کیا۔" صالحہ نے مسکرا کر اس کی تسلی
 کرائی۔

"تم گاؤں گئی تھیں؟ ساس کیسی ہیں تمہاری؟ اب
 تو وقار بھائی کی دوسری شادی کا رونا نہیں رو تیں انو!
 بچے نہ ہوتا بھی عورت کا قصور ہو گیا۔ مانی فٹ! اتنی
 دقیقانوی سوچ ہوتی ہے ان ٹیپیکل ڈیرے ٹائپ
 لوگوں کی۔" صالحہ ناک چڑھا کر کہہ رہی تھی۔ مانیہ کی
 آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔

"ڈاکٹر نے مجھے بانجھ قرار دیا ہے صالحہ! میں کبھی ماں
 نہیں بن سکتی۔ وہ عورت اب جیت کے قریب ہے۔
 وقار مجھے اپنی گرفت سے پھسلنے محسوس ہو رہے ہیں۔
 تم جانتی ہو مانی کتنی پوزیو ہوں وقار کے لیے؟ ایک
 عالم سے فکر اگر میں نے اسے پایا تھا۔ عشق کی حد تک
 جنون ہے مجھے اس کا۔ بھلا کیسے شیر کر سکوں گی اسے
 کسی کے ساتھ؟ وہ بھی عمر بھر کے لیے۔" وہ سسکیاں

بھرنے لگی۔
 "ہاں! اہمیتی تو تم صحیح ہو مانیہ! مگر کیا یہ ضروری ہے
 کہ تم اس عورت کو جیتنے دو؟ اس سے پہلے کہ تمہاری
 ساس وقار بھائی کی شادی کریں تم خودیہ کام کرو۔"
 "کیا؟" مانیہ صدمے سے چلائی۔

"چینجومت مانی! اور میری بات سنو۔" وہ اس کی
 طرف سر کی اور ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے
 لگی۔ مانیہ کے چہرے پہ پہلے تذبذب پھیلا تھا پھر
 نظر اور آخر میں بھرپور آسودگی۔
 "میں سمجھتی تھی میں ہی اٹھیلی جنٹ ہوں، مگر آج
 تم نے ثابت کیا ہے کہ میں اگر ذہین ہوں تو تم جلاک
 بھی ہو۔" مانیہ نے کہا دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر
 ہنس پڑیں۔

"میلو! کیسی ہو ڈیر؟"
 "آئی ایم فائن! آج کیسے یاد کیا؟"
 "مجھے تمہاری ہی یاد آتی ہے ہروم۔ آئیڈیا جو اتنا
 زبردست دیا ہے۔ دل چاہتا ہے صبح سے شام نہ ہو اور
 میں وہ سب کر کے ان کا دل جیت لوں۔ کتنا حیران ہوں
 کہ وہ اور میرے احسان مند بھی۔"

"ہاں! مگر طوطے تو تب اڑیں گے جب اس ڈرامے
 کا کلائمیکس ہو گا۔" صالحہ نے ان کی بات کو بڑھا دیا
 اور دونوں ہنسنے لگیں۔

"اچھا یار! اب آئیڈیا دیا ہے تو میری مدد بھی کرو نا!
 کوئی لڑکی ڈھونڈو وقار کے لیے۔" مانیہ نے وہ بات کی
 جس کے لیے فون کیا تھا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ بے فکر رہو، مگر یار! لڑکی
 نہیں سمجھو! اب اتنی بھی فراخ دلی کا مظاہرہ نہ کرو۔"
 صالحہ نے ٹوکا تو مانیہ ہنسنے لگی۔ صالحہ نے فون بند کیا تو
 ملازمہ جیسے اس کے فارغ ہونے کی ہی منتظر تھی۔
 "ہیکم صاحبہ! وہ ٹیوٹر آئی ہے، میں نے اسے
 ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے میں آتی ہوں۔" اس نے آئینے

سے سامنے آکر اپنا جائزہ لیا۔ آتش بریزے کاسوٹ ہم
 رنگ لپ اسٹک اس کے یا قوتی لبوں پہ ہمار دکھا رہی
 تھی۔ اپنے چیلے سے مطمئن ہو کر وہ بالوں میں برش کر
 کے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
 "السلام علیکم! وہ اسے دیکھتے ہی بہت اعتماد سے
 گویا ہوئی تھی۔
 "و علیکم السلام! تم ہو ٹیوٹر؟" اس نے نخوت سے
 کہا۔

"جی۔" وہ مختصراً بولی۔

"ہام؟"

"ردا! شفاق۔"

"باپ کیا کرتا ہے تمہارا؟" اور یہ وہ سوال تھا جس
 نے اس کا اعتماد بار بارہ کر دیا۔ کیا بتائی کہ وہ جو اکیلے
 پایہ جتائی کہ نشہ گر ہے۔ ماں کو کالم کلوج اور مار پیٹ
 کرے چھین لیتا ہے یا یہ کہ ایک ایک کر کے گھر کی
 تمام قیمتی اشیاء فروخت کر چکا ہے۔

"جی! کچھ نہیں، وہ بیمار رہتے ہیں۔" اس نے
 بحرمانہ سی شرمندگی سے بتایا۔

"وہ! جب ہی تم۔ خیر! اپنی سی دی لائی ہو؟" صالحہ
 نے اس کے معمولی لباس پہ گہری نگاہ ڈال کر نخوت
 سے سوال کیا۔

"جی! وہ اپنی گود میں دھری فائل اس کے سامنے
 ٹیبل پر رکھ کر پھر بیٹھ گئی۔ فائل کو دیکھ کر اس کی پیشانی
 پہ ترنم بکھر گیا۔

"تمہارا اکیڈمک ریکارڈ اگرچہ بہت شان دار ہے،
 مگر تعلیم تو بہت واجبی سی ہے، مختص بی اے۔ پھر حجاب
 ایکسپریس نہیں ہے۔"

"جی! میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن دیتی رہی ہوں۔"

وہ آہستگی سے بولی۔
 "اوکے! ایسا کرتی ہوں کہ تمہیں ٹرائل پر رکھ لیتی
 ہو۔ اگر تمہاری کارکردگی سے مطمئن ہوئی تو پھر سوچیں
 گے۔ میں تمہیں دو بچوں کے ایک ہزار روپے دوں
 گی۔ یہ تمہارے گھر کے حالات کی وجہ سے ہیں۔"

اتنے پیسے تمہیں پہلے کبھی نہیں ملے ہوں گے، مجھے
 امید ہے کہ تم بچوں کو اچھی طرح پڑھاؤ گی۔ اوکے! پھر
 ابھی سے شروع کرو گی یا کل سے؟" وہ اس کا سرخ
 ہو جانے والا چہرہ جانچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 "جی! کل سے۔ ابھی تو میں نے اماں کو صرف
 انٹرویو کابٹایا تھا۔ چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ اٹھ گئی۔

"یہ لڑکی کیسی رہے گی؟" ردا اندر بچوں کو ٹیوشن
 دے رہی تھی۔ مانیہ دو سرے کمرے میں صوفے پر
 بیٹھی اسے بغور دیکھتے ہوئے صالحہ سے رائے چاہ رہی
 تھی۔ صالحہ کو دھچکا لگا۔

"کیا کہہ رہی ہو مانی! ہوش میں تو ہو؟ یہ اتنی کم عمر
 اور حسین لڑکی ہی تمہیں دکھائی دی ہے؟ مانا تمہیں
 جلدی ہے، مگر اس جلدی میں غلطی تو مت کرو۔"
 صالحہ بولنے پہ آئی تو چپ ہونے کا نام نہیں لیا۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو افسانہ کالی میٹا

کالینڈیشن قیمت - 750/- روپے

نیا ساٹھ کھانا پکانے کی کتاب

گھٹا گھٹا

قیمت - 250/- روپے ہانگل مفت حاصل کریں۔

ج ج ج - 800/- روپے کا منی آرڈر سال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

ثانیہ نے روا کی طرف دیکھا۔ ملگیا سا معمولی لباس پہنے اور میل سے چپکے ہل اور گرد سے اٹے چہرے کے ساتھ تھکا تھکا سا انداز لیے وہ خاموش رہ کر بھی اپنی بد حالی اور کم مائیگی کا چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی پرکشش محسوس نہ ہوئی۔ ثانیہ نے غیر ارادی طور پر اس کا موازنہ اپنے ساتھ کیا۔

قیمتی لباس، جدید انداز کے تراشے ہوئے ہل، نفاست سے کیا گیا میک اپ اور خوشبوؤں میں بے ہوئے وجود کے ساتھ شاہانہ انداز لیے ہوئے اس نے خود کو بہت برتر جانا۔

وہ اسے اپنے سامنے بے حد کم مایہ محسوس ہوئی۔ اس نے ناراض ہو کر صالحہ کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے کہ یہ معمولی لڑکی مجھے یعنی ثانیہ کو جت کر دے گی؟“

”نہیں۔“ صالحہ نے گڑ بڑا کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کچھ کہا تو ثانیہ ناراض ہو جائے گی۔

ثانیہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”صالحہ! تم صرف چالاک ہو، ذہین نہیں، جہاں تک میرا ذہن جا پہنچا ہے وہاں تک تم بھی نہیں پہنچ سکتیں، اس لیے کہ میں نہ صرف ذہین ہوں، بلکہ چالاک بھی ہوں۔ اب سنو میرا آئیڈیا کیا ہے۔ میں اس لڑکی سے وقار کی شادی کروں گی تو اس کی وجہ ایک تو اس کا کمزور بیک گراؤنڈ ہے، دوسرے یہ کہ عمر بھی ہے، وقار میرے ممنون و مشکور ہو کے رہیں گے۔“ اس نے ایک زہریلی مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔ ”پختہ عمر کی عورت سے شادی کا رسک اس لیے نہیں لوں گی ڈیرہ کہ اگر وہ بھی ماں نہ بنی تو اس قربانی کا فائدہ؟ جب دل پہ پھر رکھنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ وہ کام کیا جائے جس میں کامیابی کے امکان سو فیصد ہوں۔“

”وکی! ایک بات کہوں؟“ وقار حسن معمول کے

مطابق مطالعہ میں مصروف تھے جب ثانیہ نے سرک کر ان کے قریب ہوتے ہوئے اپنا سران کے شانے سے ٹیک دیا۔

”ہاں! بولو۔“ انہوں نے صفحہ پلٹتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے اجازت دی، ورنہ ثانیہ جانتی تھی کہ دوران مطالعہ وہ کسی کا ڈمٹرب کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

”فہ! پہلے کتاب تو ہٹائیں۔“ ثانیہ نے صرف کہا نہیں بڑے لاڈ بھرے انداز میں ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک طرف رکھ دی۔

”خیریت؟ بہت سنجیدہ ہو رہی ہو تم۔“ وقار حسن نے بادل ناخواستہ مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ایک بات مانیں گے؟“

”یار! کہو گی تو مانوں گا نا۔“ وہ اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر بہت محتاط رویہ اپناتے ہوئے تھے۔

”اوکے! یہ طے ہے کہ مانیں گے ضرور پر اس؟“ ثانیہ نے ان کی بات پہ گرفت کی تھی یا دوسرے لفظوں میں پھیلی تھی۔ وقار حسن چونکے اور بغور انہیں ٹکا۔

”ایسی کون سی اہم بات ہے ثانیہ! کہ تم مجھ سے کہے بغیر ہی پر اس لے رہی ہو؟“ ان کا لہجہ ان کی الجھن کا غماز تھا۔

”بتاؤں گی، مگر تب جب آپ ماننے کا وعدہ کریں گے۔“ ثانیہ نے کاندھے اچکائے۔

”ایسے کیسے وعدہ کر لوں بھلا؟“ وہ متردد ہوئے۔

”مجھ پہ بھروسہ نہیں؟ بھلا آپ کے لیے غلط کر سکتی ہوں؟“ وہ جذباتی ہونے لگی تو وقار پھنس کر رہ گئے۔

”یہ بات نہیں ہے ثانی! مگر۔“

”کم آن وکی! اتنا مت الجھیں، بس مجھ پہ ٹرسٹ رکھیں۔“ وہ ٹھٹھکنے کے انداز میں بولی۔

وقار حسن چونک گئے۔ ثانیہ سے محبت لاکھ سہی، مگر وہ اس کی گھاگ فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یوں بنا سوچے سمجھے جانے بغیر وہ ہرگز کوئی وعدہ نہیں

کر سکتے تھے۔

”لوں پہیلیاں بوجھوانے کی بجائے صاف بات کہوں نہیں کر تیں ثانیہ؟“

”تو گویا آپ مجھ پہ بلیو نہیں کر رہے؟“ ثانیہ نے ہن کر کہا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے ثانیہ پلیز۔“ وہ گڑ بڑائے۔

”یہی بات ہے۔ اور کیا مطلب نکلتا ہے آپ کی اس پس و پیش کا؟“ وہ فوراً ہی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرا لائی۔

”مائی گڈ نیس۔“ وقار بے بس سے ہوئے۔

”اوکے فائن! جانتی ہوں تا میری بے چارگی کو؟ آنسو نہیں دیکھے جاتے مجھ سے تمہارے، اب بولو۔“ وہ ہارے ہوئے انداز میں بولے تو ثانیہ مسکرا دی۔

”تھینکس وقار!“

”مگر وہ بات؟“ ان کی سوئی بوہیں انکی تھی۔

”آپ شادی کریں وقار! ہم بچہ ایڈاپٹ نہیں کریں گے۔ مجھے آپ کا بچہ چاہیے۔ مجھ سے نہ سہی، دوسری عورت سے سہی، مگر۔“

وہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ وقار حسن بھونچکے سے رہ گئے تھے۔

”آخر کیوں خفا ہیں مجھ سے؟“ ثانیہ ان کے پیچھے پھر رہی تھی۔

”یہ مجھ سے نہیں، خود سے پوچھو۔“ انہوں نے بھرپور برہمی سے کہا۔

”اس میں خفگی کی کیا بات ہے؟ ایک جائز قدم اٹھا رہی ہوں۔“

”پتا نہیں کس دل سے ثانی! کیا میں تمہیں جانتا نہیں؟ آئی تو ویٹ ثانی! کہ یہ تمہاری برداشت کا امتحان ہو گا اور میں یہ امتحان نہیں لوں گا۔“ وہ بولتے چلے گئے۔

”کب تک؟ میں بھی جانتی ہوں کہ اماں جان زیادہ

انتظار نہیں کریں گی، جو کام کل کسی اور کے ذریعے ہوتا ہے وہ میں کیوں نہ کر لوں۔ ذرا سا دل ہی تو بڑا کرنا ہے وکی! پھر صلہ بھی تو کتنا اچھا ملے گا۔ میں بتا رہی ہوں، وہ بچہ صرف میرا ہو گا۔ اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“ پھر ان کی خاموش نگاہوں کو محسوس کر کے یکایک سنبھلی۔

”میرا مطلب ہے وکی! وہ پہلا بچہ صرف میرا ہو گا، باقی کے جتنے بھی ہوئے، ان کی ذمہ داری آپ دونوں کی۔“

”یہ سب تو تب ہو گا ثانی! جب میں ایسا چاہوں گا۔ تمہیں اماں جان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سمجھا لوں گا۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکنے کے انداز میں کہا تھا، مگر ثانیہ پھٹ پڑی۔

”اماں جان کو روک لیں گے سمجھالیں گے، مگر کچھ وقت گزرے گا جب آپ خود کو نہیں روک پائیں گے، پھر میرا کیا ہو گا وقار؟ میرا کیا مقام ہو گا آپ کے اور اس کے بیچ وقار؟ یہ ایک بالکل جائز خواہش ہے۔ نئے آپ کا حق ہیں۔ میں آپ کو اس حق سے محروم نہیں کرنا چاہتی، پھر جب ایک کام کرنا ہی ہے تو پھر وہ ابھی کیوں نہیں پلیز! مان جائیں، وہ تیز تیز بولتے ہوئے آخر میں مانجی ہو گئی۔ وقار حسن نے اس کے چہرے کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

”میں معذرت خواہ ہوں! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔“ وہ صالحہ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

کل ثانیہ اور صالحہ اس کے گھر جا کے اس کی ماں سے بات کر آئی تھیں۔

صالحہ نے چونک کر غیر یقینی سے اسے دیکھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ پیش کش ٹھکرائی بھی جاسکتی تھی۔

”تم ہوش میں ہو لڑکی؟ وقار بھائی کا اتنا بڑا بزنس ہے اس کے علاوہ خاندانی جاگیریں الگ۔“

”مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ آئی ایم سوری! آپ مائنڈ مت کریں۔ میں اس لیے انکار نہیں کر رہی کہ وہ کل ریڈی میوڈ ہیں اور ان کی بیوی بھی موجود ہیں۔ میم! دراصل میرے گھر کے حالات مجھے شادی کی اجازت نہیں دیتے میں اپنے گھر کی واحد کمانے والی ہوں اگر میں اپنی خوشیوں میں مگن ہو جاؤں تو میری ماں اور بھائی بہنوں کا کیا بنے گا۔“ وہ یہ سب کہتا نہیں چاہتی تھی یہ ایسا موضوع تھا کہ جس پر بات کرتے ہوئے اس کے اندر دکھ اترنے لگتا تھا۔

”تمہاری ماں کیا تمہارے اس فیصلے سے متفق ہے؟ آئی مین کیا وہ تمہیں یوں عمر بھر بٹھانے کو تیار ہے؟“ صالحہ نے پوچھا۔ روا سر جھکا کر لب کھلنے لگی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ ماں نے اس کے انکار پر کس درجہ احتجاج کیا تھا۔

”تمہاری خاطر خود کو داؤے مت لگا رو! اتنا اچھا رشتہ نصیب سے ملتا ہے تو کو تو بخاور ہے میری بچی! ہمارا اللہ مالک ہے۔“

”میرا دل نہیں مانتا ماں! کہ اس طرح سے خود کو تیرے دکھوں سے علیحدہ کر لوں۔“ وہ بے حد ملول تھی۔

”ری بگلی! شکر ادا کر۔ میری تو سانسیں آسان ہوں گی۔ ہمہ وقت ایک دھڑکا لگا رہتا ہے تیرے باپ سے۔ شرابی جواری سب سے پہلے اپنی غیرت اور عزت کا سودا کرتا ہے پھر ہی اس برائی کی دلدل میں قدم دھرتا ہے۔ کیا خبر کب وہ کچھ غلط کر دے۔ وہ جوئے میں گھر کی ساری قیمتی اشیاء چکا ہے سو اب تیری میری باری دور نہیں۔ اس کے اوپاش ساتھیوں کی نظریں تو ویسے بھی تجھ پہ لگی ہوئی ہیں۔ تو سمجھ لے یہ رب سے کی گئی میری التجاؤں کا ثمر ہے ہاں کر دے میری بچی۔“ ماں اس کے سامنے روتے ہوئے ضبط کھو گئیں اور وہ اتنی ساکت تھی کہ ماں سے یہ تک نہ کہہ پائی کہ یہ تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہو جاتی کیا بھروسہ تھا

نصیب کا بھلا بیچو عورت بچے کی خاطر اپنے شوہر کی شادی کر رہی تھی اسے اچھے رشتوں کی کیا کمی؟ اس کے پاس کیا تھا مفلسی اور کمزوری کے سوا؟ ایک اعلا تعلیم یافتہ ہائی اسٹیٹس رکھنے والی ماڈرن عورت سے اس کا کیا مقابلہ؟ وہ اس ٹکون میں اپنی حیثیت اپنا وقار کھودتی اور کسی وہ نہیں چاہتی تھی۔

”کس سوچ میں پڑ گئیں؟ دیکھو! اگر تم محض اس وجہ سے انکار کر رہی ہو تو میں ثانیہ سے بات کروں گی۔ آئی ایم شیور کہ وہ تمہاری فیملی کو سپورٹ کرے گی۔“ صالحہ کی آواز نے اسے چونکا یا۔

اس نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور ٹھنڈا سا لمس بھرا۔

”ٹھیک ہے! مین سوچ کر بتاؤں گی۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ارادہ استوار کے بعد فیصلہ کرنے کا تھا۔

”وقار! آپ نے جواب نہیں دیا مجھے؟“ وقار حسن ابھی کھانے کی ٹیبل پہ آکے بیٹھے ہی تھے جب ثانیہ نے وہی موضوع چھیڑا جس سے وہ کترار ہے تھے۔ ان کا اچھا بھلا موڈ ایک دم غارت ہو گیا۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ نرج ہوئے۔

”آپ کی ہاں۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ وقار حسن بغور انہیں تنکے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں ثانیہ؟ کیا میں تمہیں جانتا نہیں؟ بندہ جو کام کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کا بیڑا اٹھانے کا مطلب؟“

”سناپ اس وقار! طنز مت کریں مجھ پہ۔“ وہ ایک دم سے پھنکاری۔ ”آپ کا مطلب ہے میں بہت تنگ دل ہوں؟ سو کن برداشت نہیں کر پاؤں گی؟ وقار! یہ مشکل ضرور ہے مگر بچے کی خاطر مجھے یہ جبر کرنا ہے خود پہ۔ مجھے آپ کی خوشی عزیز ہے وقار! میری ذرا سی ذہنی کشادگی ہمیں بہت بڑی خوشیاں دے سکتی ہے تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے؟“ وہ انہیں سوالیہ

نظروں سے تنکے لگی۔

”پتا نہیں! جو بھی کر رہی ہو تم خود کر رہی ہو کل کو مجھے الزام مت دینا۔“ وہ لالچلٹی سے کہہ کر کھانے کی سمت متوجہ ہو گئے اور ثانیہ کے اندر زہر بھرنے لگا۔

”میں بھی سے یہ جال ہے تو بعد میں کیا ہو گا؟ کہیں میں غلطی تو نہیں کر رہی؟“ وہ اندر سے خائف ہوئی۔ مگر لگنے ہی لگے اس نے سر جھٹک دیا۔ ”اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔“ اس نے ہر خدشے سے دامن چھڑا لیا۔

”میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ میرا خیال ہے اگلے جمعے نکاح کی سنت ادا کر دی جائے۔“ ثانیہ نے گویا دھماکا کیا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”ثانیہ! تم ہتھیلی پہ سرسوں جمار رہی ہو۔ پھر ماں جان۔؟ ان کا سوچا ہے؟ سرے سے ابھی خبر ہی نہیں ہے انہیں۔“ ان کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی درشتگی سمیٹ لایا۔ ثانیہ نے یوں سر جھٹکا جیسے ناک سے مکھی اڑاتی ہو۔

”مگر میں ماں جان کو انوالو کرتی تو یہ کام سالوں پہ ایک سکتا تھا۔ ہر قسم کی گارنٹی چاہیے تھی انہیں۔ خاندان کی ذات پات کی۔“ وہ تیز بولے۔

دراصل وہ ماں جان سے ہی تو خائف تھی وہ وقار کے لیے اپنے خاندان کی لڑکی منتخب کرتیں جو حیثیت میں اس کے مقابلے پر ہوتی سو اسی لحاظ سے اس کا مقام متعین ہوتا۔

”تو آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپ کسی بھی راہ چلتی کو پکڑ کر اس گھر میں لے آئیں گی؟“ وقار حسین کو شدید غصہ آیا۔ ثانیہ گڑبڑا سی گئی۔

”بھئی! میں نے یہ کب کہا کہ وہ راہ چلتی ہے؟ خاندانی بھی ہے اور شریف بھی! بس! ذرا گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس طرح کسی غریب کے سر پہ ہاتھ رکھا جائے ثواب بھی ملتا ہے۔“ وہ بڑے محتاط سے انداز میں انہیں مطمئن کر رہی تھی۔

”لو کے! تم کو چاہیے تھا کہ بات طے کرنے سے قبل مجھے آگاہ کرتیں۔ بہر حال! ابھی بھی یہ خیال

رکھیے گا کہ وہ جو کوئی بھی ہو بیچور اور صورت حل سے توری طرح آگاہ ہو۔ میں کسی کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔

نکاح سالوں سے کیا گیا۔ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں لائی گئی۔ روا کے رشتے دار وقار حسن کی شان دار شخصیت سے از حد متاثر نظر آ رہے تھے اور روا کو انہوں نے بہت خوش نصیب قرار دیا تھا جبکہ روا خود اندر سے بے حد یاسیت کا شکار تھی۔ زندگی نے اچانک جو موڑ لیا تھا اس کے لیے ابھی وہ کسی طور آمادہ نہیں تھی۔

نکاح کے بعد ثانیہ نے روا کو دیکھا تو چونک گئی۔ روا گلابی اور سبز رنگ کے امتزاج اور نفیس کام سے مزین جدید انداز کے لیٹنگ میں ملبوس تھی۔ زیورات اور میک اپ نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

ثانیہ دنگ رہ گئی۔ اس نے جب روا کو دیکھا تو اس وقت وہ اسے اتنی حسین نہیں لگی تھی۔ شاید اپنے معمولی لباس اور پڑمروہ چہرے کی وجہ سے۔ اگر اسے پتا ہو تاکہ روا اپن اوڑھ کر اتنی حسین لگے گی تو وہ کبھی اس کا انتخاب نہ کرتی۔

اس کا شعاعیں بکھیرتا دلکش روپ اسے رقابت کی آگ میں جلا کر خاکستر کر رہا تھا۔

”حوصلہ کرو ثانیہ!“ اسے ہاتھ مسلتے لب کھاتے ہوئے دیکھ کر صالحہ نے اس کے اضطراب کا اندازہ لگایا تھا۔

”پتا نہیں کیوں صالحہ! مجھے لگ رہا ہے کچھ غلط کر ڈالا میں نے۔ وقار کو دیکھا؟ ابھی سے ماں جان والی بات کو لے کر منہ پھلایا ہوا ہے مجھ سے۔ اگر کچھ گڑبڑ ہو گئی نا صالحہ! تو۔۔۔“

”کچھ نہیں ہو گا! تم اتنی کمزور تو نہیں ہو ڈیر۔“ صالحہ نے نرمی سے حوصلہ بڑھایا۔ روا کو رخصت کرا کے لاتے ہوئے ثانیہ اندر سے بالکل ڈھم گئی۔

روا پتھر کے مجھنے کی طرح بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ کوئی احساس، کوئی جذبہ بھی دل کی سرزمین پہ نہیں پھوٹا تھا۔ وقار حسن اندر آئے اور دلکش گہیر آواز میں سلام کر کے اس کے پاس بیڑ پہ آکر ٹک گئے۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں لمبوس ان کا اونچا پورا شان دار سر اپنی مسکور کن خوشبوؤں کے ساتھ اس کے حواسوں پہ چھانے لگا۔ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”آپ جانتی ہیں ردا کہ یہ دوسری شادی کس وجہ سے کی گئی؟ آپ کو ثانیہ نے سب کچھ بتایا تو ہو گا۔“

”جی!“ وہ چونکہ اس کے جواب کے منتظر تھے سو اسے بولنا پڑا تھا۔

”عموماً دو بیویاں رکھنے والا مرد گویا دو کشتیوں پہ پیر نکاتا ہے اور ناکامی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر ثانیہ کو اولاد کی بہت خواہش ہے، پھر میری اماں بھی یہی چاہتی تھیں۔ خدا کو بھی یہی منظور تھا کہ آج آپ یہاں موجود ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ثانیہ کی طرح آپ کے حقوق بھی ای ایمانداری سے ادا کروں، لیکن اگر کہیں مجھ سے کوتاہی ہو تو پلیز! مجھے آگاہ ضرور کیجیے گا۔“ اس طویل گفتگو کے بعد انہوں نے اس کا گھونٹ اٹھایا۔ اور جیسے ششدر رہ گئے تھے۔ وہ ان سے کم از کم بھی آدمی عمر تو ضرور چھوٹی تھی۔ انہیں زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ ایک دم جھٹکے سے اٹھ گئے اور تب سے وہ نہایت ہی بے چینی سے کمرے میں ٹپکتے ہوئے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

ردا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اندر سے کچھ اور بھی سہم گئی۔ اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ مخاطب کر کے کچھ استفسار کرنی۔ اس نے اضطرابی کیفیت میں ہاتھ مسلے تو چونک اٹھی۔ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور لب بچھتے ہوئے ایک جھٹکے سے مڑ کر ہار نکل گئے۔ ردا دم سا دھسے بیٹھی رہ گئی۔

”تو اس میں اتنا خفا ہونے والی کون سی بات ہے وقار؟ ہر بات کو ایشو نہ بنالیا کریں۔“ ثانیہ بظاہر اطمینان سے بولی، حالانکہ اندر سے وہ خود بھی ردا جیسی حسین، کم عمر اور دلکش لڑکی سے ان کا سبجوگ کرنے کے بعد پچھتا رہی تھی، لیکن اسے وقار حسن کے سامنے اپنا بھرم تو قائم رکھنا ہی تھا۔

”نہیں! یہ سراسر زیادتی کی ہے تم نے ثانیہ! اچھا خاصہ مذاق بنو! کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے۔ کیا سوچیں گے لوگ! ایک تو نکلتی جوتلی کی عمر میں شادی کر رہا ہوں اور سے اتنی کم عمر لڑکی۔ ثانیہ! ہمیں تو اولاد چاہیے تھی، کسی بھی عورت سے ہو جاتی، یہ لڑکی۔ مالی گدنیس! اس کے کچھ خواب ہوں گے آخر۔“ وہ بے بس سے ہو کر کہہ رہے تھے اور ثانیہ کو ان کی یہی ہمدردی مزید پریشان کر رہی تھی۔

”نہیں آپ کے لیے کوئی بیوہ یا پھر طلاق یافتہ پختہ عمر کی کوئی خاتون بویکتی مگر اس سے اولاد نہ ہوتی تو پھر؟ اونہ! ایک تو احسان کیا اس پہ نخرے۔“ وہ کلس کر کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وقار حسن لب بچھتے وہیں کھڑے تھے۔

”میں بالکل خفا نہیں ہوں میری جان! بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ پہلی مرتبہ تو تمہاری بیوی نے کوئی دھتک کا کام کیا ہے۔ صبح پوچھو! تو مجھے تو دھڑکائی لگا ہوا تھا کہ اگر یہ تمہاری شادی کی راہ میں آئی تو میرا بیٹا تو دنیا میں بے نام و نشان ہی رہ جائے گا۔“ وقار حسن کے تمام خدشوں کو اماں جان کی باتوں نے لحوں میں دھو کر دیا۔

”مگر اماں! ایک ابھن ابھی بھی ہے۔“ وہ متذبذب تھے۔

”ہاں بولو پترا!“ اماں جان سوالیہ نظروں سے انہیں نکتے لگیں۔

”ثانیہ نے لڑکی بہت نو عمر ڈھونڈی ہے، زیادہ سے زیادہ بیس کی ہوگی۔ یہ زیادتی نہیں ہے، جبکہ آپ کا بیٹا تو بڑھا ہو رہا ہے؟“ ان کی بات پہ اماں جان نے مسکرا کر

انہیں دھپ لگائی۔

”چل بیٹ! اب ایسی بھی بات نہیں۔ کہاں سے بڑھا ہو گیا تو؟ ابھی چالیس کا بھی نہیں ہوا اور بڑھاپا نظر آنے لگا ہے۔“ انہوں نے خوشدلی سے کہا۔ ”اب وہ وہی ہے تمہاری پوری دلی آمادگی کے ساتھ اسے اپناؤ بیٹا!“

وہ گویا بات سمیٹ چکی تھیں، وقار بھی خاموش ہو گئے۔

”کھانا لاؤں آپ کے لیے؟“ وہ ان کے آنے سے قبل یوں ہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی، انہیں دیکھا تو بہت محتاط لہجے میں پوچھا۔ ثانیہ تو سرشام ہی بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ ان کا رویہ بہت ترش تھا۔ ایک دوبار روانے خود بڑھ کر اسے مخاطب کیا تو اس کی تیکھی نظروں اور لہجے کی کاٹ نے اسے گویا چیر کے رکھ دیا۔ تب ہی وہ ان سے اچھی خاصی خائف ہو گئی تھی۔ دوسری سمت وقار حسن تھے اپنے رویے سے اسے الجھاتے ہوئے، مگر ان کا رویہ بہر حال ثانیہ کی طرح زخمی کر دینے والا بھی نہیں تھا۔

وہ یوں چونکے جیسے ابھی ابھی اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئے ہوں۔ ان کے کوٹ اتارتے ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہوئے۔ یہ ان کی نظروں کی گہرائی تھی جو اسے کنفیوژڈ کر گئی تھی۔ وہ گڑبڑا کر پلکوں کی چلن عارضوں پہ گرا بیٹھی۔ چہرے پہ شفق پھوٹ پڑی تھی۔ معاں وہ سنبھل کر مسکرائے۔

”تو نہیں کس! کھا کر آیا ہوں! ہاں! البتہ اگر ایک کپ گرما گرم چائے مل جائے تو۔“

”جی! میں لاتی ہوں۔“ اس نے پلکیں اٹھائیں۔ وہ ابھی تک اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کا دل بہت بے ہنگم سے انداز میں دھڑکا۔ وہ سرعت سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔

چمن میں ملازمہ موجود تھی، مگر اس نے خود چائے

بنائی۔ واپس آئی تو وقار حسن صوفے پہ نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

”کہاں جا رہی ہیں؟ یہاں بیٹھیں۔“ انہوں نے چائے کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ بے طرح گھبرائی۔ ”وہ مم۔ میں آپ کے کپڑے نکال دوں، فریش ہو لیں۔“ فیروزی سوٹ میں دوپٹا سلیقے سے شانوں پہ پھیلائے لائے، سلی بالوں کو جوتی میں گوندھے، وہ گلاب کی منہ بند کلی کی طرح شگفتہ اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔

”مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔ پلیز! سٹ ڈاؤن۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے پہلو میں موجود خالی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھکتے ہوئے سمٹ کر ٹک گئی۔ وقار حسن نے بغور اس کے دھیرے دھیرے کانپتے لبوں اور ہاتھوں کی لرزش کو دیکھا اور پھر بھاری آواز میں پوچھا۔

”آپ خوش ہیں اس شادی سے؟“ ردا کے چہرے پہ سرخی چھا گئی۔

”صحیح سی! کیا مطلب؟“ وہ واقعی اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی، بوکھلا کر بولی۔

”مطلب۔۔۔ میری اور آپ کی عمول میں بہت فرق ہے۔ ہو سکتا ہے، آپ کے گھر والوں نے کسی مجبوری کی بنا پہ۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے شادی سے پہلے سب کچھ صاف لفظوں میں بتا دیا تھا۔“ اس نے صاف اور دو ٹوک بات کی۔ اس کی سمجھ میں اب آیا تھا کہ اس رات وقار حسن اسے دیکھنے کے بعد ڈسٹرب کیوں ہوئے تھے۔

”اس کا مطلب آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟“ وہ اسے کھوج رہے تھے۔

”مگر اعتراض ہوتا تو میں یہاں نہ ہوتی۔“ ردا نے بہت نرمی سے مسکرا کر کہا۔ وقار حسن کے لبوں پہ بہت بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شروع کریں نا وقار! آپ کو آفس سے دیر ہو رہی

ہے۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر ٹائیپ کے ساتھ تھے اور ردا کے منظر جب ٹائیپ نے ٹوکا تھا۔
 ”ہاں! وہ میں۔ اگر تم جاؤ ردا! بی! اسے کو ناشتا کر لیں۔“ ٹائیپ سے کچھ کہتے کہتے انہوں نے اچانک ملازم کو مخاطب کیا۔
 ٹائیپ کے جڑے بھیج گئے۔ اکرم کے جانے کے بعد وہ بہت ضبط کرتے ہوئے بھی بھٹ پڑی۔
 ”کیوں؟ اس کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا آپ کے؟“

وقار حسن نے جواب میں خشمگین نظروں سے انہیں دیکھا۔ البتہ کچھ کہنے سے گریز کیا اور یہی چپ ٹائیپ کو آگ لگا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں اپنے اندر کی تپش باہر نکالتی، ردا غائبی رنگ کے انتہائی آٹنٹش لباس میں اندر داخل ہوئی۔ ٹائیپ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور سخت طیش کے عالم میں ہاتھ مار کر اپنے سامنے دھڑے ناشتے کے برتن گرا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے انہی اور تن فن کرتے ہوئے ردا کو دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی۔ ردا کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے متوحش نظروں سے وقار حسن کو دیکھا۔ وہ سختی سے لب بھیجے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر برہمی کا تاثر تھا۔ ردا کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہوئی اور بچے کی طرح لرزتے دل سمیت دیوار سے لگ کر کھڑی ہوئی۔

وقار حسن اٹھے کرسی کی پشت پر لٹکا ہوا کوٹ اٹھاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔
 ”ٹیک اٹ ایزی! اب آپ کو اس قسم کی صورت حال کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا پڑے گا۔“
 ”مم۔ مم۔“

”ردا! اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ بعد میں بات کریں گے۔ اگر ٹائیپ کسی بات پہ خفا ہو تو برواشت کر لیجیے گا۔ وہ کچھ ڈسٹرب ہیں۔“ انہوں نے ملائمت سے کہتے ہوئے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ وہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

وقار حسن کا تعلق جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے، جب ہی تمام امیدوں کے مرکز بھی وہی تھے۔ وہ تعلیم کی غرض سے تقریباً شہر ہی میں رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہیں گاؤں حویلی اور سرداری و جاگیروں سے زیادہ شہر کی زندگی بھائی تھی۔ کلج میں ٹائیپ ان کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں میں بہت دوستی بھی تھی۔ دوستی محبت میں کب ڈھلی انہیں تو پتا ہی نہ چل سکا۔ قابل اداؤں اور خوب صورت چہرے والی ٹائیپ کے بغیر انہیں زندگی اوھوری محسوس ہونے لگی، جب ہی تو تعلیم مکمل کرتے ہی انہوں نے اہل جان سے ٹائیپ کے لیے بات کی تھی۔
 ”مگر بیٹا تمہاری بات تو بچپن سے ہی تمہارے ماموں کے گھر طے ہو چکی ہے۔“
 ”کیا؟“ وہ بھٹا گئے۔ ”مجھے سسلی اس حوالے سے بالکل پسند نہیں۔“ انہوں نے ایک قہراٹھا دیا۔
 ”تمہارے بابا کو پتا چلے گا تو بہت خفا ہوں گے اور تمہارے ماموں وہ تو ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ دیں گے۔ اپنے دل کو کچھ سمجھا پڑا۔“ وہ لجاجت سے بولیں۔
 ”اہل جان! ٹائیپ کے معاملے میں کوئی کھجور وائز نہیں ہوگا۔ یوں سمجھ لیں، اسے کھونے کا حوصلہ ہی مجھ میں نہیں ہے۔“

اور اہل جان خاموش ہو گئیں، مگر اگلی بار جب وقار حسن نے شہر سے آکر پھر وہی بات کی تب انہوں نے بے چارگی سے کہا۔
 ”مجھے آزمائش میں مبتلا مت کرو وقار! میں نے بات کی تھی تیرے مامے سے۔ وہ تو سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گیا۔ کہہ رہا تھا اگر آپ نے ایسا سوچا بھی، میری وہی یہ کسی غیر کو ترجیح دی تو میں ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ لوں گا۔ اب بتا کیسا ہے چھوڑ کر وہ لوں گی میں؟“ وہ بے بسی کی انتہاؤں پہ تھیں۔

”اور مجھے؟ مجھے چھوڑ کر وہ بائیں گی اہل جان؟“
 وقار نے بہت بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی زبان پہ

ٹائیپ کے الفاظ تھے۔ جب انہوں نے اپنی الجھن ٹائیپ کے سامنے رکھی تو اس نے یہی بات کہی تھی۔
 ”بس تم ایسے کہہ دینا! یوں مانیں گی۔“
 ٹائیپ نے چٹکی بچائی تھی۔

وقار اب واقعی اہل نے ہتھیار ڈال دیے تھے، انہوں نے ٹائیپ کو حاصل کر لیا تھا۔

ان کی شادی کو تین مہینے ہوئے تھے، جب بابا جان اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اہل گاؤں میں اکیلے رہ گئیں۔ وقار حسن نے تو شہر میں خوب صورت بنگلہ خرید کر وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ گاؤں میں رہنے کے علوی ہی نہ تھے، پھر ٹائیپ بھی تو ایسا نہیں چاہتی تھی۔

وقار سوئم تک اہل کے ساتھ رہے، پھر انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا، مگر اہل جان نہیں مانیں۔
 ”نہ بیٹا! یہاں تمہارے بابا کی یادیں ہیں، پھر ہمارے تو سارے رشتے دار بھی یہیں ہیں۔“
 ”مگر حویلی میں تو آپ تنہا ہیں اہل جان!“ وقار پریشان تھے۔

”میں بھی تو پرسہ دینے والے آرہے ہیں۔ کیسے جاسکتی ہوں میں؟ ہاں! تو دلہن کو میرے پاس چھوڑ دے، تیری نوکری کا مسئلہ ہے، تو چلا جا۔“ تب تک انہوں نے اپنا پرنس نہیں شروع کیا تھا۔ وقار، ٹائیپ کے چہرے کے بگڑتے زاویوں کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ مگر ٹائیپ خاموش نہیں رہی تھی۔

”ہرگز نہیں! اتنا گھٹا ہوا ماحول ہے یہاں کا، پھر فونگی والا کمرہ۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے وقار! میں ہرگز یہاں نہیں رک سکتی۔“
 ”مگر ٹائی! اہل جان کیا کہیں گی کہ انہوں نے خود رد کا ہے تمہیں۔“

”وہ جو بھی مرضی سوچیں۔ میں کہاں عادی ہوں ایسے ماحول کی۔ انہیں بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہماری نئی شادی ہوئی ہے۔ انجوائے کرنے کے دن ہیں۔ تاکہ یہاں تعزیت کے لیے آنے والوں سے گلے مل کر روٹی رہوں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

اور پہلی بار وقار حسن کی اس سے جھڑپ اسی بات پہ ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ٹائیپ کے دل میں اہل جان کی طرف سے گہرا پڑ گئی تھی۔ وہ حویلی میں رکی تو تب بھی نہیں تھی، مگر جب وقار حسن اہل جان کی منت سماجت کر کے اپنے ساتھ شہر لائے تو تب بھی ٹائیپ کی ہی بدکلامی اور ہمہ وقت رہنے والی مانتے کی شکنوں کو دیکھ کر ہی انہوں نے واپسی حویلی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وقار یہ سب دیکھتے تو تھے، مگر کچھ کہنے کا قاعدہ نہیں تھا، جب ہی ایک چپ سلوہلی تھی۔

پھر بہت سارا وقت بیت گیا۔ اہل جان ان کی اولاد کے لیے جتنی بے چین تھیں اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی گاؤں آتے، اہل جان چپکے چپکے انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیتیں۔
 ”سسلی! ابھی تک تمہارے نام سے بیٹھی ہے۔“ وہ آہ بھرتیں۔ یوں ٹائیپ درحقیقت اہل جان سے نہیں سسلی سے خائف تھی۔ جب ہی باقاعدہ منصوبے سے ردا کو بیاہ لائی۔

”مبارک ہو، آپ کو مسٹر وقار! آپ کی مسز پرہگنٹ ہیں۔“ ڈاکٹر روینہ کے الفاظ ردا اس قدر حیران ہوئے تھے کہ کئی ٹائپوں کو کچھ بولنے کے تو کیا، حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہے۔
 آج صبح ہی اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وقار حسن تو اسی وقت اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہے تھے، مگر ردا نے منع کر دیا تھا۔
 ”آپ آفس جائیے! شام کو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“

”مگر آپ کی طبیعت۔“
 ”اتنی بھی خراب نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”آپ کی میٹنگ نہ ہوتی تو اور بات تھی چلیں! میٹنگ ہی اینڈ کر کے آجائے گا۔“ اس کی یہی عادت انہیں سب سے اچھی لگتی تھی کہ وہ ان کا بہت خیال رکھتی تھی، خود سے بھی زیادہ۔ آفس میں بھی ان کا دھیان ردا

میں انکارا۔

گھر واپسی پر وہ اسے ساتھ لے کر کلینک آئے تھے، جہاں ضروری ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر روبینہ نے یہ خبر سنا کر انہیں حیران کر ڈالا تھا۔

”کیا بات ہے وقار صاحب! آپ کو خوشی نہیں ہوئی، جبکہ میرے خیال میں تو اس وقت آپ کے لیے سب سے اہم اور خاص خبر یہی ہونی چاہیے تھی؟“ ڈاکٹر روبینہ نے مسکرا کر شفقتی سے کہا، تب وہ سنبھل کر بے ساختہ مسکرائے۔

”یہ بات نہیں بننے ڈاکٹر! اچھو بھلی میں اتنی جلدی اس خبر کی توقع نہیں کر رہا تھا۔“ وہ تبسم نظروں سے روا کا شرمیلیں مسکان سے سجا گلہابی چھوٹکنے لگے، جہاں ان گنت رنگ سجے تھے۔

”بہر حال! اب تو آپ کو خدا کا شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مسز ثانیہ بیگم کا بھی مشکور ہونا چاہیے۔ آف کورس آپ کی خوشی پوری کرنے کا وسیلہ ہیں۔“ ڈاکٹر روبینہ نے کہا، پھر رائٹنگ پیڈ پر چند دواؤں کے نام لکھنے کے بعد رچہ پھاڑ کر انہیں بھجایا۔

”یہ میڈیسن انہیں استعمال کرائیں اور چیک اپ بھی باقاعدگی سے کروائیں۔ ان کی ڈائیٹ کا چارٹ میں بنا کے دوں گی۔ انہیں بہت کیئر کی ضرورت ہے، بہت خیال رکھیے گا۔“ ڈاکٹر نے انہیں ہدایت کی۔

”اماں جان تو بہت خوش ہوں گی، ابھی میں آپ کو ان سے ملانے لے جاتا، مگر اب ڈاکٹر نے سفر سے منع کر دیا ہے۔“ راستے میں وقار حسن نے اس کے کترائے ہوئے بے انداز کو تکتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔

”تو آپ انہیں یہیں لے آئیے نا! میں خود بہت بے چین ہوں ان سے ملنے، انہیں دیکھنے کو۔ اسی بہانے ان کی خدمت کا بھی موقع مل جائے گا۔“ وہ انہیں دیکھے بغیر آہستگی سے بولی۔

”اوں ہوں! ابھی تو خدمت کیا کریں گی آپ۔ ابھی تو وہ آپ کو اپنی تھیلی کا چھالنا بنا کر رکھیں گی۔ آخر کو ان کی سالوں پرانی خواہش پوری کرنے والی ہیں آپ۔“

وقار حسن نے شرارتی انداز میں کہا۔ وہ مسخ ہو گئی۔ وقار حسن اس خوب صورت نازک سی لڑکی کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرائے تھے۔



”تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے ثانی! یہ وقت جتنا بھی کڑا سہی، آخریتنے والا ہے۔ اگر تمہارے اپنی اسی رقابت میں کچھ غلط کر دیا تو سمجھو! عمر بھر کا روگ پال لو گی۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ وہ اتنی جلدی ریگنٹ ہو گئی ہے، ورنہ خود سوچو! اگر ایک سال تک بھی ایسی امید نظر نہ آتی تو تمہارا کیا بنتا؟“ صالحہ نے ثانیہ کو رسان سے سمجھایا۔ وہ صالحہ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ غصے، طیش اور غم سے اس کی ذہنی حالت دو گروں ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں کیوں صالحہ! مجھے لگتا ہے میں نے خود اپنے لیے اچھا نہیں کیا۔ میں دن رات ان دیکھی آگ میں جل رہی ہوں۔“ وہ سخت وحشت کا شکار تھی۔ ”فہ! کچھ غلط نہیں ہوا۔ اب تو دن انگلیوں پہ گنے جاسکتے ہیں۔ اس کی ڈیوری ہوئی نہیں اور اس سے تمہاری جان چھوٹی نہیں۔“ صالحہ نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

”یہ سب اتنا سہل نہیں ہو گا صالحہ! اماں جان بھی انوالو ہو چکی ہیں۔ خاص طور پر اس چیمپی کے لیے گاؤں سے تشریف لائی ہیں۔ وہ تو پھولے نہیں سار ہیں اس خبر کے بعد۔ کیا پتاؤں صالحہ! کیسے کیسے نہیں دل جل رہا میرا۔“ وہ دانت پیس رہی تھی میوں کہ جیسے بس نہ چل رہا ہو ردا اور اماں جان کو کچا چاؤالے۔

”جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔ جہاں تک ردا سے جان چھڑانے کی بات ہے تو بے فکر رہو۔ ایک سے ایک آئیڈیاز ہیں میرے پاس اسے دفعتان کرنے کے لیے۔ وقت تو آنے دو۔ آخر کو تم میری پیاری دوست ہو۔ تمہارا دکھ مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہا ہے۔“ صالحہ نے اس کا شانہ تھپکا۔

ثانیہ ضبط کی کوشش میں مسخ آنکھوں سے انہیں

”ہوئے ہنوز بے یقین تھی، مگر جب صالحہ نے اس پر جھک کر سرگوٹیوں میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تب وہ مطمئن ہو گئی۔



”خون سفید ہونے کی نشانی ہے، ورنہ بھلا ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ برے و عوے کیے جاتے تھے۔ مدر ٹریا بننے کی بڑی شان دار کوشش کی تھی۔ سب کچھ خاک میں مل گیا۔ بھئی! کسی سے کیا کہیں، جب اپنا سکھ ہی کھوٹا نکلے تو۔“

اس نے وقار حسن سے اپنی ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ٹالنے کے تو خیر وہ اس کی کوئی بھی بات نہیں تھے، مگر آج کل تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آفس جاتے ہوئے اسے یہاں چھوڑ گئے تھے اور اس کے باپ کو اس کے لیے لینے یا دوسرے لفظوں میں دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ اتنی خفت زدہ ہوئی کہ منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی۔ دیکھا جائے تو وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ واقعی بھلا بیٹھی تھی انہیں، مگر یہ بات کہنے کا اس کی ماں کو تو حق تھا، انہیں بالکل نہیں۔ بہر حال وہ اس کی ذمہ داری تو نہیں تھے۔ اس کی ماں نے اس کا خجالت سے سرخ پرنا چہرہ دیکھا تو آہستگی سے ہاتھ دبا کر اسے پرسکون رہنے کا کہا تھا۔ وہ تو اس کے امید سے ہونے کا سن کر جیسے نہال ہی ہو گئی تھیں۔ باقاعدہ شکرانہ ادا کیا تھا اور ساتھ اسے ڈھیر ساری نصیحتیں بھی جن میں سرفرست اپنی سوکن کا خیال رکھنے کی تاکید بھی کہ بلاشبہ بڑی عظیم عورت تھی جس نے دل پہ پھر رکھ کے یہ قدم اٹھایا تھا۔

شام کو وقار حسن نے آنے کی بجائے ڈرائیور بھیجا تو اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ ماں کے سامنے الگ نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا امیر کبیر لین لارڈ داماؤں کے اس تنگ و تاریک ٹوٹے پھوٹے گھر میں آنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔

”یہ رکھ لیں ابا!“ بیوی دروازہ پار کرنے سے قبل اس نے اپنے بیگ سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر چرس بھری سگریٹ کے کش لگاتے باپ کی مٹھی میں دبائے تھے۔ اس کی ماں چیختی رہ گئی، مگر وہ پلٹ کر دیکھے بنا دلیپ پار کر گئی تھی۔



”کیا بات ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“ ثانیہ رات کھانے کی ٹیبل پہ نہیں تھی۔ جب صبح ٹاٹے پر بھی انہیں غیر حاضریا تو وقار حسن اس کی طبیعت پوچھنے چلے آئے۔

”آپ آفس جائیں! آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔“ ثانیہ نے ان کی بات کے جواب میں گویا پتھر پھوڑے۔ وقار حسن نے چونک کر ان کے چہرے کو دیکھا، جہاں وحشت، اضطراب، بے کلی، سب ہی کچھ مترشح تھا، گو کہ وہ بہت محتاط زندگی گزار رہے تھے۔ ردا سے نکاح کے بعد انہوں نے بہت کوشش کی تھی کہ ثانیہ کی کسی بھی لحاظ سے حق تلفی نہ ہو، اس کے باوجود انہیں لگ رہا تھا ثانیہ ڈسٹرب رہنے لگی ہے تو اس کی وجہ شاید اماں جان کی اس گھر میں موجودی اور ردا کو حد سے زیادہ اہمیت دینا تھا۔

”مجھے دیر نہیں ہو رہی۔ تم پتاؤ کیا پر اہم ہے؟ کیوں پریشان ہو؟“ وقار حسن نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوٹ اور بریف کیس وہیں صوفے پہ رکھے اور ان کے قریب آ بیٹھے۔

(پاگل مت بنو ثانیہ! بنانا یا کھیل مت بگاڑو، سمجھ لو یہیں سے تم اپنی آئندہ زندگی کے لیے سنگ بنیاد رکھو گی، اچھی چاہے بری۔)

اس نے وقار حسن کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا اور چیخ چلا کر اپنا تمام ہیجان نکال دینا چاہتی تھی جب اس کے داغ میں جیسے صالحہ کی باتوں کی آواز باز گشت بن کر سرسرائی، تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لب بھینچے ہوئے خاموش ہو گئی۔ وقار حسن اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بہت دھیان سے دیکھ رہے تھے۔

Email: ld@khawateendigest.com



سرکش و اجکماري

داسی

ہولاد

مجلس شورای اسلامی

برباد زندگی

خواب گزیده

ایک پراسرار گھر۔ ایسی ایسی عجیب سی باتیں۔

ہمنے کا حشر

ہر سال کی طرح ہوتی ہے۔ ہر سال کی طرح ہوتی ہے۔ ہر سال کی طرح ہوتی ہے۔

کیساتھ ہی..... ابو القاسم رحمہ

نیوٹری ڈون

میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو شخص اس کی کتب خانہ میں آتا ہے اس کی کتابوں کی

مستور الز

میلہ گوشت

[Faint handwritten notes at the bottom of the page]

مذکورہ بالا تمام افسانوں کی تصانیف کے مصنفین کی طرف سے ان کے حقوق محفوظ رکھے گئے ہیں۔

صالح کے بعد میری جگہ پر ان کی بیوی نے کھانا کھا کر کھدے پڑے اور وہی کھانا کھا کر
کھسٹاؤں کے مگرمیں کودنے لگا اور غریب صالحوں کے واسطے کہ وہ سب غریب تھے

مئی 2012 کا تازہ شمارہ آج ہی خریدیں

2013 5

سب پر مہ دینے والے بھی اسی سوسائٹی کے لوگ تھے جس سے وقار حسن اور ثانیہ تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو ثانیہ اور وقار حسن سے ہی ہمدردی تھی۔ اسے تو وہ سب کسی عاصب کی نظر سے دیکھتے تھے ایسے میں ردا کا جی چاہتا، وہ کسی ایسی جگہ جا چھپے جہاں اس کی نظر نہ ہوں۔ وہ اندر سے کمزور پڑ رہی تھی۔ وقار حسن کی توجہ اور ہمدردی کی خواہاں تھی، مگر آج مل تو وقار حسن کے پاس اس کے لیے جیسے بالکل اہم نہیں تھا۔ وہ ثانیہ کی وجہ سے از حد ڈسٹرب تھے، انہیں جان کی وفات پہ ایک دم کھسکا کے رہ گئی تھی۔ اہل جان کی بیماری کے دنوں میں ثانیہ، اسامیہ کے ساتھ ساتھ اہل جان کا بھی بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ اس نے ان چار مہینوں میں اہل جان کی اتنی خدمت کی تھی کہ وہ ماضی کی تمام ناراضگیاں بھلا نے پہ مجبور ہو گئی تھیں اور مرتے دم تک ان کے لبوں پہ ثانیہ کے لکھنوں کی دعائیں ہی تھیں۔

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے مانی! یہ تمہی ہو؟ ارے! تمہیں اس بڑھی کے مرنے یہ اتنا اثر لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ اگر وقار بھائی کو متاثر کرتے کی سعی تھی تو جانو! وہ تو آل ریڈی تمہاری مٹھی میں تھے اور رہیں گے۔ روبا بے چاری اپنے حسن جہاں سوز اور تمام تر جوانی و نوخیزی کے باوجود ایک کونے میں کھڑی نظر آتی ہے۔“

اماں جان کا چہلم تھا۔ ثانیہ سفید لباس میں ملبوس
پہرے پہ حزن و ملال لیے گیو میں سوئے اسامہ کے
ہالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی جب صالحہ نے اسے
حیرانی سے سکتے ہوئے کسی قدر اچھٹے سے کہا تھا۔
ثانیہ نے دل سوزی سے لمبی آہ بھری۔

”نہیں صالحہ! میں نے مان لیا، غلطی پہ میں ہی تھی۔ اہل جان تو بے چاری بہت اچھی خاتون تھیں۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ عطا فرمائے مجھے دکھ ہوا کہ لو! انخوا اتنے سال ان سے بدگمان رہی۔ اب انہیں قریب سے دیکھا تو ان سے محبت کرنے پہ مجبور ہو گئی“

کے حوالے بلبل درخواست کرتے ہوئے اس نے ایک نیا آرڈر لگایا۔

روا چوتک سی گئی، وہاں تھی اور اپنی مامتا کو کسے
 ٹھیک کر سلا رہی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ بچے کو
 ٹانہ کے حوالے کرنے پہ مجبور تھی۔ اس بات پہ
 تڑپ کر ٹانہ کو دیکھنے لگی۔

دکھایا مطلب ہے دلہن؟ ہمیں کی موجودگی میں بچے کو
وہ قتل کا بازاری دودھ پلانے کی کون سی آفت آئی ہوئی
ہے؟ ہمیں جان کی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ یہ بات
پنپ چاپ سنیں۔ ٹھنڈے سے لہجے میں ٹوک دیا۔
"مافیہ نے پہلے تو۔ سرو نظروں سے انہیں دیکھا،
مرسانیت سے بولی۔

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے میکے
میں جانا ہوگا“ ظاہر ہے اسامہ تو وہاں نہیں رہے گا
”اے“

”وہاں کیا مضائقہ ہے؟ جب میں رہ سکتی ہے تو بیٹا کیوں نہیں؟“ میں جان کا لہجہ ہنوز خٹکھا اور سر و شالہ۔
 ”اس لیے کہ میں اس ماحول کی عادی ہے، مگر یہ ہمارا
 دن ہے۔ وقار حسن کا بیٹا ایسے معمولی گھر میں جلے
 کیوں رہے؟“ ثانیہ زہریلے کبجے میں کہہ کر جھٹکے سے
 دھکے چلائی۔

روا سکتے بیٹھی تھی۔ اماں جان نے اس کے سر پہ
تھ رکھا تو اس کی آنکھوں میں دھند سی اتر آئی۔

ردا غیر یقینی سے آنکھیں پھاڑے اہل جہن کو سفید
 بادہ اوڑھے آخرت کے سفر کے لیے بالکل تیار و یکہ
 ہی تھی۔ لہن کا وجود اس کے لیے ٹھنڈی چھایا کی
 طرح تھا۔ وہ وقار حسن سے زیادہ لہن سے نزدیک ہو گئی
 سی، مگر اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم سے چپتی
 سوپ میں آکھڑی ہوئی ہے۔ سوئم تک وہ اسی غیر یقینی
 لے حصار میں مقید رہی تھی۔

اسے علم تھا کہ وہ کبھی بھی ثانیہ کے برابر کی حیثیت
میں پاسکتی، اس کے باوجود کہ وہ وقار حسن کی بیوی

”آریو لو کے؟“ وہ نرمی سے استفسار کر رہے تھے۔
 ”ہیسن! ایم لو کے ناؤ۔“ انہوں نے گہرے گہرے
 سانس بھرے۔

”ہاں! میں بتا بنایا کھیل نہیں بگاڑوں گی، مگر یہ بڑھیا چلی کیوں نہیں جاتی؟ مجھے لگتا ہے اس کی وجہ سے ضرور کچھ غلط ہوگا۔“ وقار حسن کے جانے کے بعد وہ ہاتھ مل مل کے سوچتی رہی، مگر پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی کون سا لپکا تھا۔ اگلے ہی پل وہ بہت پُر جوش نظر آنے لگی۔

☆ ☆ ☆

پھر وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔ ثانیہ نے خود پہ
چاپلوسی، ہمدردی اور جھوٹی محبت کا طمع چڑھایا اور بہت
کامیابی سے وہ لکھن چاہا اور نفرت انگیز رول نبھائے گئی۔
پھر وہ وقت بھی آیا تھا جس کے لیے اس نے بہت دل
مارا تھا۔ بہت ساری چیزیں اپنے حصے میں لکھوایا تھا۔ اور
بل بل سہل پہ لکھی تھیں۔

روائے شہر کے مہنے ترین اسپتال میں ایک صحت مند اور خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقار حسن اور امی جان کے ساتھ ساتھ ثانیہ بھی دل سے خوش ہوئی تھی۔

”یہ میرا بیٹا ہے، صرف میرا“ اس کا ہر کلام میرے ذمے۔“ اس نے ننھے بچے کو گود میں لے کر چٹا چومتے ہوئے، جس مجنوناۃ انداز میں اعلان کیا تھا، اس کی شدت اور گہرائی کو بائے لغیر و قار حسن لور امل جان بھرور طمانیت سے مسکرائے تھے۔

ٹانیہ نے اپنا کماچ بھی کر کے دکھایا تھا۔ اس نے بچے میں گم ہو کر گویا دنیا ہی بھلا ڈالی تھی۔ یہ ایک عورت کی ترستی ہوئی مامتا بھی تھی اور ملکیت کا جذبہ بھی۔ ردا کو اسامہ کو صرف اس وقت دیا جاتا جب اسے فیڈ کروانا ہوتا۔ رات کو بھی ٹانیہ ہی اسے اپنے ساتھ سلاتی تھی۔

”۴ سے فیڈر سے بھی دودھ پلایا کرو“ امتاعلیٰ مت
 بتاؤ اے۔ ”بھوک سے بے تحاشا روتے اسامہ کو روا

”جھا؟“ صالحہ نے تھیر بھرے لہجے میں کہا اور گہری کھوجتی ہوئی نظروں سے ثانیہ کا چہرہ دیکھنے لگی جیسے اس کے اندر کا بھید پانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”کتنے دنوں کے لیے چارہ ہیں؟“ ردا وقار حسن کا سوٹ کیس تیار کر رہی تھی۔ جب سے اسے ان کے بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے کا پتا چلا تھا، ثانیہ کے ساتھ یہاں تنہا رہ جانے کے خیال سے ہی ہراساں ہو گئی تھی۔

”صرف دو ہفتوں کے لیے۔ یوں گزر جائیں گے۔ آپ نے بتایا نہیں کیا لے کے آؤں آپ کے لیے؟“ وقار حسن نے مسکرا کر تسلی دی۔ اسے اس قدر اس دکھاؤ نہیں اس پر بے تحاشا پیا آیا۔

”یہاں رہ کر بھی تو ہر وقت آپ کے ساتھ نہیں ہوتا ردا! پھر اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ اگر چاہیں تو اتنے دنوں اپنے پیرس کے ہاں رہ لیں۔“ وہ ایک بار پھر جیسے اسے بہلا رہے تھے۔ ردا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اسامہ کے بغیر اتنے دنوں رہنا بہت مشکل ہے۔ وہ وہاں میرے ساتھ کیوں نہیں جاسکتا؟“ اس کے دل کا وہ زبان پہ اتر آیا۔ وقار حسن نے لب بچھینچ لیے تھے۔

”آپ جانتی ہیں ردا۔۔۔ اسامہ، ثانیہ کے لیے۔“ مگر میں اس کی سگی ماں ہوں وقار! میں اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔“ ان کی بات کاٹ کر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ وقار حسن نے سخت تینہ ہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ردا! یہ سگی اور سوتیلی کا لفظ آج کے بعد آپ کی زبان پہ نہیں آنا چاہیے۔ ثانیہ نے جو قربانی دی ہے، وہ آپ کو یاد رکھنا چاہیے۔“

وہ سخت نرم گے پن سے کہتے ہوئے پلٹ کر باہر نکل گئے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ثانیہ! آپ؟ میں کہاں جاؤں گی آخر؟“ ردا کے تو قدموں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

وقار حسن کو مجھے صرف تیسرا دن تھا کہ اس پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ثانیہ نے اس کا مختصر سامان اس کے آگے پھینک کر اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

”خبردار! مجھے آپامت کہنا۔ تمہیں اتنے مہینے کیسے برداشت کیا؟ یہ صرف میں جانتی ہوں، کمتر بے پایا عورت! تم اس قابل ہو کہ میرا شوہر شیئر کر سکو؟ مگر بعض اوقات مجبوریاں بھی انسان سے کیا کچھ کرایا کرتی ہیں۔“ ثانیہ کا لہجہ حقارت زدہ تھا۔ ردا کا سانس اٹکنے لگا۔

”مگر آپ نے خود۔۔۔“ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

”ہاں! خود پیا تھا یہ زہر کا گھونٹ، صرف اولاد کی خاطر اب نہیں مزید کیوں برداشت کروں؟ یہ لڑائی اتنی رتم ہے کہ تم اور تمہارے بچے باپ اور بھائی مرنے کے قریب مل کے لیے باقی زندگی کاٹی ہوں گے۔ اتنی درد دہن ہو جاؤ کہ وقار حسن بھی تمہاری پرچھائیں کو بھی نہ پاسکیں۔“ ثانیہ نے ٹوٹوں کی گڈیاں اس کے آگے پھینکتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ پھر ردا کی منت ساجت، روتا، ترشنا کچھ بھی کام نہیں آیا۔ ثانیہ نے ملازموں سے کہہ کر اسے دھکے دے کر وہاں سے نکلوا دیا۔

ایک سال بعد۔۔۔
کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ باہر موسم اپنی شدتوں پہ تھا۔ پردے گرے ہوئے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے باوجود بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی خوف ناک چمک اس نیم تاریکی کمرے کو لمحہ بھر کے لیے روشن کر جاتی تھی۔ ثانیہ اپنی چیرہ بے دم سی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے جو پچھلے کی ہوا

سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ یہ وقار حسن کا خط اور ان کی طرف سے دیا گیا طلاق نامہ تھا۔

ہاں! وہ سب اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا تھا، جس کے لیے اس نے ہر جائز ناجائز قدم اٹھانے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ کچھ گناہ ظاہر تھے، کچھ پوشیدہ۔ ردا کی زندگی بڑا دماں جان کی تو زندگی کا چراغ ہی بجھا ڈالا۔ ماں جان کی زندگی میں ردا کو برباد کرنے کا خواب اوھو رہی رہتا، سو اس نے انہیں خدمت کے بہانے سلو پوائزن دینا شروع کیا اور محض چار ماہ میں اپنا گوہر مقصود حاصل کر لیا۔ اس کے اس گناہ کو منوں مٹی کی تہہ نے دنیا کی نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا، مگر رب تعالیٰ پوشیدہ اور ظاہر تمام گناہوں سے واقف ہے اور بلاشبہ اس کا حساب بے حد شفاف ہے۔ دنیاوی میزان کے پلڑوں کو ہم چور و دزدانوں سے حاصل کی گئی ڈنڈیاں مار کر اپنی حسب خواہش اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں مگر اس کا عدل اس سب سے بالاتر ہے۔ وہ سزا دینے پر آئے تو بس ایک جھٹکا کافی ہوتا ہے۔

ردا کی گمشدگی نے وقار حسن کو پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ اپنی اداکاری سے انہیں مزید دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ شاید ایسا ہو بھی جاتا اگر جو صالحہ انہیں چاروں شانے چت نہ کر دیتی۔ صالحہ نے اس کے سامنے وقار حسن پہ وہ ساری باتیں مزید چار لگا کر عیاں کی تھیں جن کا مشورہ دینے والی وہ خود تھی۔ صالحہ جو اس کی بہترین دوست اور نمکسار تھی۔

”حیران مت ہو ثانی! کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ یاد کرو! برسوں قبل تم نے بھی میرے ساتھ ایسا کیا تھا۔ وقار حسن صرف تمہاری نہیں، میری بھی محبت تھا۔ مگر تم نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ ہاں! میں تو یہی کہوں گی کہ تم نے چھینا۔ اگر تم بچ میں نہ آتیں تو آج وہ میرا ہوتا۔ تب سے میرا سینہ جھلس رہا تھا۔ آج وہاں ٹھنڈک ہے، سکون ہے۔“ وہ خباثت سے مسکرائی۔
وقار حسن تو اس لرزاؤں والے انکشاف کے بعد خاموشی سے پلٹ گئے تھے، مگر صالحہ وہیں کھڑی رہی تھی ان کا جی جلائے کو۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی استین کی سانب۔“ وہ سٹریا کی انداز میں چلائی۔
”خیر تو تم مناؤ ثانیہ بیگم! اب وقار تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔“ وہ طنز سے مسکرائی۔
اور وقار حسن نے جو کیا تھا، وہ انہیں دیوانہ کر رہا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ثانیہ! تم ایسی گھٹیا ذہنیت کی مالک نکلو گی۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تم سے تمام تعلق توڑ کر۔۔۔ ردا کو بھی ڈھونڈ لوں گا، مگر تم سوچو کہ تمہارے حصے میں کیا آیا؟“

یہ ان کے خط کے الفاظ تھے جو ثانیہ دن میں ستر ہزار بار پڑھتی اور خشک آنکھوں سے روٹی۔
ہاں! اچھلا کیا پایا تھا اس نے؟ کیوں اس نے خود کو فرعون کی طرح خدا سمجھتے ہوئے اتنے بڑے فیصلے کر ڈالے؟

آخر ایک وقت ہی تو ہوتا ہے ظلم کا، مہلت کا بھی، پھر وہ کن فرمانے والا ساری رسیاں ایک جھٹکے سے کھینچتا ہے اور زمین پہ بسنے والا خود کو خدا سمجھنے والا کسی حقیر گیرے کی مانند قہقہہ کر رہ جاتا ہے۔ یہی خدائی فیصلے ہیں کہ وہ فرماتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ مگر ثانیہ کو جب تک سمجھ آئی تھی، وقت باتھ سے نکل چکا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

گوئی ایسا اٹل دل چہو

فیصلہ فوری

قیمت --- 250/- روپے

مکوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔



برادری کا مظاہرہ کروں۔ میں کر بھی دیتی اگر آنے والے رشتوں میں سے کوئی میرے معیار سے ذرا سی بھی مطابقت رکھتا۔

رشتے میرے واقعی بہت آ رہے تھے۔ اس کا بڑا سبب میری خوبصورتی تھی۔ اپنے منہ میاں ٹھونہٹانہ سمجھا جائے تو میرا شمار صرف خوبصورت نہیں بلکہ خوبصورت ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ پھر میں اپنے "مدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ابا کا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ کچھ

لوگ اس امید پر چلے آتے کہ ابا کا جو کچھ بھی ہے بلاواسطہ یا بلاواسطہ میرا ہی ہے لیکن ابا بڑی زیرک نگاہیں رکھتے تھے۔ ایسے آنے والوں کو چائے پانی بلا کر اتنی سرد مہری سے رخصت کرتے کہ وہ پھر آنے کی ہمت ہی نہ کرتے، سو یہ اطمینان تھا کہ ابا میرا ہاتھ لاپچی لوگوں کے ہاتھوں میں ہرگز نہیں تھماؤں گے، لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ ابا کے قائم کردہ معیار شرافت و نجابت کی کسوٹی پر کوئی ایسا ویسا بھی پورا اتر گیا

شادی کے لیے ہر لڑکی کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ضرور ہوتا ہے۔ سو میرا بھی تھا۔ اس میں اچھے کی تو کوئی بات نہ تھی لیکن امی کو میری باتیں احمقانہ لگتی تھیں۔ "پھر کیا کہوں فرقان کے گھر والوں کو ہمارے ابا کو تو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔" ہر تیسرے دن امی اور میرے درمیان کچھ اسی قسم کے موضوعات پر گفتگو کی ابتدا ہوتی۔

"خدا کا نام لیں امی! وہ "لڑکا" ہے؟" میں بدکی۔ "نہیں تو کیا لڑکی ہے" امی جو اب "مجھے گھور کر دیکھتیں۔"

"لڑکا ہرگز نہیں ہے۔ آدمی ہے پورا۔ مجھ سے کم از کم آٹھ سال بڑا ہو گا وہ۔" میں نے رو ہانسی ہو کر جتایا۔

"۲۰ فرق چل جاتا ہے۔" امی نے بے حسی کا مظاہرہ کیا۔

"تو ٹھیک ہے، ہاں کروں، میری مرضی کیوں پوچھ رہی ہیں۔"

میں نے خفگی سے منہ پھلایا۔ امی ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گئیں۔ میں جانتی تھی کہ ہو گا تو وہی جو میری مرضی ہے۔ میں امی، ابا کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرے بعد وہ بھائی اس دنیا میں مزید آئے تھے لیکن دنیا میں اگر آنکھیں کھولنے کے چند لمحوں بعد ہی وہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئے تھے۔ امی، ابا نے مزید اولاد کی خواہش دل میں دفن کر دی۔ ان کی امنگوں، آرزوؤں کا مرکز میری ذات ہی تھی۔ بے جالاؤ پیار نے میری شخصیت میں زیادہ بگاڑ پیدا نہیں کیا تھا۔ ہاں چھوٹی مولی

فرمائشیں اور ضرورتیں پوری کروانا تو خیر حق تھا میرا لیکن اس بار معاملہ الگ ہی درپیش تھا۔ میں لی اے کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ امی، ابا کو میرے بیاہ کا شوق چرا گیا۔ آپس کی بات ہے بیاہ کا شوق تو مجھے بھی تھا۔ بچپن میں گڈے، گڑیاؤں کی شادیاں کرتے کرتے ہر لڑکی کے ذہن میں کب اپنی شادی کے متعلق ارمان چاگنے لگتے ہیں، پتا بھی نہیں چلتا۔ من پسند جیون سا بھی کا پسنا انجانے میں میری پلکوں پر بھی آن کر چ گیا تھا۔

لی اے کرنے کے بعد آگے تعلیم جاری رکھنا میری خواہش ضرور تھی مگر ضد یا جنون نہیں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا یونیورسٹی جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ابا بہت روشن خیال سہی، مگر اس معاملے میں وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے اسیر تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ پر بھائی کا شوق اپنی جگہ، مگر میں کچھ ایسی خاص ذہین بھی نہ تھی۔ لی اے میں ابا نے تین جگہ مجھے ٹیوشن رکھوا کر دی تھی تب کہیں جا کر لی اے کلیئر ہوا۔

میں جانتی تھی کہ ایم اے میرے بس کا روگ نہیں۔ اب کم از کم ہر آئے گئے کے سامنے منہ بسور کر شکوہ تو کر سکتی تھی کہ اتنا شوق تھا پڑھنے کا مگر ابا نے اجازت ہی نہیں دی۔ ابا الگ خوش کہ اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود میں نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا مگر اب کے بار مسئلہ کچھ روکھا ہی تھا۔ امی، ابا کی خواہش تھی کہ میں زندگی کے سب سے اہم فیصلے پر بھی ویسے ہی فرماں



تو ابامیر ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھماتے میں زرا دیر بھی نہیں لگائیں گے اور ہوا بھی یہی۔

پہلے واجبی سی شخصیت والے عرفان شاہ صاحب اب کی نگاہوں میں معتبر نہیں رہے۔

وہ تو شکر ہوا کہ ان کی ماں بہنیں اسی کو تیر طرار لگیں یوں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس کے بعد فرقان صاحب ٹپک پڑے۔ شخصیت ان کی بھی واجبی ہی تھی مزید یہ کہ عمر ٹھیک ٹھاک تھی آخر میرے بھی دل کے کچھ ارمان تھے۔

کوئی دراز قد، وجہ شخص جو سنجیدگی اور متانت کا پیکر ہو۔ چھپھورا ہرگز نہ ہو، بھاری سی آواز لیکن بات دھیمے سروں میں کرتا ہو، عورتوں کی عزت کرتا جانتا ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں عورتوں والی کوئی خصوصیت نہ پائی جاتی ہو۔

مجھے زہر لگتے تھے ایسے مرد جو گھر کے معاملات میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے کے شوقین ہوتے تھے۔ مرد تو کھانا کھاتا ہی بھلا لگتا ہے۔ عورتوں والے مشغلے اس پر ذرا زب نہیں دیتے۔ بچن میں بیوی کا دم چھلا بن کر اس کے ساتھ کام کروانے کا شوق بلاوجہ کا ہی ٹھٹھول یا سادے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ خدمت گزار یا زین مرید نائپ کے خاوندوں سے میں سخت الرجک تھی اس کی بڑی وجہ میرے گرد پیش میں پائی جانے والی ایک دو مثالیں تھیں۔

فاخرہ باجی میری پھوپھی زاد بہن۔ ان کے شوہر وقار بھائی خاوندوں کی ایسی ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ فاخرہ باجی شادی سے پہلے اچھی خاصی اسرار تھیں لیکن شوہر ایسے ملے جو انہیں مل کر پانی بھی نہ پینے دیتے۔ چلیں اب تو کچھ مبالغہ ہو گیا۔ مگر وقار بھائی تھے ایسے ہی۔ کبھی بچن میں پائے جاتے تو کبھی واشنگ مشین میں سے کپڑے نکال کر نچوڑ رہے ہوتے۔ قصور بلاشبہ فاخرہ باجی کا بھی تھا۔ انہیں اللہ میاں کی گائے جیسا شوہر قسمت سے مل ہی گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ وہ ان کے ساتھ گائے جیسا ہی برتاؤ کرتیں۔ خیر! ان کی گھریلو زندگی سے مجھے کیا سروکار ہوتا تھا۔ میں تو

بتانا چاہ رہی تھی کہ ایسے مرد مجھے بہت برے لگتے تھے ایسی ہی ایک اور مثال میری بیسٹ فرینڈ ناجیہ کے میاں کی تھی۔ سال بھر پہلے ناجیہ بیاہ کر پہلے چکوال اور پھر پٹی پانچ گئی تھی۔ اس کا سسرال چکوال میں تھا جبکہ شوہر کی ملازمت راولپنڈی میں تھی۔ شادی کے محض ایک مہینے بعد وہ سسرالی جھیلوں سے جان چھوٹنے پر شکر منائی شوہر کے ساتھ پٹی سدھار گئی۔ وہاں فارغ وقت گزارنے کا طریقہ اس نے یہ ایجاد کیا کہ گھنٹہ پہنچ کر دوا کر اپنے گھر والوں اور سیلیوں کے کان کھاتی، چونکہ میں اس کی سب سے قریبی دوست تھی سو مجھے تو تقریباً ہر روز ہی اس کے ”ندیم“ نامے سے مستفیض ہونا پڑتا۔ جی ہاں، ”ندیم“ نام تھا اس کے میاں کا۔ صبح چپ چاپ اپنا ناشتا بنا کر مہارانی صاحبہ کا ناشتا بھی تیار کرنا اور آفس کی راہ لیتا۔ دوپہر کا کھانا ناجیہ مارے باندھے پکا لیتی۔ شام کو یہ ڈیوٹی پھر سرتاج حضور کے ذمے تھی ورنہ ہوٹل زندہ باو۔

”تمہیں شرم نہیں آتی ندیم بھائی سے یہ سارے کام کرواتے ہوئے؟“ میں کبھی کبھار تو زچ ہو کر اسے لتاڑتی دیتی۔

”کیا کروں یار! مجبوری ہے تمہیں پتا تو ہے، آج کل میں کس کنڈیشن سے گزر رہی ہوں۔“ وہ لمبے میں زبردستی کی نقاہت طاری کرتی۔

محترمہ کے اماں جان بننے میں ابھی پورے پانچ مہینے باقی تھے۔ پریگنسی رپورٹ مثبت آنے کے بعد سے اس کا یہ ہی حال تھا۔ ڈاکٹر نے اسے آرام کی عمومی سی تلقین کی ہوگی جبکہ محترمہ نے ریسٹ سے مراد مکمل بیڈ ریسٹ لی۔ شوہر بھی ایسا جو اپنی ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہونے والے بچے کی ماں کی خدمت کو بھی فرض عین سمجھتا تھا۔ کبھی کبھار تو میں چپ کر کے اس کا ”ندیم“ نامہ سنتی رہتی اور کبھی آواز نہیں آ رہی یار! ہیلو ہیلو۔“ کہہ کر فون بند کر دیتی۔

فون بند کرنا میرے اختیار میں تھا مگر بھانت بھانت کے رشتوں کے لیے گھر کے دروازے بند کرنا میرے دائرہ اختیار سے قطعی باہر تھا۔ جس کا جی چاہتا منہ

اٹھا کر رشتہ لے کر چلا آتا۔

ان ہی دنوں عمواد احمد کا پروپوزل آگیا۔ موصوف میری مائی کے دور پرے کے رشتے داروں میں سے تھے۔ والد حیات جبکہ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں ہی شادی شدہ۔ برسر روزگار بھی تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہنڈ سم بھی پہلی بار کوئی رشتہ ایسا آیا تھا کہ میں اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ امی بھی ماموں مائی سے صلاح مشورہ کرنے لگیں۔

اس روز بھی مائی اسی مقصد کے لیے تشریف لائی تھیں۔ میں نے دوپہر کے کھانے میں سالن روٹی کے علاوہ مزے دار سا چائیز پلاؤ بھی بنالیا۔

”واہ بھئی مزا آگیا کھاکر۔“ مائی نے خوب ہی پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اس کے بعد دل کھول کر تعریف بھی کی۔ میرے لب مسکرائے۔ اپنی تعریف کس کو بری لگتی ہے لیکن اگلے ہی پل میری مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

”چائیز پلاؤ عمواد بھی بہت اچھا بناتا ہے۔ بہنوں کی شادیوں کے بعد بچن اس نے ہی سنبھال رکھا ہے حالانکہ علیم بھائی تو بہت کہتے ہیں کہ بیٹا کوئی باورچی رکھ لو۔ آفس سے تھک کر آنے کے بعد بچن میں گھس جاتے ہو مگر نہیں مانتا۔ بہت اچھا مزاج پایا ہے عمواد نے۔ ہنس مکھ طبیعت اور دوستانہ مزاج۔ سچ رویہ! ہماری عازنہ راج کرے گی۔“

مائی امی سے مخاطب تھیں۔ میں اس وقت تو خاموش رہی مگر مائی کے جانے کے بعد امی سے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے کسی باورچی سے شادی نہیں کرنی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے عازنہ! اتنی ناشکری ٹھیک نہیں۔“

”امی! یہ ناشکری نہیں۔ آپ خود سوچیں، کسی ایسے بندے کے ساتھ آپ کا گزارا کیسے ہو سکتا ہے جس کی عادتیں ہی آپ کو پسند نہ ہوں۔“

”دیکھا نہ بھالا عمواد تمہیں تمہیں ناپسند کیسے ہونے

لگیں؟“ امی جرح کے موڈ میں تھیں لیکن خلاف توقع اس بار ابامیری مدد کو آئے۔

”ٹھیک ہے مگر عازنہ کی مرضی نہیں تو کوئی زور زبردستی نہیں۔“

میں نے ابا کو تشکر آمیز انداز میں دیکھا۔ بعد میں کہیں جا کر بات کھلی کہ عمواد کے والد اور ابا کے درمیان گفتگو میں مسلک بر کوئی اختلافی نکتہ اٹھ گیا تھا۔ دونوں اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹے۔ یوں ابا کا دل اس رشتے سے کھٹا ہو گیا۔ سہر حال میں تو مطمئن تھی۔

مائی کو البتہ کافی دکھ ہوا تھا۔ امی کی سب بہنوں میں امی ہی بڑی بھانج کے زیادہ قریب تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ انہیں بڑی بھابھی والا مان اور مرتبہ دیا۔ چھوٹی خالا میں کبھی کبھار مندریں ہونے کا ثبوت دے دیتی تھیں اس لیے مائی کا قلبی تعلق امی اور امی کی وجہ سے مجھ سے زیادہ تھا۔ انہوں نے بڑی رنجیدگی سے امی سے کہا تھا۔

”بتا اچھا رشتہ لائی تھی رویہ! میں اپنی عازنہ کے لیے لیکن چلو جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ گھینہ کہہ رہی تھی کہ اگر آیا کا ارادہ نہیں بن رہا تو ان لوگوں کو میری فرحین دکھا دیجئے۔“

مائی نے بھولی خالہ کا نام لیتے ہوئے بتایا۔ فرحین ان کی بڑی بیٹی تھی۔ مجھ سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی۔

”ٹھیک ہے بھابھی! وہ بھی اپنی ہی بچی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ رشتہ اس کے نصیب کا ہی ہو۔“

امی نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ میں جانتی تھی کہ امی کو یہ رشتہ ہاتھ سے نکلنے کا خاصا قلق ہے اور یہ قلق اس وقت سوا ہو گیا جب فرحین اور عمواد کا رشتہ طے ہونے کے فوراً بعد ان کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

فرحین مجھ سے چھوٹی تھی۔ امی کا خیال تھا کہ پہلے میری شادی ہونی چاہیے تھی۔ خیر مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے پورے جوش و خروش سے شادی میں شرکت کی۔

کے کھانے پر بلا لیتے ہیں ورنہ وہ خود ہی آن پہنچتے ہیں۔ سمجھو وہ تو ہمارے گھر کے فرد ہیں۔“ فرحین اپنی ہی رو میں بولے جا رہی تھی مگر میرا دھیان اس کے بیان کے ابتدائی حصے میں ہی اٹک گیا تھا۔

یعنی ان میں کسی قسم کے زنانہ اوصاف نہیں پائے جاتے۔ میرا دل جھوم ہی اٹھا۔

فرحین دو گھنٹے میرا مغز چاٹ کر گئی تھی اور اس کے جانے کے دو منٹ بعد میں امی کو جا کر رضامندی دے آئی تھی اور پھر تو جیسے سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں کیسے ہوئیں، رسومات کتنے دن چلیں اور کب اور کیسے میں، حسن کے سنگ رخصت ہو کر حسن ولا پہنچ گئی۔ سب کچھ جیسے ایک خواب تھا اور جب حسن نے میری کلائی میں خوب صورت سا نگین پہنایا تو یہ میرے خواب کی حسین ترین تعبیر تھی۔

میں خوش تھی، بے تحاشا خوش۔ شادی کے بعد حسن بہت محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ان کی سگت میں زندگی کے خوب صورت ترین دور کا آغاز ہوا تھا۔ شروع شروع میں مجھے تنہائی سے ذرا سی گھبراہٹ ہوتی تھی کہ حسن کی جاب نائن ٹو فائیو والی تھی۔ اکیلے دن گزارنا مسئلہ بن جاتا تھا، لیکن پھر عادت ہو ہی گئی تھی۔ گھر کے سارے کام میں حسن کی آمد سے پہلے بننا پڑتی۔ وہ آفس سے آجاتے تو ہم کھونٹے پھرنے نکل جاتے۔ کبھی فرحین اور عمو کی طرف، کبھی میں اپنے گھر تو کبھی ویسے ہی لانگ ڈرائیو کے مزے لوٹ کر، آفس کریم کھا کر گھر کا رخ کرتے۔

ڈنر کبھی باہر نہ کرتے، نہ باہر سے کچھ پکا پکایا گھر لاتے کہ حسن بہترین سے بہترین ہوٹل کے کھانے کو بھی غیر معیاری اور مضر صحت کھانوں کی فہرست میں شامل کر دیتے تھے۔ انہیں گھر کا پکا ہوا ہی چاہیے ہوتا تھا۔ ہماری شادی سے پہلے سامعہ (سند) جب بھی بھائی سے ملنے گھر آئی۔ کئی طرح کے کھانے بنا کر فریز کر جاتی، ورنہ ڈنر اکثر وہی شترہ عمو کی طرف ہی کرتے تھے اور ایک کھانے پینے کی عادتوں پر ہی کیا موقوف،

مہندی کی رات ڈھولک کی تھاپ پر تان بلند کرتے ہوئے میں کسی کی نگاہوں کے ذریعے دل میں اتر گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ حسن عمو کے گھرے دوست تھے۔ دونوں کے معمولی حالات ملتے جلتے تھے۔ حسن کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بڑے شادی شدہ بھائی امریکہ میں مہیٹل تھے۔ ایک چھوٹی بہن تھی جس کو چند ماہ قبل ہی گھر بار کا کیا تھا۔ بہن اپنی شادی کے بعد بھیا کے لیے لڑکی تلاش کرتی پھر رہی تھی لیکن بھیا نے بہن کو اس زحمت سے بچالیا۔ لڑکی انہوں نے خود تلاش کر لی۔

فرحین کی شادی کے ٹھیک ایک مہینے بعد حسن کی چھوٹی بہن اور بہنوئی حسن کا رشتہ لیے ہمارے گھر آن موجود ہوئے۔ تائبہ کندہ کے طور پر عمو اور فرحین ساتھ تھے۔ عمو تو خیر حسن کا گہرا دوست تھا۔ فرحین صاحبہ جن کی حسن سے آشنائی ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

”جی عازنہ! ایک دم پرفیکٹ مین ہیں حسن بھائی۔ ہینڈ سم ڈشنگ اور اسمارٹ۔ پھر اپنی اچھی جاب شخصیت میں عجیب سی متانت اور گھراؤ۔“

”بس کرو بیگم! کہیں میں حسن سے جھلس نہ ہونے لگ جاؤں۔“ اتنے میں ہی عمو نے انٹری دی تھی میں اور فرحین ہنس پڑے۔

اب عمو صاحب اپنے دوست کی وکالت کرنے لگے ان سے تو میں کیا کہتی چپ چاپ ہستی رہی لیکن جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے میں نے فرحین کی کلاس لی۔

”تنی وکالت جو آپ موصوف کی کر رہی ہیں ابھی جانتی ہی کتنا ہیں آپ ان کو۔ محض ایک دو بار کی ملاقات ہوئی ہوگی تمہاری اور ان کی۔“

”رے نہیں عازنہ! ہر دو سرے دن تو حسن بھائی ہمارے گھر آئے ہوتے ہیں۔ دراصل بہن کی شادی کے بعد اکیلے ہو گئے ہیں۔ نا بازار کا کھانا پسند نہیں آتا۔ خود اتنے پھوٹے ہیں کہ اندھا ایالنے اور چائے بنانے میں بھی ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں۔ یا تو عمو انہیں فون کر کے رات

حسن پر معاملے میں ریفیکشنسٹ تھے۔ اگر پتلون کی کرپز بھیج نہ بنی ہوتی تو صبح آفس جانے سے پہلے افرا تفری کے عالم میں بھی دوسری پتلون مجھے تنہا دیتے۔

”مے ذرا دھیان سے پریس کرنا جان! تم جانتی ہو کہ میں اپنی ڈریسنگ کے معاملے میں کتنا کانٹنشنس ہوں۔“

وہ بہت پار سے مخاطب کرتے۔ شروع شروع میں مجھے حسن کی کوئی عادت کویت میں بتلا نہیں کرتی تھی۔ وہ ویسے ہی تھے جیسے میں نے چاہا تھا، لیکن شادی کے ایک سال بعد جب مغیو میری گود میں آگیا تو جہاں زندگی کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا، وہاں ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ اب کبھی کبھار حسن کی عادتیں مجھے بے زار کر دیتیں۔ وہ ذرا سے بھی کو آپریشنو شوہر ثابت نہ ہو رہے تھے۔

انہیں احساس ہی نہ تھا کہ مغیو کے بعد میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر میری ساس حیات ہوتیں یا گھر میں میرے علاوہ مغیو کو سنبھالنے والا کوئی اور موجود ہو تا تب شاید اتنا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مغیو میرا پہلا بچہ تھا۔ نا تجربہ کاری کے باعث میرے سنبھال میں ہی نہ آتا تھا اور پھر اس کے حلق میں کوئی قدرتی لاڈلہ اسپیکر فٹ تھا، رونے پر آتا تو نہ دودھ پیتا، نہ کسی اور دھیان میں لگتا، حلق پھاڑ کر روتا رہتا۔ میں اسے تھک تھک کر تھک جاتی، کبھی کندھے سے لگائے کمرے کے چکر کاٹنے لگ جاتی۔ بہت چیخ و پکار کے بعد گھنٹہ، آدھا گھنٹہ کے لیے اس کی آنکھ لگتی تو میرا اپنا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا۔ ذرا دیر کو کمر نکالنے کا خیال آتا کہ گھر کے ادھر ورے کام اپنی جانب متوجہ کر لیتے۔

حسن کو ماسیوں کے ہاتھ کا کام پسند تھا اور نہ ماسیوں پر اعتبار تھا۔ پہلے تو دو بندوں کا کام ہوتا تھا، میں جھٹ پٹ بناتی تھی۔ مجھے خود بھی ماسیوں کے کام کی عادت نہ تھی کہ حسن کی طرح میں خود کافی نفاست پسند طبیعت کی مالک تھی، لیکن اب روز مرا معاملہ تھا۔ چھوٹے بچے کے ساتھ گھر بھر کے کام مجھ سے نہ

بنائے جاتے یا اگر حسن خود تعاون کرنے والے شوہر ہوتے تب بھی شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔ یہ نہ تھا کہ وہ میرا خیال نہ رکھتے تھے۔ فریج میں دودھ، فروٹ، جو سز، طرح طرح کی سوغاتیں بھری بڑی تھیں۔ وہ مجھے اپنی ڈائٹ کا خیال رکھنے کی بار بار تلقین بھی کرتے، مگر مجھے ڈائٹ کے ساتھ ساتھ آرام بھی چاہیے تھا، جو حسن کے معمولات کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔ مغیو مجھے ساری ساری رات جگاتا۔

ایک ہی بیڈ روم میں ہونے کے باوجود حسن کبھی کرڈٹ بدل کر نہ پوچھتے کہ ”یہ کیوں رو رہا ہے“ یا ”لاڈلہ دیر کو مجھے دو، تم کمر سیدھی کر لو۔“ مغیو کی کسی قسم کی چیخ و پکار ان کی گہری نیند پر اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ انہیں بیٹے سے پار نہ تھا۔ بلاشبہ مغیو میں ان کی جان تھی، لیکن ان کا بیٹے سے سارا لاڈ پیار رات دس بجے تک ہوتا تھا، وہ اپنے معمولات میں کسی کھپو دماز کے عادی نہ تھے۔ صبح آفس کے لیے انہیں جلد اٹھنا ہوتا تھا، اس لیے رات کو جلد سو جاتے اور اٹھنا تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا کہ انہیں آفس کی تیاری میں مدد کروانا اور ناشتا بنا کر وینا اب بھی میری ڈیوٹی تھی۔ کوئی کوئی رات تو بالکل رت جگمگے میں لگتی تو صبح حسن کے اٹھانے پر میں بمشکل آنکھیں کھول کر التجا کرتی کہ ناشتا خود ہی بنائیں۔ ڈبل روٹی کے دو توس سینکنا اور آلیٹ بنانا کچھ اتنا بھی مشکل کام نہ تھا۔ اکثر حسن کا ناشتا اسی قسم کا ہوتا، لیکن ایسے میں وہ بڑی بے چاری سی شکل بنالیتے۔

”اچھا سو جاؤ، کوشش کرتا ہوں پر اٹھا بنانے کی۔ دراصل آج میرا جی قیہ والا پراٹھا کھانے کو کر رہا ہے۔ رات کو جو قیہ، بھونا تھا وہ فریج میں ہی رکھا ہے نا۔“

وہ بڑی معصومیت سے دریافت فرماتے اور میں مندی مندی آنکھیں کھول کر جمائوں پر جمائیاں روکتی چل چھٹی کچن میں جا پہنچتی۔

وہ سادہ پراٹھا بنانے سے نا آشنا تھے۔ قیہ والا پراٹھا تو شاید قیامت تک نہ بناتے اور ڈٹ کر ناشتا کرنے

کے بعد میری خفا خفا سی شکل پر نظر ڈالتے تو ہنس کر میری ناک دبا دیتے۔

”بھئی! جس دن تم سی آف نہ کرو، آفس میں میرا دن بہت برا گزرتا ہے۔“

ایک وقت تھا کہ میں ان کی محبت بھری باتوں پر پھولنے نہ سکتی، لیکن اب مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

مسلل بے آرائی اور خوابی کی وجہ سے آخر کار میری طبیعت ناساز ہو گئی۔ ٹھیک ٹھاک بخار چڑھ گیا تھا۔ بخار کے ساتھ سارا جسم بھی بری طرح دکھنے لگا۔ صبح حسن کو بمشکل ناشتا بنا کر دیا۔ مغیو کو سنبھالنا دشوار ترین کام لگ رہا تھا۔ امی، ابا ان دنوں عمرے کی سعادت کے لیے دیار مقدس گئے ہوئے تھے۔ ورنہ میں امی کو اپنے پاس بلا لیتی۔ اب تو ان حالات سے مجھے خود ہی پشیمان تھا۔

رات حسن ڈاکٹر سے دوا دلوا لائے تھے۔ ہلکا پھلکا ناشتا کر کے دوا لی۔ روتے دھوتے مغیو کو کات میں زبردستی لٹا کر کمراسمیٹا۔ آفس جانے سے پہلے حسن پورا بیڈ روم تلیٹ کر جاتے تھے۔ ان کی ساری نفاست پسندی، اپنی ذات تک محدود تھی، ویسے بے تربیتی پھیلانے کے ماہر تھے۔

کمر ا کچھ سمیٹ میں آیا تو روتے بلکتے مغیو کو کات میں سے نکال کر فیڈ کروایا۔ وہ بے چارہ اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ دودھ پیتے پیتے سو گیا۔ میں بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ دوا میں شاید غنودگی تھی، جو میں دو گھنٹے تک بے سدھ سوتی رہی۔

مغیو کے رونے کی آواز پر آنکھ کھلی۔ اللہ جانے وہ کب سے اٹھا ہوا تھا۔ اس کی نبھی بدل کر پھر فیڈ کر دیا۔ اب وہ کھیلنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر اسے بلی کات میں ڈالا اور کچن میں چلی آئی۔

بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ امی کی بات یاد آئی کہ دودھ پلانے والی ماؤں کو زیادہ بھوک لگتی ہے، صبح ناشتا برائے نام کیا تھا۔ کھانا بنانے کی اب بھی ہمت نہ تھی۔ ایک بڑا ماسیب دھو کر کھایا۔ ساتھ ایک گلاس دودھ کا

پی لیا۔ توانائی کچھ بحال ہوئی تھی۔

شام کو حسن جلدی آگئے، شاید میری طبیعت خرابی کا خیال کر کے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ ”کیا ہوا یا ر! گھر میں اتنی ابتری، کیا طبیعت ابھی تک صحیح نہیں ہوئی۔“ انہوں نے پہلے گھر کی بے تربیتی نوٹ کی، پھر میری طبیعت پوچھی۔

”بخار تو اتر گیا، کمزوری باقی ہے۔“ میں نے تھکے انداز میں جواب دیا۔

”اپنی ڈائٹ کا خیال نہیں کرو گی تو یہ ہی حشر ہو گا۔ فریج بھرا ہوا ہے فردوس سے، کھایا کرو نا۔“ انہوں نے ہمیشہ والی نصیحت دہرائی۔ میں چپ رہی۔

”اچھا یہ بتاؤ، پکایا کیا ہے، صبح تم نے میرا لچ باکس بھی تیار کر کے نہیں دیا تھا۔ سچ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں، جو بھی ہے فائنٹ لاؤ۔“

انہوں نے آفس سے جلد آنے کی وجہ بتا کر خوش فہمی کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ جی میں تو آیا کہہ دوں ”فریج بھرا ہوا ہے پھلوں سے۔ کچھ بھی نکال کر کھالیں“ لیکن کہا تو صرف یہ کہ ”حسن! ہمت نہیں تھی کچن میں گھسنے کی۔ اب بھی چکر آرہے ہیں۔“

”اچھا تو کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔“ حسن نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔

”طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس چلیں؟“ انہوں نے ذرا سی فکر مندی دکھائی۔

”نہیں! دوا تو ابھی باقی ہے، کھالوں گی۔ کمزوری تو جاتے جاتے ہی جائے گی۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”مچلو جیسے تمہاری مرضی، میں تو سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر سے واپسی پر عماد وغیرہ کی طرف نکل جاؤ گے۔ تمہارے اندر تو پکانے کی ہمت نہیں ہے، آج انہیں ہی میزبانی کا شرف عنایت کر دیں۔“

انہوں نے کیا بہترین حل تجویز کیا تھا، میں بھنا ہی تو گئی۔ فرحین خود دوا پر تلے کے بچوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہوئی رہتی تھی۔ ایسے میں ہم بن بلائے مہمان بن کر نازل ہو جاتے۔ میں نے چڑ کر یہی حقیقت حسن کو بتلائی تھی۔

”فرحین کیا میکے گئی ہوئی تھی؟“ میں نے اچھے سے پوچھا۔

میں جانتی تھی کہ فرحین کی موجودگی میں تو عمو کو کچن میں گھس کر اپنے جوہر آزمانے کا موقع ملتا تو عمو ہی ملتا ہے۔ فرحین کے بقول ایک بار عمو کچن میں گھس جاتا تو کچن کی ساری چیزیں تلیپٹ کرنے کے ساتھ راشن کے بے دریغ استعمال سے بچت بھی تلیپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں اسی لیے ان کے کچن کے داخلے پر سخت پابندی ہے۔ آج حسن کی بات سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ فرحین خالہ کے ہاں گئی ہوگی، جب ہی عمو نے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا۔

”ارے نہیں یار! تمہاری کزن بھی تمہاری طرح بستر سنبھالے پڑی ہے۔ اس کی بھی دو تین دن سے طبیعت خراب ہے، بلکہ عمو نے تو آج آفس سے چھٹی بھی اسی لیے کی، بچے بھی ماں سے زیادہ باپ کو پہچانتے ہیں، فرحین تو مزے سے منہ پر چادر تانے پڑی رہی، عمو بچوں کو بھی سنبھل رہا تھا اور کچن بھی۔“ حسن نے مجھے تفصیلی رپورٹ دی۔

”کتنے مزے سے یہ سب مجھے بتا رہے ہیں، اپنے دوست سے کچھ سبق سیکھ لیں کہ بیوی، بچوں کا خیال کیسے رکھا جاتا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔

”تو کیا میں تم لوگوں کا خیال نہیں رکھتا؟“ حسن نے مصنوعی حقلمندی سے مجھے گھور دیا۔

”کم از کم ایسے تو نہیں رکھتے جیسے عمو بھائی رکھتے ہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے انہیں بتایا۔ وہ ہنس پڑے۔

”تم تو جانتی ہو یار! میں مردوں کی اس ٹاپ سے تعلق ہی نہیں رکھتا اور تم خود بتاؤ، مرد عورتوں والے کام کرتے اچھے لگتے ہیں کیا؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”نہیں ہرگز نہیں، لیکن کبھی گھبراہٹ میں تو کر سکتے ہیں نالور فرحین کب عمو بھائی سے کام کرواتی ہے، لیکن عمو بھائی خود اس کے خیال سے اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔“

”چھ! تم مجھے بھی گھر کے کام سکھاؤ، میں بھی کر لیا کروں گا، اب خوش۔“ انہوں نے پیار سے میری

”ارے یار! دوست سے میرا“ کٹھن یا غیرت کیسی جو دال دیہ پکایا ہو گا کھائیں گے۔“

سادگی اور معصومیت کی انتہا تھی۔ گویا کھا کر بھی ان پر احسان کریں گے۔ مجھے تاؤ تو خوب آیا مگر حسن سے بحث فضول تھی، ان پر میری کسی بات کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔

”آپ نے جانا ہے تو جائیں، میں گھر پر ہی آرام کروں گی۔“ میں نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔

”دکے“ پھر دو دانہ بند کر لو اور ہاں اپنے لیے بھی کچن میں گھسنے کی ضرورت نہیں۔ فرحین سے کہہ دوں گا، تمہارے لیے بھی کچھ پیک کر کے بھیج دے گی۔“ انہوں نے کہا۔

میں غصے اور کوفت کے مارے کچھ بول ہی نہ پائی اور وہ سوئے ہوئے مغیو کو پیار کر کے چلتے بنے۔ گھومتے سر کو ہاتھوں میں تھام کر تین کتنی دیر بیٹھی رہی، لیکن بیٹھے رہنے سے کب کام چلتا تھا۔

حسن آج استری شدہ آخری سوٹ پہن کر آفس گئے تھے۔ استری کرنے والے کپڑوں کا ڈھیر اکٹھا ہو رہا تھا۔ میں کم از کم حسن کے تین چار سوٹ پر پریس کر کے رکھنا چاہ رہی تھی، ابھی لائٹ بھی تھی اور مغیو بھی سو رہا تھا۔ ایسا اتفاق قسمت سے ہوتا تھا، سو میں اس اتفاق کو خوش فہمی سے گردانتے ہوئے گھومتے سر کو فراموش کر کے کپڑے پریس کرنے میں جت لگائی۔ رات نو بجے حسن کی واپسی ہوئی تھی۔ بٹاش موڈ اور فریش چہرہ۔

”یہ لیں جناب! آپ کا کھانا۔“ انہوں نے ایک بیچ باکس مجھے تھمایا۔

”میں نے مجھڑی بنا کر کھالی ہے۔“ میں نے مرد انداز میں کہتے ہوئے بیچ باکس ان کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

”ارے اچھو تو سہی، عمو نے کیا مزے دار کڑھی چاول بنائے ہیں، جب میں گیا تو کڑھی کے لیے پکوڑے مل رہا تھا۔ پہلے چائے کے ساتھ پکوڑے کھائے، پھر مزے دار کھانے کا دور چلا۔ سچ مزا آگیا، بہت ذائقہ ہے عمو کے ہاتھ میں۔“



شن ٹوسہ۔ شن ٹوسہ۔ شن ٹوسہ۔ متواتر جتنی ہوئی تیل نے اسماء کے ہاتھ پاؤں پھلادے۔ اس نے روتی ہوئی بلی کو گود میں اٹھایا۔ چھوٹو کے ہاتھ میں بسکٹ تھمایا اور تقریباً ”بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا تو باہر توقع کے عین مطابق عاصم غصے میں بھرا کھڑا تھا۔ اندر آکر اس نے پاؤں مار کر پوری قوت کے ساتھ دروازہ بند کیا اور چلایا۔

”کہاں تھیں آخر کیا بھری ہو گئی تھیں۔ اتنی دیر سے کھنٹی بجا رہا ہوں، کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ پتا بھی ہے کتنا تھکا ہوا آتا ہوں لیکن یہاں کس کو پروا ہے۔“ ”ہاں ہاں“ تھکے ہوئے آتے ہو۔ پتا ہے سب پتا ہے۔ میں کون سا پاؤں پیارے بستر پر پڑی تھی میں بھی کام ہی کر رہی تھی۔“ اسماء نے بھی ترخ کر جواب دیا تو عاصم کو مزید غصہ آگیا۔

”ہاں مجھے بھی پتا ہے کیا کام کر رہی تھیں، ٹیلی فون پر پیس ماری جا رہی ہوں گی اور کیا کام ہو رہا ہو گا۔“ ”ہاں“ تین مہینے کی بلی، دو سال کے چھوٹو اور ساڑھے تین سال کے بیو کو ایک دن سنبھال کے دکھائیں ذرا پھر پوچھوں گی کہ فون پر بی بی پیس مارنے کا وقت کہاں سے ملتا ہے۔“ اسماء نے تمللاتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا“ اب میرے گھر پہنچتے ہی لڑنا مت شروع کر دینا، سارا دن دفتر میں سرکھپا کے آؤ تو گھر میں بھی دو گھڑی سکون نہیں ملتا۔ جاؤ ذرا ایک کپ چائے بنا دو۔“

تقریب کا جو ٹائم دیا تھا۔ اس سے آدھا گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں ہم، کچھ وقت سفر میں بھی لگے گا، تم فائنل تیار ہو جاؤ۔“ عماد نے اسے احساس دلایا۔ ”ہاں واقعی دیر ہو رہی ہے۔“ گھڑی پر نظر ڈال کر فرحین کو بھی احساس ہوا تو جھٹ وائش روم میں کھس گئی۔ عماد نے پہلے فرحین کا دوپٹہ پر لیس کیا۔ پھر اپنی دو سالہ بیٹی کی پونیاں بنا کر اسے تیار کیا اور جتنی دیر میں فرحین تیار ہوئی، عماد دونوں بچوں کے فیڈر تیار کر لایا تھا۔

عماد اور فرحین کی زندگی میں جو انڈر اسٹینڈنگ اور تعاون والی فضا نظر آتی تھی، اس کا کریڈٹ یقیناً ”عماد کو جاتا ہے۔ گھریار کی ذمہ داری سنبھالنا یقیناً ”عورت کا ہی کام ہے، لیکن اگر اسے خیال رکھنے والا ہمدرد ساتھی نصیب ہو جائے، آڑے وقت میں اس کا ہاتھ بٹانا اپنی مردانہ انا کے خلاف نہ سمجھے تو زندگی سہل طریقے سے گزرنے لگتی ہے۔ ہاں! اگر عورت اس تعاون کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو وہ بھی غلط ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر سبک خراہی سے سفر کرنے کے لیے دو انتہاؤں کے درمیان راستے کو اپنانا ہی دانش مندی ہے۔ یہ حقیقت مجھے اب جا کر سمجھ آئی تھی۔

اور ایسا نہیں کہ حسن سے شادی کا فیصلہ مجھے اب اپنی حماقت لگتا تھا یا مجھے اس فیصلے پر کسی قسم کا پچھتاوا ہے۔ حسن مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیارے ہیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ مجھے ان کے علاوہ کسی اور کا ساتھ نصیب ہوتا۔ ہاں! حسن کی تعاون نہ کرنے والی طبیعت کی وجہ سے کبھی کبھار زندگی میں کچھ کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے، شاید ایک دم سر پر پڑنے والی ذمہ داریوں کی بوکھلاہٹ اس کا سبب ہے یا واقعی گھریلو معاملات سے حسن کی لاتعلقی اب مجھے کھلنے لگی ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ میں اپنی محبت کے بل پر حسن کا مزاج بدلنے کی کوشش کروں گی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ خود ہی ایڈجسٹ کرنا سیکھ جاؤں۔ میں ہر دو صورتوں میں امید ہی کر سکتی ہوں، کیونکہ امید پہ دنیا قائم ہے۔

ٹھوڑی چھوٹی۔ ”بس رہیں۔“ میرے چہرے پر پھینکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ذہن میں عماد اور فرحین کا گھر گھوم رہا تھا۔ ابھی بس دن پہلے کی بات تھی ہم چھوٹے ماموں کے پوتے کی رسم عقیقہ میں شرکت کے لیے گھر سے نکل رہے تھے کہ عماد کا فون آگیا۔ ”ہمیں بھی لیتے چلنا یا ر! گاڑی کچھ مسئلہ کر رہی ہے۔“ حسن نے فون سن کر گاڑی ان کے گھر کی طرف موڑ دی، وہاں پہنچ کر ذرا سی کوفت ہوئی، فرحین ابھی تک تیار نہ ہوئی تھی۔

”مسوری بھی! دراصل لائٹ ابھی آئی ہے، موٹر میں پانی بھی ختم تھا، پہلے بچوں کو نہ لایا، پھر عماد نہ مانے گئے، بس میں بھی دو منٹ میں شاور لے کر آتی ہوں۔“ وہ استری اسٹینڈ پر دوپٹہ پھیلائے اپنا دوپٹہ پریس کرنے میں مصروف تھی، اتنے میں عماد تو لیے سے بال رگڑتے ہوئے چلا آیا۔

”او بندی خدا کی، کبھی موقع محل کی نزاکت بھی سمجھ لیا کرو۔ عازنہ بھابھی! آپ ہی سمجھائیں اپنی دوست کو، ایسے رگڑ رگڑ کر کپڑے پریس کرتی ہے کہ آدھا گھنٹہ ایک شرٹ پر لگا دیتی ہے، جانے کون سی تاریدہ شکنیں نظر آرہی ہوتی ہیں اسے۔“

”بس کریں عماد! دیکھیں تو سہی، آج سب کے کپڑے کتنی جلدی پریس کیے ہیں میں نے۔“ فرحین روہا سی ہوئی۔

”اچھا تو اب جاؤ، سب کے کپڑے پریس کر دیے یا“ یہ آخری دوپٹہ روتا ہے، یہ میں پریس کر دیتا ہوں۔ تم نہالو جلدی سے۔“ عماد نے اسے آئرن اسٹینڈ کے سامنے سے ہٹایا۔

”رہنے دیں عماد! بس دو منٹ میں کر لوں گی۔“ فرحین کو شاید ہمارے سامنے میاں سے کام کروانے میں خفت محسوس ہوئی۔

”جو جاؤ بابا! بھابھی اور حسن کوئی غیر ہیں کیا۔ پتا ہے انہیں کہ میری زوجہ مجھے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی، لیکن آج تو مجبوری ہے۔ ماموں نے

میں نہانے جا رہا ہوں۔“ عاصم نے انگلی سے نولہ کھینچا اور بکنا جھکا غسل خانے میں گھس گیا۔

بلی بن اسٹاپ روئے چلی جا رہی تھی اور چھوٹا اور نیو بسکٹ ایک دوسرے سے چپکنے کے چکر میں گھومتا تھا۔ اسماء نے دو دو ہاتھ دونوں کی کمرے لگا کے بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا اور روتی ہوئی بلی کو گود میں لے کر ایک ہاتھ سے اس کی فیڈر تیار کر کے اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ بچی بھوکی تھی۔ دودھ ملا تو نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کی نیند سے بو جھل پلکیں دیکھ کر اسماء نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے بلی کی نیند پکلی ہونے کا انتظار کر لیا جائے مگر ابھی لٹا کر چلی گئی تو دوبارہ دھاڑنا شروع کر دے گی۔ اتنے میں میاں صاحب تو لیے سے سر پونچتے ہوئے غسل خانے سے نمودار بھی ہو گئے اور بولے۔

”جائے کہاں ہے؟“

”نہیں۔“ اسماء نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دھیرے سے بولی۔ ”بلی ابھی ابھی سوئی ہے شور کریں گے تو اٹھ جائے گی پھر کوئی کام نہیں کرنے دے گی۔“

”ارے یعنی کہ تم نے ابھی تک چائے بھی نہیں پینا؟ جب سے اس کو ہی گود میں لیے بیٹھی ہو؟“ عاصم بگڑ گیا۔ ”کہا بھی تھا کہ میرے سر میں درد ہے لیکن تمہیں کوئی پرواہی نہیں ہے۔ یہ اوقات ہے میاں کی کہ دن بھر کا تھکا ہوا آتا ہوں تو ایک کپ چائے بھی نصیب نہیں ہوتی۔“

”یہ پھر تھکا ہوا تھا“ کی گردان شروع کر دی۔ ”سب پتہ ہے مجھے کہ ان گورنمنٹ کے دفاتروں میں کتنا کام ہوتا ہے، بس حاضری لگانے ہی دفتر جاتے ہیں۔ ٹانگیں پیار کے اخبار پڑھتے ہیں، دو چار فون کھڑکاتے ہیں، دوستوں سے کپ شرب لگانے اور چار چھ کپ چائے کے چڑھانے کے بعد گھر واپس آ جاتے ہیں۔ یہ کام کام کا رعب کسی اور پر ڈالنا۔ اللہ نے مرو کیا بنا دیا، عورت کو بالکل ہی گھر کی باندی سمجھ لیا ہے اور میں

جو صبح سے گھن چکر بی رہی ہوں اس کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔“

اسماء نے بھی بلی کی نیند کو بھلا کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

”ہاں گھن چکر، خوب!“ عاصم طنزیہ لہجے میں بولا۔

”آفس سے آنے کے بعد ابھی تک ایک کپ چائے تو نصیب ہوئی نہیں مجھے۔ سب پتہ ہے گھن چکر بی رہی ہوگی۔ لی دی پر ایک کے بعد ایک فضول قسم کے ڈرامے دیکھے ہوں گے، دروازے پر کھڑے ہو کے پڑوسنوں سے حالات حاضرہ سیاست، قلم اور سسرال والوں کے موضوع پر بات چیت کی ہوگی۔ بیوی پارلر کا چکر لگایا ہو گا اور نیلی فون یہ کہیں ماری ہوں گی۔ اب ظاہر ہے اتنے سارے کام کیے ہیں تو گھن چکر تو بی رہی ہوگی۔“

اتنی لمبی طنزیہ گفتگو کا انجام ایسا ہی ہونا تھا اور ہوا بھی یہی، یعنی اسماء کی آنکھیں آنسوؤں سے لالہ بھر گئیں۔

”درا سی چائے بنانے میں دیر ہو گئی تو اتنی باتیں سنا دیں۔ یہ نہیں دیکھ رہے کہ گھر صاف ستھرا ہے، نئے صاف ستھرے ہیں، بچن میں کھانا تیار ہے، برتن دھلے ہوئے ٹھکانے پر رکھے ہیں اور آفس سے آنے کے بعد نہانے گھرے تو گھر میں نہانے کے کپڑے تک استری ہوئے پہلے سے کھوٹی۔ لٹکے ہوئے تھے پھر بھی طعنے دینے سے باز نہیں آئے۔ یا اللہ! اب تو ہی کچھ نوٹس لے ورنہ تو یہ روز روز کی لڑائیاں کبھی ختم نہ ہوں گی۔“

بات کرتے کرتے اسماء نے اچانک آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ میاں کو مخاطب کیا تو باوجود غصے کے عاصم کو ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت ذرا سی مسکراہٹ نے بارود کو چنگاری دکھانے والا کام کیا۔ اسماء اور بھی بھڑک گئی۔

”ہنسو ہنسو جی بھر کے ہنسو، تمہاری یہی بات مجھے سب سے زیادہ زہر لگتی ہے کہ میں سنجیدہ ہوتی ہوں تو تم مذاق کرنے لگتے ہو۔ میرا مذاق میں بات کروں تو تم

طنزیہ ہو جاتے ہو اور اگر غلطی سے بھی میں طنزیہ ہو جاؤں تو اس کے لیے تو تم نے فارمولا تیار رکھا ہی ہوا ہے۔“

”کون سا فارمولا؟“ عاصم نے چڑکے پوچھا تو بولی۔

”وہی حلق تر خرے اور پیمپٹروں کے آزادانہ استعمال والا فارمولا، یعنی اتنی زور سے چیختے ہو کہ میں سم کر خود ہی چپ ہو جاتی ہوں۔“

عاصم نے اس کی بات سنی آن سنی کی اور برا سامنا بنا کے بستر لیٹ کے لی وی آن کر لیا۔ لی وی کی آواز اتنی تیز تھی کہ بلی نے کس کس کے پھر رونا شروع کر دیا اور اسماء جو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے چائے بنانے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی دوبارہ اسے گود میں لے کے نہلانے لگی اور عاصم کا منہ پھر سے سوچ کے کیا ہو گیا۔ خدا خدا کر کے بلی سوئی تو اسماء چائے بنا کر عاصم کے پاس لے آئی لیکن اب عاصم صاحب بگڑ چکے تھے۔

”لے جاؤ چائے، یہ کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔ اب میں کوئی چائے وائے نہیں پیوں گا، کھانا کھاؤں گا۔ کھانا لالہ کے دو ماگ میں کھاؤں اور سوؤں۔ صبح پھر چھ بجے اٹھنا ہے اور سارا دن خوار ہونا ہے۔“

اسماء نے خاموشی سے چائے کا کپ دوبارہ باورچی خانے میں رکھا اور کھانا گرم کرنا شروع کر دیا، اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نے بجنا شروع کر دیا۔ اسماء انتظار کرتی رہی کہ شاید عاصم اٹھ کر فون سن لے لیکن نہیں بھئی، وہ تو تھکے ہوئے آئے تھے فون کیسے اٹھا لیتے اور بچے ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ ان کا ہاتھ ٹیلی فون کے اسٹینڈ تک جاتا ہی نہیں تھا۔ ناچار اسماء کو ہی کام ادا ہوا اور اچھوڑ کر فون اٹھانا پڑا۔ حیدر آباد سے اس کی بڑی مند کا فون تھا جیسے ہی فون اٹھا کر اسماء نے کہا۔

”مہیلو آپا! السلام علیکم۔“ ویسے ہی عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ اسے بات نہیں کرنی۔

مجبوراً اسماء کو جھوٹ بولنا پڑا۔

”وہ عاصم تو ذرا باہر گئے ہوئے ہیں، آئیں گے تو آپ کو خود ہی فون کر لیں گے۔“ اس کے بعد ”آپ

کہیں ہیں؟ بچے خیریت سے ہیں؟ دو لہا بھائی کا کیا حال ہے؟“ انہیں سلام کہیے گا“ جیسے جملے بول کر اور اپنی اور بچوں کی خیریت بتا کر اسماء نے فون بند کر دیا۔ بمشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے لیکن عاصم کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

”آس پڑوس کی رشتے داروں کی جاننے والوں کی“ ان کے سسرال والوں کی اور کوئی رہ گیا ہو تو اس کی بھی خیریت پوچھ لیتیں۔ پہلے چائے نہیں ملی اور اب کھانا مانگا تو پھر فون پر باتیں شروع ہو گئیں۔

”اللہ سے ڈرو عاصم! ایک تو تمہاری بہن نے تم سے بات کرنے کو فون کیا پہلے تو مجھ سے جھوٹ بولوایا کہ گھر پر نہیں ہو، اب اگر میں بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تو بے چاری کا دل کتنا برا ہوا اور وہ تو مجھے ہی برا کہتیں کہ نند سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ اگر میں نے دو چار جملے خیر خیریت کے پوچھ لیے تو اس پہ بھی اتنا شور مچا رہے ہو۔“ اسماء بھی بگڑ کر بولی۔

”ہاں ہاں، کرلوں گا میں انہیں خود ہی فون۔ ابھی میرا موڈ نہیں تھا ان کی ادھر ادھر کی باتیں سننے کا، جب وقت اور موڈ ہو گا تو خود ہی کر لوں گا۔“

”ہو نہ!“ اسماء نے ہنکارا بھرا اور جا کر کھانا لے آئی۔ میز پر کھانا لگایا اور دونوں بچوں کو پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا۔ عاصم نے بھی اپنی پلیٹ میں سالن نکالا اور پہلا نوالہ لیتے ہی چیخا۔

”اف۔ میرے خدا۔ اتنی مرچیں۔ ارے رات کے وقت سالن میں اتنی مرچیں جھونک دیں۔ تم تو مجھے معدے کا مریض بنا کر ہی چھوٹو گی۔“ اسماء حیران رہ گئی۔

”مرچیں۔ عاصم کہاں ہیں مرچیں۔ ذرا ان بچوں کو دیکھیں کیسے خاموشی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ اگر مرچیں تیز ہوئیں تو یہ معصوم کھا سکتے تھے بھلا۔“

عاصم نے بچوں کو دیکھا جو واقعی ذوق و شوق کے ساتھ نوالے پہ نوالہ کھا رہے تھے لیکن وہ عاصم ہی کیا جو مان جائے بولا۔

”ہاں بے چارے جب سے روٹی سالن کھانے کے

میں جب تک اسے چپ کرواتا ہوں، تب تک تم جلدی سے باہر آ جاؤ۔“

”نہیں۔۔۔ یہ کیا، اسماء کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا گلابی جوڑا انفاست سے استری شدہ اینگر میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ہلکے گلابی سینڈل بھی سلیقے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو اینڈرپرائٹ اور گرم چائے میز پر بھی تھی۔ اسماء کے منہ سے خوشی سے چیخیں نکلنے ہی والی تھیں کہ فوراً اپنے اوپر قابو پایا۔ سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اسی لیے چلا کر بولی۔

”ارے یہ گلابی سوٹ کیوں استری کر دیا، آج تو مجھے نیلا سوٹ پہننا ہے فوراً“ استری کر کے دو۔“

عاصم نے بوکھلا کر روتی بلکتی بلی کے منہ میں فیڈر ٹھونس اور جلدی سے الماری کی طرف بھاگا کہ نیلا جوڑا نکال کر استری کر دے، ابھی وہ الماری تک پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ چھوٹو روتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور دودھ دودھ چلاتا شروع کر دیا۔ عاصم نے فیڈنگ مگ میں دودھ بھر کے اسے دیا اور پھر مٹی سے الماری سے نیلا سوٹ نکال کر استری اسٹینڈ کی طرف بھاگا لیکن اتنے میں اسماء نے ایک بار پھر اپنے پیچھے پوروں کا پورا زور لگا کر حلق اور نر خرے کا پورا پورا استعمال کرتے ہوئے آواز لگائی۔

”اوہو! یہ ہاف فرائی اینڈ اکیوں بنا دیا۔ آج میں ہاف فرائی نہیں کھاؤں گی، آلیٹ بنا کے دو۔ جلدی کرو“ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“

بے چارہ عاصم استری کو چھوڑ کر پلٹ کے دوبارہ باورچی خانے کی طرف دوڑا اور جلدی جلدی آلیٹ بنا کے اسماء کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسماء نے پوری آواز سے ٹی وی کھولا اور گنگنائے ہوئے ناشتہ شروع کر دیا۔ عاصم اچھی بیویوں کی طرح اسماء کا نیلا جوڑا پھرتی سے استری کرنے لگا۔ اسماء کو تھوڑی سی شرمندگی تو ہوئی لیکن اسے بھی آج سارے حساب

قابل ہوئے ہیں، ایسا ہی تیز مریج مسالوں والا کھانا کھا رہے ہیں، آخر عادت کیوں نہ ہوگی۔“

”پھر تو اب تک آپ کو بھی عادت ہو جانی چاہیے، آخر شادی کو پانچ سال ہونے والے ہیں۔“ اسماء اطمینان سے بولی تو عاصم بھٹا گیا۔

”میں نے بچپن سے اپنی ماں کے ہاتھ کا پکا نہایت ذائقہ دار کھانا کھایا ہے، میری عادت اس مسالے والے ملغوبے کی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔“ عاصم بولتا جا رہا تھا اور بڑے بڑے نوالے کھاتا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری روٹی بھی ختم کر لی تو اسماء دل ہی دل میں جل گئی۔

”دوسرے مزے سے پیٹ بھر کے کھا رہے ہیں اور صرف مجھے جلانے کو کھانے کی برائیاں کر رہے ہیں۔“ عاصم کھانا کھا کر آرام سے بیڈروم میں جا کے لیٹ گیا اور لائٹ بند کر لی۔ اسماء نے کھانے کے برتن دھوئے، بچوں کو سلایا اور پھر خود بھی مٹھکن سے چور وجود کو لیے کر بستر پر آ کے لیٹ گئی۔ عاصم کے دھیمے دھیمے خراٹے فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھا جبکہ اسماء کے لیٹتے ہی بلی اٹھ چکی تھی اور اسماء اسے دھیرے دھیرے ہلا کر ایسے سلار ہی تھی کہ عاصم کی نیند خراب نہ ہو جائے۔

بلی کے سونے کے بعد اسماء نے لیٹ کر ایک مرتبہ پھر عاصم کی گہری نیند کو حسرت سے دیکھا اور سوچا۔ اے کاش۔۔۔ میں بھی ایک میاں ہوتی۔ شوہر ہونے کے کتنے فوائد ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی بوادیوں میں کھو گئی۔ صبح اٹھی تو دنیا بدل چکی تھی۔ ارمان اور حسرتیں اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہیں، اسماء نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ عاصم دھیرے دھیرے آوازیں دے کر اسماء کو اٹھا رہا تھا۔

”اسماء! اسماء! اٹھ جاؤ۔۔۔ بھی جلدی کرو نا“ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بس اب اٹھ بھی جاؤ، میں نے کپڑے استری کر دیے ہیں، جلدی سے تیار ہو جاؤ، آفس کو دیر ہو رہی ہے اور۔۔۔ دیکھو بلی رو رہی ہے۔“

”اے اتنا نمک ڈال دیا، تمہیں تو آج تک ایک انڈا بنانا بھی نہیں آیا۔ جلدی سے کپڑے استری کرو اور ٹیپو کو تیار کر دو، اسے اسکول کی دیر ہو رہی ہے۔“

عامم نے گھبرا کے زیادہ تیزی سے استری کرنا شروع کر دی، جیسے تیسے استری ختم کر کے ٹیپو کو اٹھایا، بہلا بہلا کے اسے ہانپتہ کر دیا، ابھی اسکول کے لیے تیار کرنا شروع کیا ہی تھا کہ چھوٹو کو ہاتھ روم جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اوھرنی وی کی تیز آواز سے بلی بھی اٹھ کر چیاؤں پہاؤں کرنے لگی۔

یہ سب سوچنے کے بعد اسماء نے آفس کے لیے تیاری شروع کر دی اور تیاری کے دوران پورے گھر کو ہلپٹ کر کے رکھ دیا۔ تو کیہ بستر پر پھینکا تو سیلینگ سوٹ زمین پر ڈریسنگ ٹیبل کی ایک ایک چیز بھیری، سینڈل پہنتے وقت چپلیں اچھل اچھل کے اتاریں اور

”اسماء! دعہ! دعہ! میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم اجازت دو تو آج میں ٹیپو کے اسکول سے آنے کے بعد اپنے آپا کے گھر چلا جاؤں۔ تمہارے آفس سے آنے کے وقت سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ دراصل آپا بڑے دن سے یاو کر رہے تھے نا“ اس لیے میں نے سوچا کہ آج مل کے آجاؤں۔“

”آپا! اسماء کی تو دل کی کلی کھل گئی۔ ڈانٹ پلانے کا اس سے بہترین موقع پھر کہاں مل سکتا تھا۔ سو فٹ کر بولی۔

”کیوں، میرے ابا کے آنے کا سن کر تمہارے چہرے پہ بارہ کیوں بجتے لگے۔ سب سمجھ رہی ہوں میں، تمہارے آرام میں خلل جو پڑے گا، اسی لیے تم کیوں چاہو گے کہ میرے ابا یہاں آکے رہیں۔ میں کہتی ہوں کہ آخر یہ سرور دہلاؤ کی رسہ کشی تکبطلے گی۔ مگر میں، سکون سے رہو، ابا کے لیے دو چار اچھی اچھی

اسماء نے عاصم کے ہوائیاں اڑتے چرے کو غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر دوبارہ بولی۔

اسماء کی بات کے اختتام پر عاصم کی موٹی موٹی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے لہلہا بھر چکی تھیں لیکن پھر بھی جب اسماء گھر سے نکلنے لگی تو اسے اپکار بیٹھا۔

”وہ گمراہ کا سودا سلف ختم ہو گیا ہے۔ میں نے لکھنا کر رکھی تھی، واپسی میں یہ لیتی آتا اور آج ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا کیونکہ چھوٹوں کی طبیعت کافی دن سے خراب ہے“ آج اسے ڈاکٹر کو بھی دکھانا ہے۔“

عاصم نے ڈرتے ڈرتے کہا تو اسماء غصے سے چیخ اٹھی۔ ”بس یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔ توبہ گھبراتے قدم نکالنا مشکل کر دیا۔ کام ہیں کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہو رہے۔“

”چھا اچھا اب کچھ نہیں بولوں گا“ خدا حافظ۔“

باہر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں دواں تھی۔ مرد
 اپنے وفاتر جا رہے تھے اور خواتین دواؤں پہ کھڑی
 انہیں الدواع کہہ رہی تھیں۔ اسماء نے گردو پیش پر
 ایک بھرپور نظر ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے دفتر کی
 طرف روانہ ہو گئی۔ مزے کی بات یہ کہ اسماء کے قدم
 اور ذہن آئوٹنگ مشین کی طرح خود بخود کام کر رہے
 تھے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ روز اسی طرح
 بس میں بیٹھ کر دفتر جاتی ہو۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی
 پتہ تھا دفتر میں اسے کون کون سے امور سرانجام دینے
 ہیں۔ ٹھیک کہا ہے سیانوں نے کہ خدا چاہے تو کیا نہیں
 ہو سکتا۔

اسماء بھی دو دو بیس بدل کر دفتر پہنچی تو نیبل پر
فائلوں کا انبار اس کا منظر تھا۔ کام نمٹاتے نمٹاتے کب
پہنچ ٹائم گزرا اسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس پر تھوڑی
تھوڑی دیر کے بعد کھڑوس باس کی طرف سے طلبی اور
کام صحیح طور پر نہ کرنے کی وجہ سے کھنچائی الگ ہوتی
 رہی۔ آفس ٹائم کے بعد بھی ایک گھنٹہ رک کے کام
ختم کیا تب جا کر گھر جانے کی اجازت ملی۔ دو درمیان میں
بڑی مشکل سے صرف ایک کپ بد مزہ چائے اور چار
بسکٹ حلق سے اترے تھے، شام کو دو گھے ہوئے بدن
اور سائیں سائیں کرتے دلغ کے ساتھ دوبارہ گھر کی
راہ لی۔ سوں کے رش اور جگہ جگہ ٹریفک جام نے مزید
حشر لگا دیا۔ بس سے اتر کر عاصم کی دی ہوئی لسٹ کے
مطابق گھر کا سودا سلف خریدا، قریبی مارکیٹ سے بھی

پندرہ منٹ کی مسافت پر گھر تھا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ خیال آیا، گھر میں ہاتھ روم کا تل بھی خراب ہے۔ دوبارہ مارکیٹ کی طرف گئی تاکہ پلمبر کو ساتھ لے جاسکے۔ پلمبر نے پہلے تو تل ٹھیک کرنے کے لیے بہت زیادہ بتائے۔ بڑی مشکل سے پیسوں کا مسئلہ حل ہوا تو غرے دکھاتا ہوا بولا۔

”آج تو ٹائم نہیں ہے، ایڈریس چھوڑ جائیں، کل اگر تل ٹھیک کر دوں گا۔“

اب اسماء کی بالکل ہمت نہیں تھی کہ کسی اور پلمبر کو ڈھونڈ کر نئے سرے سے بات کرتی۔ مجبوراً اسے ہی اپنا ایڈریس کانڈر لکھ کر دیا اور سامان کے بڑے بڑے تھیلے اٹھائے گھر کو روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچ کر ایک دفعہ بیل بجانے کے بعد کچھ سیکنڈ انتظار کرنا دو بھر ہو گیا، اس لیے بٹن پر انگلی رکھ کے ہٹانا بھول گئی۔ یہی خیال آیا کہ موصوف آرام سے گھر میں بیٹھے سوچ رہے ہوں گے کہ دروازہ کھولنے کی ایسی جلدی بھی کیا ہے، عیش کر کے آرہی ہے۔ یہاں حالت یہ ہے کہ ہڈی ہڈی دکھ رہی ہے۔ ابھی چھوٹو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔

دروازہ کھلا تو عاصم تلکچے کپڑوں، بکھرے ہوئے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ بو کھلایا ہوا کھڑا تھا۔ بلی اس کی گود میں چپٹیں مار مار کے رو رہی تھی۔ چھوٹو بخار میں پھنک رہا تھا اور شیو سارے کھلوے کمرے میں بکھیرے بیڈ پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔

اسماء نے خلاف معمول خاموشی سے یہ سب دیکھا اور لاؤنج کے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ عاصم نے سووے کے تھیلے اس کے ہاتھ سے لیے اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ اسماء کی نظر سامنے پڑی تو دیکھا اس کے خوش خوراک ابا جان تشریف لائے تھے اور اس وقت ٹانگ پہ ٹانگ رکھے مرغی کے چوزے کی یخنی لوش جاں فرما رہے تھے۔ اسماء نے اٹھ کر انہیں سلام کیا، خیریت ہو چھی تو بولے۔

”بس کچھ مت پوچھو، طبیعت سخت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے کمزوری بتائی ہے، خوراک کا خاص خیال

رکھنے کی تاکید کی ہے، اپنی لیے تازہ پھلوں کے جوس کے بعد اب چوزے کی یخنی پی رہا ہوں۔“

”ہاں ہاں ابا جان! بالکل ٹھیک کر رہے ہیں۔ آپ ہارٹ شوکر اور بلڈ پریشر کے راتے مریض ہیں۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات پر ضرور عمل کریں۔ کھانے کے بارے میں تو آپ نے عاصم کو بتا دیا ہے تاکہ کیا کھائیں گے؟ ظاہر ہے کھانا بھی ڈاکٹر نے پرہیزی ہی بتایا ہو گا۔ یہ عاصم تو کم عقل ہے، کہیں آپ کے لیے مرغن کھانا نہ پکا لے۔“

اسماء کی فکر مندی کے جواب میں ابا جان سرپ سرپ یخنی پیتے ہوئے بے نیازی سے بولے۔

”بھئی اب میں اتنے دن بعد آیا ہوں تو میرا دانا مجھے پھیکے سیٹھے بد مزہ کھانے تو کھلائے گا نہیں۔ ظاہر ہے اس کا بھی دل چاہے گا کہ اپنے سر کو اپنے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے کھلائے۔ اب تم جانتی ہو ہم تو بڑے ہیں، ہم سب کا دل رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جو کہتا ہے، وہ بھی کرتے ہیں اور اپنا دل جو کہتا ہے وہ بھی کرتے ہیں۔ جوس اور یخنی اپنی جگہ، فورمہ بریانی اپنی جگہ اور ضروری تو نہیں کہ ڈاکٹر کی سب باتیں ہی مانی جائیں۔“

ابا جان کی بات سن کر اسماء دل ہی دل میں جلتی، بھنتی اپنے کمرے میں پختی تو عاصم بھی پیچھے پیچھے آگیا۔

”وہ میں نے تم سے کہا تھا کہ پلمبر کو گتتی ہوئی آنا، بھول گئیں نہ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ بھول جاؤ گی، سووے میں بھی اتنی چیزیں کم ہیں۔ حالانکہ میں نے لسٹ میں سب کچھ لکھ کے دیا تھا اور کہا بھی تھا کہ جلدی آنا، چھوٹو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے لیکن تمہیں تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔“

اسماء کا ضبط جواب دے گیا۔

”خاموش ہو جاؤ، خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ دن بھر کی تھکن کے بعد اب گھر میں کھسی ہوں تو تمہاری لن ترانیاں شروع ہو گئیں۔ پلمبر سے کہہ دیا ہے وہ کل آکے تل ٹھیک کر دے گا۔ لسٹ میں لکھا دو سراسمان بھی کل دکان والا گھر پہنچا دے گا اور آفس میرے باپ

کا نہیں ہے کہ جب دل چاہے اٹھ کے آجاؤں خود بھی ذرا گھر سے نکلتا سیکھو۔ چھوٹو کو لے جا کر ڈاکٹر کو تو دکھاسکتے ہو۔ یہیں دو قدم پر ڈاکٹر کا کلینک ہے ہر کام کے لیے مجھے ہی کیوں دیکھتے ہو۔“

اسماء کے جواب میں عاصم بھی بھڑک اٹھا۔ ”تو میں کون سا فارغ بیٹھا تھا صبح سے بچوں نے چیم نہیں لئے دیا پھر وہ ہر کو مرے پہ سوڑے۔ تمہارے ابا جان آگئے جب سے اپنے طعنے تشنوں سے میرے گلے پر آئے نثر سب چلا رہے ہیں اور مستقل کھاپی رہے ہیں۔“

عاصم کی بات سن کر اسماء نے نظریں چرائیں۔ اس کا خود تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ گھر میں کھتے ہی ٹائلیں پھیلا کے بستر پر جائے لیکن گھر کے وسیوں کام اس کے منتظر تھے۔ خصوصاً ”چھوٹو کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اسماء نے کہا۔“

”اچھا پہلے ذرا مجھے ایک کپ چائے بنا دو پھر ڈاکٹر کے ہاں چلو۔“

عاصم گڑبڑا گیا۔ ”چائے بنانے اور پینے میں تو دیر لگ جائے گی اتنے میں ڈاکٹر کا ٹائم تو ختم ہو جائے گا۔ پہلے ہی وہاں مریضوں کی لائن لگ گئی ہوگی۔ ہمارا نمبر تو بہت دیر میں آئے گا بس جلدی سے نکل چلو۔“

اسماء نے بھی کچھ ہمت کو جمع کیا اور بیو کو ابا جان کے حوالے کر کے دونوں بچوں کو لے کر عاصم کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں آگئی۔ اف ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر تو لگتا تھا آواہا شہر ہی بیمار ہے انہیں پچیسواں نمبر دیا گیا جبکہ ابھی بارہواں نمبر چل رہا تھا۔ اسماء اور عاصم بچوں کو لے کر خاموشی سے اپنی باری کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک سوئڈ بوڈ صاحب غور سے تکی گردن لیے اپنے بچے کی انگلی تھامے شریف لائے اور سیدھے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اسٹنٹ پیچھے بھاگا۔

”ارے صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں پہلے نمبر

لیں پھر اپنی باری کا انتظار کریں۔“ لیکن ان صاحب نے کہا۔ ”میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے اور نمبر لے کر اپنی باری کا انتظار کرنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

اسٹنٹ بولا۔ ”بالکل درست فرمایا آپ نے یہ چائلڈ اسپیشلسٹ کا کلینک ہے تو یہاں سب ہی اپنے بچوں کو دکھانے آئے ہیں آپ بھی ذرا صبر سے بیٹھیں آپ کی باری بھی آجائے گی اور ویسے بھی آپ کے بچے کی طبیعت اتنی خراب نہیں لگ رہی کہ ایمر جنسی میں دکھانے کی ضرورت ہو۔ مہلانی کر کے بیٹھ جائیں۔“

لیکن وہ صاحب نہ مانے اسٹنٹ سے فرمائش کی کہ ڈاکٹر صاحب سے بات کرائی جائے کہنے کا انداز اتنا رعب دار تھا کہ اسٹنٹ نے فوراً ”انٹر کام پر ڈاکٹر صاحب سے بات کروادی۔ ان صاحب نے ڈاکٹر کو اپنا لمبا چوڑا نام اور اس سے بھی لمبا چوڑا عہدہ کچھ اس طرح بتایا کہ ڈاکٹر صاحب استقبال کو خود ہی دووازے پر آگئے بس غضب ہو گیا۔ اسماء کے تو سر پر لگی اور ٹکڑوں پر بٹھی۔ پنجابی فلموں کے ولن کی طرح ”لوئے یہ نہیں ہو سکتا“ کہنی آگے بڑھی۔ عاصم نے لاکھ ہاتھ پکڑ کے بٹھانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تو نیند بھوک اور تھکن کی وجہ سے اس کا ویسے بھی زمین سے ابلجھنے اور آسمان سے جھگڑنے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بھی بے نقط سنائیں اور مغرور صاحب کے ہوش بھی ٹھکانے لگائے۔ اسماء کو بولتے دیکھ کر آس پاس بیٹھے دوسرے لوگوں کی بھی ہمت ہوئی اور سب نے اسماء کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے ہار مان کر اسماء سے کہا۔

”اچھا پہلے ان صاحب کے بچے کا معائنہ کر لینے دیں پھر اس کے بعد سب سے پہلے آپ کے بچے کو دیکھوں گا۔“ لیکن اسماء نہ مانی اس کا کہنا تھا کہ ”اصول اصول

گھر پہنچنے کے بعد اسماء نے پھر محسوس کیا کہ عاصم مسکین سی شکل بنائے اس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔ لگتا تھا کہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن اس وقت بھی بے چارے کی مونچھیں ٹھٹھرا کے ہی رہ جاتیں۔ اسماء کو اس بار اس پر ترس آ گیا۔

”ہاں عاصم! بولو کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ وہ اسماء اٹھنے لگا تھا کہ تمہارا سفید سوٹ کلف لگا کے استری کر کے تیار رکھوں تو وہ میں بھول گیا۔ سارا دن اتنی مصروفیت رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ تم اس وقت کوئی دو سراسوٹ پہن لو بلکہ مجھے اپنے کپڑے نکل کے دو میں ابھی استری کروں گا۔“ عاصم نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ اسماء نے سوچا اس وقت کون کم بخت دعوت میں جا رہا ہے۔ سارا دن کی تھکن اور اب ڈاکٹر کو دکھانے کے چکر میں رات کے دس بج چکے تھے لیکن عاصم کو اس کی لاپرواہی پر دو چار باتیں سنانا بھی ضروری تھا۔

”مشاء اللہ! ایک کام کہہ کر گئی تھی تم سے وہ بھی نہیں ہوا۔ رہنے دو اب میں کسی دعوت میں نہیں جا رہی۔ صبح سے موڈ بنا لیا تھا کہ سفید سوٹ ہی پہن کر جاؤں گی کوئی دو سراسوٹ پہننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس سے تو بہتر ہے منہ سرلیٹ کر گھر میں ہی پڑی رہوں۔“

اسماء نے منہ سرلیٹ کر پڑے رہنے کے خوش کن تصور کا سوچا اور چاہا کہ اس پر فوراً عمل بھی کرے لیکن پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے اس تصور پر عمل کرنے سے باز رکھا لہذا ایک مرتبہ پھر زور سے چیخی۔

”اب گھر میں کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں؟“

”ہاں ہاں سب کچھ پکا ہوا ہے۔ کباب پلاؤ مرغی کا قورمہ اور کھیر۔ بس ابھی لے کر آتا ہوں۔“ عاصم تیزی سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔

”او! آج اتنی چیزیں کیسے پکالیں؟ اچھا میں سمجھ گئی۔ ابا جان کے ڈر کی وجہ سے یہ سارا اہتمام ہوا ہو گا۔ چلو اسی بھلنے ہمیں بھی گھر میں کچھ اچھا کھانا نصیب ہو گا۔“

اسماء نے طنزیہ انداز میں کہا اور ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئی جہاں والد صاحب پہلے سے کیل کانٹوں سے لیس تیار بیٹھے تھے ہر نوالے پر دونوں باپ بیٹی نے ڈھیروں نقص نکالتے ہوئے سیر ہو کر کھانا کھلایا۔ پیٹ کی آگ بھی تو بستر یاد آنے لگا۔ کھانے کی میز

اسماء نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ اسماء نے سوچا اس وقت کون کم بخت دعوت میں جا رہا ہے۔ سارا دن کی تھکن اور اب ڈاکٹر کو دکھانے کے چکر میں رات کے دس بج چکے تھے لیکن عاصم کو اس کی لاپرواہی پر دو چار باتیں سنانا بھی ضروری تھا۔

”مشاء اللہ! ایک کام کہہ کر گئی تھی تم سے وہ بھی نہیں ہوا۔ رہنے دو اب میں کسی دعوت میں نہیں جا رہی۔ صبح سے موڈ بنا لیا تھا کہ سفید سوٹ ہی پہن کر جاؤں گی کوئی دو سراسوٹ پہننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس سے تو بہتر ہے منہ سرلیٹ کر گھر میں ہی پڑی رہوں۔“

اسماء نے منہ سرلیٹ کر پڑے رہنے کے خوش کن تصور کا سوچا اور چاہا کہ اس پر فوراً عمل بھی کرے لیکن پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے اس تصور پر عمل کرنے سے باز رکھا لہذا ایک مرتبہ پھر زور سے چیخی۔

”اب گھر میں کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں؟“

”ہاں ہاں سب کچھ پکا ہوا ہے۔ کباب پلاؤ مرغی کا قورمہ اور کھیر۔ بس ابھی لے کر آتا ہوں۔“ عاصم تیزی سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔

”او! آج اتنی چیزیں کیسے پکالیں؟ اچھا میں سمجھ گئی۔ ابا جان کے ڈر کی وجہ سے یہ سارا اہتمام ہوا ہو گا۔ چلو اسی بھلنے ہمیں بھی گھر میں کچھ اچھا کھانا نصیب ہو گا۔“

اسماء نے طنزیہ انداز میں کہا اور ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئی جہاں والد صاحب پہلے سے کیل کانٹوں سے لیس تیار بیٹھے تھے ہر نوالے پر دونوں باپ بیٹی نے ڈھیروں نقص نکالتے ہوئے سیر ہو کر کھانا کھلایا۔ پیٹ کی آگ بھی تو بستر یاد آنے لگا۔ کھانے کی میز

سے اٹھ کر اسماء سیدھی اپنے بیدروم میں جا کر بستر پر لیٹ گئی لیکن بستر لیٹنے کے بعد یہ سوچ کر ہی روٹنے کھڑے ہو گئے کہ کل بجلی کیس اور ٹیلی فون کے بل جمع کروانے کے ساتھ ساتھ ٹیپو کے اسکول کی فیس بھی جمع کروانی ہے اور پیسے ہیں کہ تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ اس واقعہ تو مہینہ پورا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ صبح چھ بجے اٹھ کر پھر دو دو بیس بدل کر آفس جانے اور ایک مشقت بھر ادن گزارنے کے خیال سے نیند آتے آتے آدھے راستے سے ہی پلٹ گئی۔ بڑی مشکلوں سے سینکڑوں کروٹیں بدلتے اور ڈیڑھ دو ہزار بھیڑیں گننے کے بعد نیند آئی ہی تھی کہ عاصم کی زوردار جھج سے آنکھ کھل گئی۔ سانس بحال اور ہوش ٹھکانے آئے تو دیکھا کہ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور عاصم آنکھیں پھاڑے بستر پر بیٹھا تھا۔ اسماء کو اٹھتے دیکھ کر بولا۔

”ارے ارے کہاں چلیں، ایک منٹ ٹھہرو آج میں اپنے کپڑے خود استری کر لوں گا اور ناشتہ بنانے میں تمہاری مدد بھی کروں گا اور ہاں بجلی کی فکر مت کرنا بجلی اگر اٹھ گئی تو میں اسے بھی سنبھال لوں گا ورنہ یہ تمہیں کام نہیں کرنے دے گی۔“

پہلے تو اسماء کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو خیال آیا کہ شاید ایک دن گزر چکا ہے اور نظامِ مقررہ کی حکومت ختم ہو چکی ہے لیکن یہ عاصم کو کیا ہوا؟ عاصم کے مزاج میں یہ تبدیلی کیسے آگئی؟ اسماء حیران ہو کر بولی۔

”عاصم! کہیں ہم دونوں خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے؟ ایک جیسا خواب؟“

عاصم بھی حیران رہ گیا۔ اسماء پھر پریشان ہوئی۔

”لیکن عاصم! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی وقت میں ایک جیسا خواب نظر آئے۔“

”ارے میری پیاری بیوی! کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ اللہ میاں نے ہماری روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آکر از خود نوٹس لے لی

لیا ہے ورنہ تو ہماری یہ روز روز کی لڑائیاں خدا جانے کیا غضب ڈھکتیں۔“

عاصم نے اسماء کی حیران و پریشان شکل دیکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اسماء سب کچھ سمجھ گئی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو عاصم! اب میں بھی کبھی یہ خواہش نہیں کروں گی کہ کاش میں ایک میاں ہوئی بلکہ بلا تائید اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کروں گی کہ میں ایک بیوی ہوں اور جیسے ہی تم گھر واپس آکر بتل جائیا کرو گے، جھٹ پٹ دروازہ کھول دوں گی اور ممکن کے باوجود مسکراتے چہرے کے ساتھ تمہارا استقبال کروں گی۔“

”ارے واہ بیگم صاحبہ! شکر ہے اللہ میاں کے از خود نوٹس لینے سے تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آئی۔“

عاصم شرارت سے بولا تو اسماء پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”میری سمجھ میں تو بہت کچھ آگیا لیکن اس از خود نوٹس سے میرے میاں کیا سیکھے اور سمجھے یہ تم نے اب تک نہیں بتایا؟“

”ارے جناب! میں بھی سمجھ گیا ہوں کہ میں ہر وقت میاں ہونے کا رعب نہیں جماؤں گا۔ آفس جانے وقت چتریں نہیں پھیلاؤں گا، وقت ضرورت بچوں کو سنبھالنے میں اپنی ہتک محسوس نہیں کروں گا۔“

عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسماء بولی۔ ”سب سے بڑی بات تو تم نے کہی ہی نہیں۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ وعدہ کرو کہ بات بات پر مجھے آرام طلبی کے طعنے نہیں دو گے اور ہاں اپنا وہ حلق، زخروں اور ہتھکڑوں کے آواز نہ استعمال والا فارمولا بھی بھول جاؤ گے۔“

”ارے میرے آفس کا ٹائم نکلا جا رہا ہے بات کرتے کرتے عاصم کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ چلا اٹھا اور اسماء بجلی کے رونے کی آواز سن کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔



امیدِ فردا،

چلو اک نظم لکھتے ہیں
سلسلِ بارشوں کے موسموں میں
دھوپ نکلے تو
کتنے رنگ چمکیں گے
ہوا کے تیز جھونکوں سے
بدن کی شامِ غولے تو
فضا میں بھول نہیں گے
وفا کی چاندرا توں میں
محبت خواب دیکھے تو
بدن سے ساز پھوٹیں گے
گلوں کے ہونٹ پہ
تسلی اگر پر رکھ دے تو
مدائے
محبت خواب ہے اور خواب کی آنکھیں
شفیق کے رنگ میں
کرنوں سے پھوٹی ہیں
تھلا دیں درد کے لمحے
جو صدیوں سے مسلط ہیں
سلسلِ بارشوں سے گھر کی جو دیوار ٹوٹی ہے
ہوا کے تیز جھونکے کاٹتے ہیں
کس طرح سانس
فضل میں خوف طاری ہے
مگر آنکھیں سنہری خواب بنتی ہیں
کہ امید باقی ہے
نئے سورج کے اُگنے کی

یعنی زاسید

اب بھی وہ ہمیں ملا کہاں ہے
دیوارِ وصالِ دریاں ہے

یہ شہرِ بلند یوں سے دیکھو
دیاتے رواروی رواں ہے

دل بات کرے توب نہ بولیں
یہ کیسا عذابِ جسم و جاں ہے

اک عمر تری تلاش کے بعد
میں ہوں مری عمرِ رائیگاں ہے

ہر سو تجھے ڈھونڈتی ہیں آنکھیں
تو ہے تو کہیں، مگر کہاں ہے

دل سے تری یاد اتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کاسماں ہے

سعود عثمانی

کوئی جگنو شبِ تاریک سے مانگا جائے
تاکہ سورج کی عنایات کو پرکھا جائے

ایسا مرہم کوئی ایجاد کریں اہلِ ہنر
جس کو اس دور کے زخموں پہ لگایا جائے

یوں تو ہوتی ہے محبت ہی محبت کا خواب
پھر بھی کب میں نے کہا ہے مجھے چاہا جائے

امن اور چین سے دو وقت کی روٹی مانگو
اور اس دور میں کیا ہے جسے مانگا جائے

میں محبت، میرا پیغامِ وفا، حسنِ سلوک
اک صحیفہ مری خاطر بھی اُتارا جائے

یا بدلتے ہوئے حالات میں یا فکرِ معاش
اور اس دور میں کیا ہے جسے سوچا جائے

رات دن دونوں برابر کی ضرورت ہیں اثر
کس کو کیا جانے کس وقت پکارا جائے

رشید اثر

سنگ کو تکیہ بنا، خاک کو چادر کر کے
جس جگہ نکلتا ہوں، پڑ رہتا ہوں بستر کر کے

اب کسی آنکھ کا جادو نہیں چلتا مجھ پر
وہ نظر بھول گئی ہے مجھے پتھر کر کے

مہرباں اس کو نہ پایا تو پلٹ آئے ہم
ہاتھ کے ہاتھ حساب اپنا برابر کر کے

مجھ کو بھی پڑ گیا ایک اور ضروری کام
وہ بھی گھر پر نہ رہا وقت مقرر کر کے

پوچھنا چاہتا ہوں میں یہ ان آنکھوں سے جمال
کس کو آباد کیا ہے، مجھے بے گھر کر کے

جمال احسانی

درخواست

ایک ہالی وڈ اشار کی شادی تھی۔ اس کی گاڑی خراب ہو گئی تو اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو فون کیا۔ ”جیک! میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ دیکھو جب تک میں نہ آ جاؤں تب تک کسی سے شادی نہ کرنا“

شع مسکن جام پور

جھگڑے کی وجہ

اپنے نئے پڑوسی کے گھر سے روزانہ لڑائی جھگڑے کی آوازیں سن سن کر ایک صاحب تنگ آ گئے اور پڑوسی کے دروازے پر پہنچے۔ ایک چھوٹا بچہ باہر نکلا۔ انہوں نے بچے سے کہا۔ ”میں تمہارے لڑائی جھگڑے سے تنگ آ چکا ہوں“ میں تمہارے ابو سے ملنا چاہتا ہوں ان کا نام کیا ہے؟“ ”اسی بات پر تو روزانہ ہمارے گھر جھگڑا ہوتا ہے۔“ بچے نے کہا۔

نوباریہ خالد۔ لاہور

حاضر و غای

دوکیل ایک ہوٹل میں گئے اور دو بوتلوں کا آرڈر دیا اور اپنے برفیل کیسوں سے سینڈویچ نکال کر کھانے لگے۔ ہوٹل کلائنگ ان کے پاس آیا اور کہا۔ ”آپ یہاں اپنا سینڈویچ نہیں کھا سکتے۔“ ”کیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کاندھے اچکائے اور اپنے سینڈویچ تبدیل کر دیے۔“

اقتباس۔ ردا بٹ

مظلوم

نویا ہوتا ہیوی جو ایک ابھرتی ہوئی فلم اشار تھی فلم پروڈیو سر کو دیکھتے ہی بلک بلک کر رونے لگی۔ ”ارے ارے روتی کیوں ہو؟ بات کیا ہے؟“ فلم پروڈیو سر نے پوچھا۔

”مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ مجھے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔ شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس اسکرپٹ رائٹر سے میں نے شادی کی ہے وہ پہلے بھی شادی کر چکا ہے اور اس کے پانچ بچے ہیں۔“ فلم ایکٹریس نے روتے ہوئے کہا۔

فلم پروڈیو سر نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”حقیقت میں تم پر برا ظلم ہوا ہے۔“ فلم ایکٹریس نے مزید جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ”صرف مجھ پر ہی نہیں میرے چھ بچوں پر بھی ظلم ہوا ہے۔“

سب ایسا ہی کہتے ہیں!

صاحب نے دفتر میں ایک نیا چپڑا سی رکھا۔ وہ دفتر کا کام تو اچھا کرتا تھا مگر صاحب اس سے بہت تنگ تھے۔ کیونکہ وہ ہر شخص کو صاحب سے ملنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ جس سے صاحب کے کام کا حرج ہوتا۔ ایک دن اسی بات پر ناراض ہو کر صاحب نے چپڑا سی سے کہا۔

”تم بالکل بے کار آدمی ہو۔ تمہارا مجھے کیا فائدہ؟“ ”میں کیا کروں حضور؟ اگر میں کہوں صاحب اندر نہیں ہیں تو کوئی میرا اعتبار نہیں کرتا۔ سب کہتے ہیں

”بڑا ضروری کام ہے اور صاحب نے ہی بلایا ہے۔“ صاحب نے سختی سے کہا۔ ”آئندہ یاد رکھو! کوئی کچھ بھی کہے تم پروامت کرو۔“ ”کہہ دیا کرو سب ایسا ہی کہتے ہیں۔“ ”بہت اچھا حضور!“

چپڑا سی صاحب کی تازہ ہدایات لیے کمرے کے باہر آکر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو ایک موٹی سی عورت آئی اور باہر بیٹھے ہوئے چپڑا سی کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے بڑے دھب سے کمرے میں داخل ہونے لگی۔ چپڑا سی نے اسے روکا اور کہا۔

”آپ اندر نہیں جاسکتیں۔ یہ صاحب کا آرڈر ہے“

”لیکن میں تو صاحب کی بیوی ہوں۔“ ”ہاں! ہاں! چپڑا سی بڑی بے پروائی سے بولا۔ ”سب ایسا ہی کہتے ہیں۔“

اختتام انیلا۔ کراچی

دو بچے آپس میں ریڈیو ریڈیو کھیل رہے تھے اور بحث اس بات پر ہو رہی تھی کہ اناؤنسر کون بنے گا اور پروگرام کون سنائے گا۔ بالآخر ٹاس پر فیصلہ ہوا۔ ہارے ہوئے بچے کو اناؤنسر بننا تھا چنانچہ اس نے مندرجہ ذیل اناؤنسرمنٹ کی۔

”سامعین! رات کے بارہ بجے ہیں۔ اب ہماری نشریات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ خدا حافظ۔“

حسن انتخاب

رمضان نے شادی کے لیے ایک دولت مند لڑکی تلاش کی اور ایک نظر اپنی والدہ کو دکھانے کے لیے سے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کی والدہ نے لڑکی کو دیکھا تو دم بخود رہ گئیں۔ وہ رمضان کو ایک طرف لے گئیں اور ناگواری سے سرگوشی میں بولیں۔

”پوری دنیا میں تمہیں یہی لڑکی ملی تھی شادی کے لیے؟ اس کے تو چہرے پر بال ہیں۔ آنکھوں سے جھینگی ہے۔ دانت ٹیڑھے میڑھے ہیں اور ذرا رنگت تو دیکھو! اٹنے تو بے جیسی۔“ رمضان نے ان کی بات کاٹتے

ہوئے کہا۔ ”آپ کو سرگوشیوں میں بات کرنے کی ضرورت نہیں آرام سے اونچی آواز میں بات کریں۔ وہ سہری بھی ہے۔“ ”بہن! کراچی

بے بسی

بھول آیا ہو جو گھر پر کارتوس دیکھنا پھر اس کا حلیہ چاہیے منحصر ہو نقل پر جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

صحیح طریقہ

کھیت میں مل چلاتے ہوئے کسان بار بار چلا رہا تھا۔ ”شاباش! پو شاباش! گڈو شاباش! ساون۔“ ”ادھر سے گزرتے ہوئے اس کے ایک کسان ساتھی نے پوچھا۔ ”تم نے اپنے تیل کے تین نام کیوں رکھ دیے ہیں؟“

”نہیں اس کا نام پو ہے۔ دراصل پو اپنی طاقت سے بے خبر ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اکیلا مل نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ دوسرے دو فرضی ناموں سے میں اس پر ظاہر کرتا رہتا ہوں کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ گڈو اور ساون اس کی مدد کر رہے ہیں۔“

پندرہ بچے

نجوی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے صاحب! میں سی کو جھوٹی تسلی یا امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کتا ہے کہ اسیالیس سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ اڑتیس برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوگی اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔“

”کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔“ سائل جگر کر بولا۔

”اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہوگی اور

کون کم بخت

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔
”آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟“
”یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔“ بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

”کون کم بخت اس بدذات کمبختی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے۔ بکو اس کرتی ہے اور سارے پیسے اس کو دیتا ہوں، خواہ جیب میں پھولی کوڑی بھی نہ ہو۔“

اللہ معاف کرے

ایک مذہبی رہنما کو جلسے میں تقریر کرنی تھی کیونکہ ان کے اعزاز میں یہ جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک وزیر نے تقریر سے قبل مذہبی رہنما سے تعارف کراتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی۔ تعارف ختم ہوا تو وہی رہنما تقریر کے لیے اٹھے اور بولے۔
”اللہ تعالیٰ وزیر صاحب کو ان کی مبالغہ آرائی پر معاف کرے اور مجھے اپنی تعریف سن کر لطف اندوز ہونے پر۔“
نمور مذاق۔ دلیفنس

عالمی ریکارڈ

ایک سوئمنگ کلب کے نوٹس بورڈ پر چسپاں ایک عبارت ملاحظہ کیجئے۔ ای این والٹر نے پانی کے اندر رہنے کا عالمی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ وہ مسلسل چھ گھنٹے بیٹس منٹ اور بیالیس سیکنڈ زیر آب رہا۔
مرحوم کی تدفین صبح آٹھ بجے کلب سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ ممبران سے شرکت کی درخواست ہے۔

انتالیس سال کی عمر میں، میں مراہوں گا اور میرے مولہ بچے ہوں گے۔ کیسے۔“
”آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہوگی وہ پندرہ بچوں کی ماں ہوگی۔“ نجوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
رابعہ - لاہور

بدحواسی

اچانک بڑی شدت کا طوفان بادوباراں آگیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مکانوں کی چھتیں اڑنے لگیں۔

ایک عائبہ داغ پروفیسر اوہر لوہر بھاگ کر لوگوں کو جمع کر رہے تھے کہ رہے تھے۔

ہمیں اب یہ سوچنا چاہیے کہ ہمیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟
ایک صاحب ان کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بولے۔ ”سب سے پہلے گھر جا کر پتلون پہننی چاہیے۔“

سیدہ فرزانه عرفان، حجرہ شام مقیم

خود بینی

اٹلی کے مشہور شاعر و انزیو کے پاس اس کے کسی مداح نے خط لکھا۔ مداح کو اس کا پتا معلوم نہیں تھا۔ لہذا اس نے لفافے پر ”اٹلی کے سب سے بڑے شاعر کو ملے“ لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ پوسٹ مین ”انزیو کے پتے سے واقف تھا۔ وہ یہ خط لے کر جب انزیو کے پاس پہنچا تو لفافے کے پتے کو پڑھ کر انزیو نے اسے پوسٹ مین کو واپس کر دیا اور کہا۔
”یہ میرا خط نہیں ہو سکتا۔“

پوسٹ مین نے اسے حیرت سے دیکھا۔ انزیو نے اس کی حیرت کو ناڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”کہا۔
”تم ہی بتاؤ یہ خط میرا کیسے ہو سکتا ہے“ میں اٹلی کا نہیں دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہوں۔“





رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
انہوں نے فرمایا۔

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ فرما رہے تھے۔
”جس کو جسم میں کوئی تکلیف (جسمانی تکلیف) پہنچے پھر وہ اس (تکلیف پہنچانے والے) کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے“
(ابن ماجہ)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا،

خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو جائے بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو۔ اور تمہاری بربادی کی صفت بڑی ہو۔ اور اپنے رب کی عبادت میں تم لوگوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

ایمان کی چوٹی،

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے۔
”ایمان کی چوٹی اللہ کے فیصلے کی وجہ سے پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرنا اور تقدیر پر راضی ہونا ہے اور توکل میں مخلص ہونا اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات کو بے چون و چرا لینا اور اللہ کے سامنے گردن جھکا لینا ہے۔“

حضرت عمر بن خطاب کی نصیحت،

اپنے تمام معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کیا کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نصیحت،
حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
”یہ جان لو کہ علم اور بردباری زینت ہے اور وعدہ پورا کرنا مردانگی ہے اور جلد بازی بے وقوفی ہے اور سفر کرنے سے انسان کمزور ہو جاتا ہے اور کینے لوگوں کے ساتھ بیٹنا عیب کا کام ہے اور ناستی فاجر لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے انسان پرہمت گنتی ہے۔“

اجہی باتوں کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا،

حضرت علی کریم اللہ وجہ نے فرمایا ”تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اجہی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا) ضرور کرتے رہنا ورنہ تم پر تمہارے بڑے لوگ مسلط کر دیے جائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ بھی نہ کر سکیں گے تو قبول نہیں ہوگی“

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا،

حضرت قیس بن سلح انصاری کے بھائیوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ان کی شکایت کی اور کہا کہ یہ ایسا مال فضول خرچ کرتے ہیں اور ان کا ہاتھ بہت کھلا ہے۔
انہوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کھجوروں میں سے اپنا حصہ لے لیتا ہوں اور اس کو اللہ کے راستے میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہوں“
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور تین مرتبہ فرمایا۔
”تم خرچ کرو۔ اللہ تم پر خرچ کرے گا۔“

اس کے بعد جب میں اللہ کے راستے میں نکلا تو میرے پاس سواری کا اونٹ بھی تھا اور اراج میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں“ (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے بھائیوں سے زیادہ مال دے رکھا ہے)۔

قناعت،

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کم اللہ وجہ نے فرمایا۔
”اے ابن آدم! تو اراج کے دن کی فکر کر اور آئندہ کی فکر نہ کر بلکہ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اگر کل تجھے موت نہیں آتی ہے تو کل کی روزی تیرے پاس خود ہی آجائے گی اور یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ تو اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا کمارا ہے وہ تو دوسروں کے لیے جمع کر رہا ہے“

مسلمان کے عیب کو چھپانا،

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ایک آدمی نے آکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جسے میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک دفعہ زندہ قبر میں دفن کر دیا تھا لیکن پھر مرنے سے پہلے اسے باہر نکال لیا۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ اسلام کا زمانہ پایا اور مسلمان ہو گئی پھر اس سے ایسا گناہ سرزد ہو گیا جس پر شرعی منکر لازم آتی ہے۔ اس پر اس نے بڑی جھڑپی سے خود کو ذبح کرنے کی کوشش کی۔ ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے اور اسے بچا لیا لیکن اس کے حملے کی کچھ رگیں کٹ گئی تھیں۔ ہم نے اس کا علاج کر دیا وہ ٹھیک ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے توبہ کی اور اس کی ذہنی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ اب ایک قوم کے لوگ اس کی شادی کا بیغام دے رہے ہیں۔ کیا میں انہیں ساری بات بتا دوں؟“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ نے تو اس کے عیب کو چھپا دیا تھا، تم اسے ظاہر کرنا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! اگر تم نے اس لڑکی کی کوئی بات بتائی تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جس سے تمام

شہر لوگوں کو عبرت ہوگی۔ بلکہ اس کی شادی اس طرح کرو، جس طرح ایک پاک و امن مسلمان عورت کی کی جاتی ہے۔“

موتی مالا،

جن اقوام میں استاد کو احترام کا درجہ دیا جاتا ہے، وہ اقوام عالم کی رہبری کرتی ہیں۔
(اسکروائلڈ)

۱ جذبوں اور روٹیوں کی تعمیر کیجیے۔ خوبصورت معاشرہ جنم لے گا۔
(گادڈن بائرن)

۲ انسان کا کردار اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے اور کس کو پسند کرتا ہے۔
(سموئیل جانسن)

۳ ناگامی جرم نہیں، مقصد کا پست ہونا جرم ہے۔
۴ دوست کے نادان منہ ہونے کے خیال سے حق بات نہ کہنا حق دوستی پودا نہ کرنے کے برابر ہے۔
نمر، اقرا۔ کراچی

عقل بڑی دولت،

ہمیں ہر اس چیز سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کیے جانے کے قابل ہو اور ہر اس چیز سے نفرت کرنا چاہیے جو نفرت کے قابل ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں کافرق دیکھنے کے لیے عقل کی دولت بھی ہو۔
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

قرآن کی سچائی،

ممتاز مغربی دانشور مجیری ملر نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام ابولہب تھا۔ ابولہب کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بیٹھا لیا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جاتے وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات جھٹلاتا۔ اگر

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے کہ یہ جیسے سفید ہے تو وہ جھوٹ بول اٹھتا۔

”ہمیں یہ کالی ہے“ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے کہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں رات ہے۔

قرآن میں ابولہب کا ذکر بھی آیا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقصد ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا۔ کافر ہی رہے گا۔

گیری مل کر لکھتا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابولہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ اگر وہ مسلمانوں سے کہتا۔

”دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے مسلمان بنا لو۔“ اور جب وہ مسلمان بنالیتے تو کہتا۔ ”کوئی بھی تمہارا

قرآن جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اب بولو۔“

لیکن ابولہب نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا،

جو شخص لاچ کرتا ہے، اس کی روزی میں تو اضافہ نہیں ہوتا البتہ اس کی عزت اور قدردم ہوجاتی ہے۔

جو کسی کی غیبت سنتا ہے گو یا وہ خود غیبت کرتا ہے۔

اپنے بیٹے کو اپنی تعلیم نہ دلاؤ کہ وہ تمہارے دودھ کے لیے پیدا نہیں ہوا۔

اے ابن آدم! جب تو دیکھے کہ تیرا پاک پروردگار تجھے بے درجے نعمتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا۔

درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو منرا دینے میں سب سے زیادہ قدیم رکھتا ہے۔

تمہارے دوست تین ہیں۔

1۔ تمہارا دوست۔

2۔ تمہارے دوست کا دوست۔

3۔ تمہارے دشمن کا دشمن۔
نذا، فضہ۔ کراچی

حرف دانش،

جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

یہ ہماری آنکھیں نہیں بلکہ دوسروں کی آنکھیں ہیں جو ہمیں بر باد کرتی ہیں۔ اگر سوائے آپ کے دنیا کے تمام لوگ اندھے ہوتے تو آپ کبھی بھی عمدہ لباس اور خوش نما سامان کی پروا نہ کرتے۔

جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے، وہ سب کسی نہ کسی دن بخش دیا جائے گا۔ اس لیے ابھی بخشش کرو۔

ناک بخشش کا موسم تمہارا ہو۔ نہ کہ تمہارے داروں کا۔

آمنہ اجالا۔ ڈھرکی

بات سے بات،

جلگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

کسی انسان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو تم اپنے ساتھ نہیں چاہتے۔

پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔

جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ جو اللہ کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکتا وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

(واصف علی واصف)
عائشہ، تحریم۔ کراچی

اونچی عمارتیں بنانا،

حضرت عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ام مطلق

کے گھر ان کی خدمت میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے گھر کی چھت چمکی ہے۔ میں نے کہا۔ ”اے ام مطلق! آپ کے گھر کی چھت بہت چمکی ہے“ انہوں نے کہا۔

”اے میرے بیٹے! حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گودنروں کو یہ خط لکھا کہ تم اپنی عمارتیں اونچی نہ بناؤ کیونکہ تمہارا سب سے بڑا دن وہ ہوگا، جس دن تم لوگ اونچی عمارتیں بناؤ گے“

مدیحہ۔ فیصل آباد

نشے کی تباہ کاریاں،

نشہ وہ ہے جس نے ہاروت، ماروت کو بھی بہکایا جب اللہ تعالیٰ نے ہاروت، ماروت کو اس زمین پر بھیجا تو ان کی آزمائش مقصود تھی۔ ان سے کہا تین گناہ مت کرنا۔ شراب، قتل اور زنا سے دور رہنا۔ ایک

زہرہ نامی عورت نے پہلے زنا کی دعوت دی تو انہوں نے کہا۔ ”میرے رب نے اس سے منع فرمایا ہے۔ یہ سخت گناہ ہے۔“ پھر قتل کے لیے آمادہ کیا۔ اس سے بھی انکار کیا۔ پھر جب نشے کی دعوت دی تو اس کے بہکاوے میں آگئے کہ یہ ہلکا گناہ ہے قابل معافی ہے لہذا شراب پی لی۔ اس نشے کے جادو نے قتل بھی کر دیا اور زنا بھی۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

انمول موتی،

دنیا کو آخرت کے لیے جھوڑ دینا کوئی خوبی کی بات نہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق ادا کیا جائے۔

کامل انسان وہ ہے جس سے اس کے دشمن بھی بے خوف ہوں۔

انسان زندگی میں کچھ بھی کرے، مگر اس عالی شان زندگی کا خاتمہ موت ہے اور موت کے بعد۔

عظیم الشان انسان بھی اتنا ہی بے بس اور عزیز ہے جتنا کہ اپنی پیٹھ پر کئی اینٹیں ایک ساتھ لاد کر سیریاں چڑھنے والا مزدور۔

لفظوں کی خوشبو،

• مرگ کنارے کرے میں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا جو مرگ پر سے گزر رہی ہے۔

• تنہائی کے مسافر بیمار روتوں کی طرح اذیت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

• ہم جتنے بلند ہوتے ہیں اتنے تنہا بھی۔

• یادیں اس حسا کی مانند ہیں جو سوکھ جانے کے بعد رنگ لاتی ہیں۔

• زندگی ایک ایسی ٹرین ہے جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پر رکتی ہے جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔

عظمیٰ، نادیرہ۔ کراچی

اچھی باتیں،

* جس جیسے کا ہمیں اشتیاق ہو وہ ہمیں حاصل نہ ہو، ہمارے دل کو اس جیسے سے زیادہ محبوب ہوتی ہے جو ہمیں حاصل ہو۔

* جب تم نے ہوا پر اپنا دُعا ظاہر کر دیا ہے تو اب اگر ہوا اسے دُختوں پر ظاہر کر دے تو تم ہوا کو برا مت کہو۔

* حق کی سنتے والا حق کا اظہار کرنے والے سے کچھ کم نہیں ہے۔

* دوست کو دوستی سے پہلے پرکھو ورنہ بعد میں دوستی کے مجرم بن جاؤ گے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدرمرجان

دل کی باتیں

سین شہداء
کچھ درد نہاں، کچھ فکر جہاں، کچھ شرم خطا، کچھ خوفِ رزا
آگ بولچہ اٹھائے پھرتا ہوں افسردہ بوجھ بھی کتنا بھاری ہے
صباحِ صبح
جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر ہم
ثمینہ اکرم
نہ صدف بنی نہ گہر ہوئی یونہی جلتی بجتی بسر ہوئی
کبھی زندگی کے چراغ کی نہ ہی شب ڈھلی نہ صبح ہوئی
میرے خاموشی میرے خواب تھے، ان ہی آنسوؤں کا سراب تھے
کئی راستوں سے گزر کے بھی چاہ جن کی گردِ سفر ہوئی
فرحت نسیم
یہ تیرے خط، تیری خوشبو یہ تیرے خواب و خیال
متلج جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی عزیز کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح
اقرا ام
آنکھوں نے بنا ڈالے ایک بات پہ دھیرے سے
خشکی کے سمندر میں پانی کے جزیرے سے
آسیہ جاوید
ہری بھری مٹی ہنسی سرخ گلاب کی بھی
عجیب کہانی مٹی سونے کے تالاب کی بھی
ہنسی گاتی آبادی کو اجاڑنے میں
حالت غیر ہوئی ہوگی سیلاب کی بھی
فریال صلاح الدین
نہ سننے میں نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
جو ہجر و وصل مرے تجربے میں آیا ہے
ہوا زکھتا ہے ہر ایک اپنے ہونے کا
یہاں پہ جو ہے کسی سلسلے میں آیا ہے

مدد محمد احمد
خوش ہے بہت وہ اپنے نئے ہم سفر کے ساتھ
اتنی ذرا سی بات پہ کیوں رو رہا ہوں میں
ذوباریہ خالد
یہ غم نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک نہ ہو سکے
یہ رنج ہے کہ کوئی درمیاں میں بھی نہ تھا
عدلیہ شہزاد
اُسے کہنا شام کی ادا سائیں ہمیں ابھی نہیں گیتیں
اگر ہو سکے تو یہ جدائی تھوڑی مختصر کر دے
عائشہ، تحریم
نہ محسوس اور کوئی بھی رنجشیں صرف عادتوں میں تضاد تھا
کہ اسے پسند محسوس خوشیاں اور ہمیں سادگی پہ ناز تھا
اقرا نوید
وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
میرا علاج میرے چادرہ گر کے پاس نہیں
تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
میرے لیے کوئی شایان التماس نہیں
زرتاشہ شیرازی
رو کے کہاں رُکے ہیں محبت کے قافلے
بس یوں ہوا کہ دل نے زمانے بدل دیے
دیکھا تو اپنا آپ تھا لوگ شکست پر
یوں دقت نے ہمارے نشانے بدل دیے
خاکنول
سکیوں کی تال پر ہیں آرزوئیں محوِ رقص
کس قدر ہے سوز ہماری زندگی کے ساز میں
حرا شاہ
یہ میری ذلیلت کی سب سے بڑی تمنا تھی
وہ میرے پاس میرے نام کی طرح رہتا

شازیہ رانا
دو گھنٹی میسر ہوا اس کا ہم سفر ہونا
پھر ہمیں گوارا ہے اپنا درد بردہ ہونا
اُس کے وصل کی ساعت ہم پہ آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا
نمرہ، اقرأ
دشمن کو ہارنے سے بچانا عجیب تھا
ترکِ مدافعت کا بہانا عجیب تھا
اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا
ثمینہ اکرم
روئے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عمر بھر کا جگنے والا بڑا سوتا رہا
روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایا میرے کمرے میں چھا رہتا رہا
غٹوئی اکرم
اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے
فرح فاطمہ اشرف
کسی کا راز کسی سے نہیں کہتے
یہ احتیاط اندھیروں میں پانی ماتی ہے
آمنہ اجالا
زندگی بھر کی شناسائی چلی جائے گی
گھر بسالوں کا تو تنہائی چلی جائے گی
فوزیہ سعید
بہت گلہ مری تنہائیوں کو ہے مجھ سے
میرے سوا گھر میں کوئی نہیں رہتا
مہر گل
سیکھ روشنی کو روشنی کہے
یہاں کسی کو یہ مجال نہیں
شع مسکان
بہی سوچتا گھر سے دُور آ گیا
کوئی روک لے گا تو رُک جاؤں گا
کہ ہو راستہ داپسی کے لیے
میں دانستہ کچھ بھول کر جاؤں گا

یاسمین کنول
کتنی دلکش ہے تیری خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے
مہر گل و عاگل
آؤ چپ کی زبان میں محسن
اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں
شعل جہانی
کاش میرے بس میں بھی ہوتا تجھ سے غافل ہو جانا
ہم بھی سکوں سے رہتے بے خبر تیری طرح
انیلا
ہم تو عرصے سے کبھی اُن کے دوبرو نہ ہوئے
صرف محسوس کیا ان کو ادبِ طبیعت بہل گئی
فرحت بشیر
جب اس کو جیتنا بھی ہمارے مہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جوا کون
گرفتارِ رات نے جب سادھلی ہے
نہ جلنے آتے آتے رُک گیا ہے کون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کئی نیکو کھو



رخسانہ نگار عدنان

قیمت - 350/- روپے



وضعیہ حالیہ

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: Info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو ہمارے پیارے ملک کو اپنے
حفظ و امان میں رکھے اور جو لوگ ہمارے ملک کو نقصان
پہنچانے کے درپے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اللہ
تعالیٰ ان کے مذموم ارادوں کو ناکام بنائے۔ انہیں نیست و
ناہود کرے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے رشک حبیبہ کا ہے، لکھتی ہیں
یوں تو میں نے اس نہیں لگائی کہ یہ خط شائع ہو گا مگر پھر
بھی پیوستہ رہ تجھ سے امید ہمارے کہ مصداق کہیں درون
قلب تھا سادیا ضرور ٹھنڈا رہا ہے کہ شاید۔ ایک نظر
میری طرف ہو ہی جائے۔ خیر نہ بھی ہو تو۔

کچھ غیر ہیں غیروں کا گلہ کس سے کریں ہم
کچھ اپنے ہیں اپنوں کی شکایت نہیں ہوتی
سب سے پہلے تو بے انتہا شکریہ کہ میری کہانی کو قاتل
اشاعت سمجھتے ہوئے شعاع کی زینت بنایا گیا۔ تھوڑا بہت
تبصرہ کرتی چلوں۔ جناب ”تجدید وفاق“ بہت زبردست تحریر
ہے۔ سونیا نوید کے انداز تحریر کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔
”سنہری دھوپ“ صوفیہ امجد نے اچھا لکھا۔ کیپ اٹ
اب۔۔۔ افسانوں میں ”میری ایک کام کرنا ہے“ پسند آیا
”ذرا سنبھل کے“ فاطمہ عسکری کا بس سو سوتا تھا۔ ”فرا“ مختصر
پیرائے میں لکھی حساس موضوع کی کہانی تھی جو نہایت
بلکی پھلکی تحریر تھی معاشرہ ان جیسی معمولی خطاؤں سے

ہی غلط طرز پر پروان چڑھتا ہے مکمل ناول نمرود احمد میں کیا
کہوں؟ کچھ گننے کے لیے لفظ نہیں۔ انداز تحریر سے لے
کر اسلوب اور کہانی کی کہانی کی سینگ۔۔۔ ایک ایک چیز
ایک ایک نقطہ قاتل تحسین ہے۔
سنا تو ہے کہ خط اشاعت میں نہ بھی شامل ہو تو پڑھا
ضرور جاتا ہے اور تنقید بھی نوٹ کی جاتی ہے۔ تو جناب میرا
خط بھی پڑھ لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے ورنہ ہر بار
کی طرح اس بار بھی محنت و محبت کا ثمر جانے کا افسوس تو
ضرور ہو گا مگر۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
خود کو کلی دے لوں گی۔ ڈونٹ وری۔

حبیبہ! آپ کو لفظوں کو برتنے کا ہنر آتا ہے۔ موضوعات
بھی اچھے منتخب کرتی ہیں بس کہانیوں میں گہرائی کی کمی
محسوس ہوتی ہے۔ آپ کہانی لکھنے کے لیے موضوع کا
انتخاب کریں تو اس کا ہر پہلو سامنے آنا ضروری ہے۔ اس
کا فون خراب ہے۔ اگر آپ اپنا فون نمبر لکھ کر بھجوا دیں تو
ہم آپ کو فون کر لیں گے۔

ثروت بانو نے گو جرخان منجھوٹہ سے لکھا ہے
اس ماہ نمرود احمد کا ناول بہترین تھا جس نے پورا مہینہ
بہت انتظار کروایا۔ اس کے بعد بڑھتے ہیں ”دیوار شب“
کی طرف۔ عالیہ بخاری کا لکھنے کا انداز بہت متاثر کن ہے
عالیہ جی حقیقت سے قریب تر لکھتی ہیں اور ان کا دھیما

انداز بڑا ہی برا اثر ہے۔ آمنہ ریاض بھی اچھی راوی ہیں
لیکن ان کی کہانی کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں۔ آمنہ
زریں بہت خوب صورت الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں۔ ان
سے کوئی ناول وغیرہ بھی لکھوا میں ناں۔ اس کے علاوہ
شعاع کے تمام سلسلے زبردست ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان
نگہت سیما، بابا ملک، عنیزہ سید، درشن، مریم عزیز، فائزہ
افتخار، عمیرہ احمد، سعدیہ عزیز، آفریدی اور تنزیلہ ریاض
سب کدھر غائب ہیں انہیں ڈھونڈیں اور شعاع کے لیے
کچھ لکھوا میں تنزیلہ ریاض کا ”مرگ برگ“ ابھی تک یاد

ہے۔
بیاری ثروت! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ متعلقہ
مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے
پہنچائی جا رہی ہے۔ جن مصنفین کے نام آپ نے لکھے ہیں
ان کی تحریریں ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔ اور ہم بھی
چاہتے ہیں وہ شعاع کے لیے لکھیں۔ عنیزہ سید کا ناول
خواتین میں شروع کیا گیا ہے۔ عنیزہ سید کا ناول کتابی
شکل میں آچکا ہے۔

یعنی زاسید نے سرگودھا سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
شعاع کی عرصہ دراز سے خاموش قاری ہوں اور شاید
آگے بھی لا محدود مدت تک اسی سنگھاسن ریجی رہتی اگر جو
محترمہ سائرہ رضا کے افسانے ”پادشہ کی جوتی“ نے میرے
ذہن کو نہ جھنجھوڑا ہوتا۔ دراصل مجھے اس افسانے میں کچھ
باتوں پر اعتراضات ہیں اور کچھ پر میں سائرہ کو تنبیہ کرنا
چاہتی ہوں۔

سائرہ نے ایک جگہ اپنے افسانے کے ہیرو کی خوب
صورت شخصیت ظاہر کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اگر سب
اور چھری دی جائے تو انگلیاں کٹ سکتی ہیں۔ بیاری سائرہ
یہ واقعہ جس کی طرف آپ اشارہ کر رہی ہیں وہ ایک جلیل
القدر نبی سے وابستہ ہے۔ پلیز سوچ سمجھ کر واقعات سے
مماثلت دیا کریں۔

ایک اور جگہ سائرہ نے دجیسہ پیرزادہ نامی کردار سے کچھ
ڈائیلاگ کہلوائے جس میں وہ ملتان میں مٹی کھانے سے
متعلق کہہ رہی ہے کہ میں اپنے معیار سے نیچے کی چیز کس
طرح کھا سکتی تھی۔ میری بیاری بہن ان الفاظ سے لگتا ہے
کہ جیسے دوران حمل ملتان میں مٹی کھانا تو ٹھیک ہے مگر آپ کے

کردار نے اپنے اسٹیش کے زعم میں نہیں کھائی۔ اگر
آپ اس بات کو اس طرح لکھ دیتیں کہ ملتان میں مٹی اور
دوسری چیزوں مثلاً ”چھالیہ وغیرہ کا دوران حمل اور عام
دنوں میں بھی کھانا خون میں کمی کرتا ہے اور کھانے والا
ایسٹیک ہو جاتا ہے تو بہت سی بہنوں کو بھی ایک اچھی بات
پتا چلتی۔

اسی طرح ایک اور جگہ سائرہ نے لکھا ہے کہ میری ذکاوت
اپنے والد سے اپنی علاقائی زبان میں بہت احترام سے بات
کرتا ہے تو انسانی والد اور گھروالوں کو برا لگتا ہے۔
میری بہن کیا اپنی علاقائی یا مادری زبان بولنا اور والدین
سے احترام سے بات کرنا کوئی ناپسندیدہ بات ہے؟ اس کے
والدین اس کو ایک غلط فیصلے سے بچانے کے لیے کچھ مثبت
طریقہ بھی اختیار کر سکتے تھے جبکہ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے
مرتبے اور رتبے سے تفاخر کا شکار ہیں اور اسی لیے اسے میر
ذکاوت سے شادی کے لیے انکار کر رہے ہیں۔

اعتراضات تو اور بھی ہیں مگر تھوڑے لکھے کو بہت
جانیے۔ اس خط کے ذریعہ میں نے اپنی بات آپ تک
پہنچانے کی کوشش کی ہے اگر آپ کی یا سائرہ کی بول آزاری
ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

بیاری یعنی سائرہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں، آپ نے ان کا
غلط مقصود اخذ کیا ہے۔ بہر حال آپ کے اعتراضات ہم
سائرہ رضا تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کا جواب موصول ہوا تو
آئندہ ماہ شامل کریں گے۔ آپ کی نظم شامل اشاعت
ہے۔ غزل بھی جلد شائع ہو جائے گی۔

شمینہ اکرم نے کراچی سے لکھا ہے
اپریل کا شعاع ملا۔ سرویج پر سوچوں میں گم، اپنے
آپ سے بے خبر پروقاری ماڈل بہت اچھی لگی۔ خاص
طور پر اس کا ڈریس بہت پسند آیا۔ یہ ماڈل شاید انیتا ایوب
ہے۔ سرسری سی فہرست پر نظر ڈالی اور جھٹ سے عالیہ
بخاری کا دیوار شب نظروں کے سامنے آگیا۔ میری دلچسپی
اس ناول میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کی
ساری اقساط اکٹھی ہی پڑھ لوں۔ سب سے زیادہ مجھے معاذ
اور سالار کا کردار اچھا لگتا ہے۔

کہانی اپنے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ ”ستارہ
شام“ اپنی ست روئی کے باعث مجھے اتنا خاص پسند نہیں

ہے ”خط آپ کے“ ہمیشہ ہی سے میری توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ کیونکہ باصلاحیت رائٹرز کی طرح ہماری قارئین بھی بہت ذہین ہیں۔ اس قدر جامع اور جاندار بھرے پڑھ کر جتنی خوشی جیسے ملتی ہے اس سے زیادہ خوشی ملک کے کوٹے کوٹے سے آئے ہوئے خطوط پڑھ کر ہوتی ہے۔ بعض مقامات کا تو ہم نے نام تک نہیں سنا ہوتا اور خواتین ڈائجسٹ اور شعاع وہاں نہ صرف پڑھا جاتا ہے بلکہ پسند بھی کیا جاتا ہے۔

اب کچھ بات ہو جائے نمرو احمد کے ناول ”جنت کے پتے“ کی۔ نمرو احمد کے ناول انفرادیت کے لحاظ سے سب سے منفرد ہوتے ہیں جبکہ ان کے ناول کے نام بھی بہت مختلف، منفرد اور قدر ہٹ کر ہوتے ہیں۔ وسیع مطالعہ تحقیق اور ذخیرہ الفاظ کا خزانہ۔ نمرو احمد میں یہ تمام خوبیاں درجہ اتم موجود ہیں۔ باقی آئندہ پڑھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔ اتنی کم عمری میں اتنی کامیابی پر نمرو آپ کو بہت بہت مبارکبادیں۔ رشک حبیب کا ناول ”رفاقوں کے بندھن“ پڑھا۔ افسانہ سے ناول لکھنا ان کی ایک اچھی کوشش ہے ان کا یہ ناول سبق آموز بھی ہے۔ ”سنہری دھوپ“ صوفیہ امجد کی بلکی پھلکی اور سارہ محرر تھی۔ ”شاعری بچ بولتی ہے“ اور ”شعاع کے ساتھ“ دیکھ کر خوشی ہوئی اب پلیر انہیں بند مت کیجئے گا۔ ”تجدید وفاق“ سونیانویہ کی کہانی مجھے خاص پسند نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں کئی دفعہ کے پڑھے پرانے موضوع پر دوبارہ لکھا گیا ہے بلکہ کئی ایک پرانے موضوع کو ملا کر ایک نیا موڑ دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ قاتلہ رابعہ (مستا) عنیفہ بیگ (جو ہمیں چاہیے) سلمی فاروق اور فاطمہ عسکری نے بھی اچھی کوشش کی۔

پیاری شینہ! ہمیشہ کی طرح آپ کا تفضیلی بصر بہت اچھا لگا۔ ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ میں ضرور لکھیں۔

اسوہ مریم، اقصیٰ مریم سی اسٹریٹ کوئٹہ سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

کافی دن بیت گئے، کتنے ماہ و سال، شاید گزشتہ پانچ سال سے شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں۔ ہر بار ایک عجیب سا خوش کن احساس گہرے رکھتا ہے کہ میں ایک ایسے ادب کی قاری ہوں جو انمول نہیں بلکہ میرا اثاثہ ہے۔ نمرو احمد کو مصحف کے بعد جنت کے پتے پر ویل ڈن!

مستحسن کی گرفت ایک جگہ بھی ڈھیلی نہیں پڑی۔ ویری گڈ ”تجدید وفاق“ بھی زبردست تحریر ہے سونیانویہ ایک اچھا اضافہ ہیں۔ افسانے بھی خوب تھے۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں۔ آئی میری اور اسوہ کی فرمائش ہے کہ نند مصطفیٰ کا تفضیلی انٹرویو کریں۔

اسوہ اور اقصیٰ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ نند مصطفیٰ کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی فرمائش پر انہیں دوبارہ سلسلے میں ضرور شامل کریں گے۔

آپ کتابیں منگوانے کا طریقہ قیمت اور دیگر تفصیلات درج ذیل نمبر پر فون کر کے پتا کر لیں۔ 021-32216361

شمع مسکان جام پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے ”پہلی شعاع“ میں آپ ہمیں مختصر مگر جامع لفظوں میں جو آگاہی فراہم کرتی ہیں اور جو سبق اور نصیحت دیتی ہیں اس سے ہم خود کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں اس ماہ فیورٹ رائٹز نایاب جیلانی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور سب سے پہلے ”دل کی بات“ پڑھا۔ بہت خوب صورت انداز میں لکھا۔ شعاع کو سجانے سنوارنے میں ہماری دو رائٹرز ”آمنہ ریاض اور عالیہ بخاری“ کا بہت زیادہ ہاتھ ہے آج کل۔ ان کے ناول کی یہ اقساط بہت زبردست تھیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ صبا طارق سے کہنا کہ ”شاعری بچ بولتی ہے“ میں ہمیں ویسے تو سارا انتخاب ہی اچھا لگا مگر ”شکوہ“ بہت بہت پسند آیا۔

آپ میری پارنر قارئین نعیمہ باجی اور صبا جاوید سے میری سفارش کریں کہ وہ دونوں کتبوس بھی کبھی رسالہ خرید لیا کریں۔ کیونکہ کتنی میں ہوں اور پڑھنے کی جلدی انہیں ہوتی ہے۔

پیاری شمع! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اور معذرت کہ آپ کے پچھلے خط اور تحریریں شائع نہ ہو سکیں۔ نظموں غزلوں کے صفحات بہت محدود ہیں۔ اس لیے وہاں جگہ ملنا ناممکن ہی ہے۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔

گل ناز راشد نے گاؤں شنیہک سے لکھا ہے

اس ماہ کا شعاع بیسٹ ہے خاص طور پر نمرو احمد کا مکمل ناول ”جنت کے پتے“ میں شعاع کی پرانی قاری ہوں میں کیا میرے سب گھروالے۔ آپ کا رسالہ اتنا اچھا

ہے کہ اس کی تعریف لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی آپ کی میں نے ایک دو افسانے لکھے ہیں کیا وہ شائع ہو جائیں گے۔ گل ناز! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ افسانے بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

ذکیہ احمد جھنگ صدر سے لکھتی ہیں

اپریل کا شمار بہت ہی اچھا تھا۔ جتنی تعریف شائع کی جائے کم ہے جیسے ہی اپریل کا شمار ہاتھ آیا۔ جب لگائی جنت کے پتے پر نمرو احمد کیا کہنے آپ کے۔ بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ ”تجدید وفاق“ ہم سفر کی طرح چل رہا ہے ”ستارہ شام“ دنیا گول ہے یہ محاورہ تو سنائی ہو گا ”ستارہ شام“ بھی اسی طرح گول ہے۔ ایک ہی منظر پر آکر ٹھہر جاتا ہے پلیر آمنہ آئی ”ستارہ شام“ کو کچھ تیز کریں۔ افسانے میں ”فرار“ اچھا لگا۔

پیاری ذکیہ! آپ کے دس عدد خط ہمیں موصول نہیں ہوئے ورنہ جواب ضرور دیتے۔ افسانہ بلا عنوان موصول ہو چکا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں قابل اشاعت ہو تو ضرور شائع ہو گا۔

عائشہ نے ٹڈو محمد خان سے لکھا ہے

ٹائل بہت پارا تھا۔ گرمی کے موسم کی مناسبت سے سب سے پہلے عالیہ بخاری کا دیوار شب۔ اچھی قسط تھی۔ ستارہ شام میں صرف مادی کا ذکر تھا اس سے روٹی سے چل رہی ہے کہانی۔ نمرو احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

فاطمہ عسکری کا ”ذرا سنبھل کے“ بہت اچھا لگا۔ قاتلہ کا ممتاز زبردست تھا۔ سب تحریریں اچھی تھیں۔ سونیانویہ ”تجدید وفاق“ بہت اچھی جارہی ہے۔ امتل عزیز شہزاد کا فرار آج کے معاشرے کی عکاسی کر رہا ہے۔ ایک بات کہنی ہے صوفیہ امجد کے ناول سنہری دھوپ میں زیبا کا بھائی زیبا کو حدیث سناتا ہے جسے سن کر وہ بیزاری سے کہتی ہے۔

”ایک تو سارے مبلغ ہمارے گھر میں ہی پیدا ہو گئے ہیں۔ زیبا کا بیزاری دیکھنا برا لگا۔ ویسے تو نایاب اچھا لکھتی ہیں مگر اس مرتبہ کچھ خاص نہیں لگا امن کی فاختہ جھگڑے کی فاختہ بنی ہوئی تھی ”دسک“ میں جمل اچھی تھی۔ ام ثناء کی نظم ”تبدیلی“ بہت زبردست لگی۔

میرے پاس بہت ساری کہانیاں ہیں لیکن مجھے کہانی لکھنا نہیں آتی کیا کروں۔

پیاری عائشہ! آپ لکھتی رہیں۔ خود بخود کہانی بن جائے گی ”سنہری دھوپ“ میں زیبا کا بیزاری کا اظہار وہ عمومی رویہ ہے جو ہمارے معاشرے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس ناول میں صوفیہ امجد نے اس رویے کی مذمت کی ہے۔ اسے جائز نہیں قرار دیا۔

شائستہ کرن نے چنیوٹ سے شرکت کی ہے ان کی فرمائش ہے۔ 94.60 FM کے ڈی جے عتیق الرحمان بھی کا انٹرویو جمع تصویر شائع کریں۔ شائستہ! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

آسیہ قادر کوئٹہ کینٹ سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے ٹائل بہت خوب صورت تھا اس ذرا بال لبے ہوتے تو بہت اچھا لگتا۔ سب سے پہلے دو ڈلگائی ”تجدید وفاق“ کی طرف سونیانویہ پلیر جویریہ کے ساتھ اور علم مت کیجئے گا۔ ”جنت کے پتے“ نمرو احمد صاحبہ کا بہت زبردست ناول ہے ”سنہری دھوپ“ اور ”رفاقوں کے بندھن“ بس نادرل تھے۔

افسانے سارے ہی اچھے تھے لیکن ”مستا“ ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت خوب تھے۔ آئی پلیر فرحت اشتیاق کا تو انٹرویو شائع کریں۔

پیاری آسیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

فرحت اشتیاق کا انٹرویو خواتین ڈائجسٹ کے اپریل کے شمارے میں شامل ہے۔

پاکیزہ مصباح تورین سمیعہ دعا ندا فاطمہ کنڑی تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع اور خواتین سے ہمارا پرانا گہرا اور دل کا رشتہ ہے ہم سات کزنز بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ خریدتی ایک ہے لیکن لڑتی سب ہیں۔ ہمارے گھروالے ہماری لڑائی

سے تنگ ہیں۔

محمد حاتم اور رسول کے واقعات پسند آئے "تجدید و فنا" اور "جنت کے پتے" زبردست جاری ہے اور دل کی بات میں عباس کا کردار پسند آیا ہمیں سب رائٹر پسند ہیں کسی ایک کی تعریف کرنا نا انصافی کی بات ہے۔ ہم بہت دور گاؤں میں رہتی ہیں خط بھیجنے میں دشواری ہوتی ہے خط اگر دیر سے پہنچے تو بھی ضرور شائع کیجئے گا۔

پلیز 105-FM کے ڈی جے عثمان حبیب اور خرم طفیلی کا انٹرویو تصویر کے ساتھ لیں۔

آپ ساتوں کمزور کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع پڑھتی ہیں بہت اچھی بات ہے لیکن لڑنا چھوڑ دیں کہ لڑنے اور لڑوانے کا کام ہمارے سیاست دان بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فاروق آباد سے بہت سینہ محمد عباس رحمانی نے لکھا ہے

میں اپنے والد محترم کو ہی اپنی شناخت بنانا چاہتی ہوں اور بہت زیادہ ان کا نام روشن کرنا چاہتی ہوں۔ میرا تعلق فاروق آباد سے ہے میں حافظ ہوں میں نے 4 ماہ 2 دن میں قرآن پاک حفظ کیا ہے۔ میں شعاع کی بے قاعدہ قاری ہوں لیکن اب میں باقاعدہ ہو گئی ہوں آج تک میرے پسندیدہ ناول جو میں بار بار پڑھتی ہوں اور کبھی بھول نہیں سکتی وہ میرا نیا سویرا کوئی دھپک ہو ہے اللہ تعالیٰ ہمارے رائٹرز کو اور ترقی دے آمین۔ آپ مہربانی کر کے اعصام الحق کا انٹرویو شائع کریں اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں میں بیٹیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیل سے شائع کر دیں۔

بنت عباس! صرف چار ماہ میں پورا قرآن پاک حفظ کرنا! آپ نے قرآن پاک حفظ کیا ہے یا ناظرہ پڑھا ہے؟ اگر حفظ کیا ہے تو واقعی آپ غیر معمولی قوت حافظہ کی مالک ہیں۔ ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے آمین۔

بیٹیوں کے حقوق کے بارے میں آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ روشن

خیال اور اعتدال پسند پاکستان کا عہد لگانے والوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ خواتین آج اس سے زیادہ مظالم کا شکار ہیں جو ان پر دور جمالت میں روا رکھے جاتے تھے۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اعصام الحق کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فضہ ملائکہ زبور اور لائبریری لاہور سے شریک محفل ہیں۔ لکھتی ہیں

ہمارے رنگوں سے سجا خوب صورت سرورق روح تک کو نمل کر گیا۔ موتیا کے سفید پھول واہ دل ان ہی میں انگ کر رہ گیا۔ "جنت کے پتے" نمروہ جی! آپ کے ناول کی ہیروئن بہت زیادہ خوب صورت ہے سوال یہ ہے کہ کیا محبت صرف خوب صورت لوگوں کی میراث ہے؟ میں نے آج تک اتنی خوب صورتی نہیں دیکھی ویسے آپ کی تحریر لاجواب ہے۔ عرصے تک نہ بھولی جانے والی۔ نایاب جیلانی کا ناول "دل کی بات" کا کیا کہنا۔ عباس کا کردار اپنے نام کی طرح ہی بہترین تھا بے شک غلط فہمی ایک ایسی دھمک ہے جو رشتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ "ستارہ شام" آمنہ جی! تحریر ابھی تک اچھی ہوئی ہے مگر انداز تحریر اس قدر شان دار ہے کہ توجہ کے سارے موتی سمیٹ لیتا ہے۔ راحت جیسے قافروں جیسے خدا کے لیے سادوں آنے سے پہلے کوئی تحریر لکھ ڈالیں کہ آپ دونوں کے بنا تو ساون بھی اودھورا ہے کہ جب آپ کی ہیروئن سرخ اینٹوں کے فرش والے صحن میں گھنے درخت کے سائے تلے پرات بھر کے آم کھاتی ہے اور وہ بھی گھر والوں سے چھپ کر تو ہم قاری نہیں بھی خود کو اس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ رفعت سراج بھٹری! سعید جی!

غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے اپنی جی! آپ خود ہر سال بھیکے بھیکے دسمبر میں ایک بیسٹ ناول اور ایک بیسٹ رائٹر منتخب کریں اور ہر سال ان کے لیے ایک صفحہ مخصوص کیا جائے جس میں ہم قاری نہیں اور ادارہ منتخب رائٹر کو اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کر سکے شازیہ چوہدری کو دل سے نہیں بھلا سکی خدا ان کو جنت میں جگہ دے آمین۔ پلیز عدنان بھائی کا انٹرویو شائع کریں۔ آپ کی آج مجھے نبیلہ ابرار جی کی تحریر "زور

زمانوں کا سویرا" بھیج سکتی ہیں؟ وہ کب شائع ہوئی تھی؟ فضہ ملائکہ زبور اور لائبریری لاہور! زور زمانوں کا سویرا کتابی شکل میں آچکی ہے۔ آپ 200 روپے مٹی آرڈر کر دیں۔ کتاب آپ کو پنجوا دی جائے گی۔ اپنا صحیح اور مکمل پتا ضرور تحریر کریں۔ ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کا پیغام ان مسطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ یہ تمام مصنفین ہمارے پرچے میں لکھیں۔

یہ خط مہر گل کا ہے۔ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں ہر روز کا تھکا دینے والا سفر آخر کار تین اپریل کو اختتام کو پہنچا اور وہ گھر آئی گیا روشن روشن چہرے والا دل خوش کر دینے والا۔

نمروہ جی! سارے خواب سراب ہوئے آنکھوں میں پہلے بے یقینی چمکی اور پھر اداسی کی دھول اڑنے لگی سپنوں کا خوب صورت تاج محل دھڑام سے گرا اور اس کی کرچیوں نے دل کو زخم زخم کر ڈالا وہ آج بھی اتنا ہی حسین تھا نمروہ کے "جنت کے پتے" اسے اور دیدہ زیب بنا رہے تھے پیارے نبی کی باتیں محمد و نعت اس کے چہرے کو تابناکی بخش رہے تھے تو نایاب سوینا صوفیہ اور رشک حبیب نے اسے سنوار کر اس کے ہر نقش کو دیدہ زیب بنا ڈالا تھا قانتہ عنیقہ امت العزیز فاطمہ اور سلمیٰ نے اس کے سنگھار میں اپنا حصہ بڑی خوبی سے ڈالا تھا وہ آج بھی ویسا ہی تھا دل کو چھو لینے والا نیند اڑا دینے والا ہمارا اپنا شعاع مگر اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے بے مہر اجنبیت اور بے گانگی کی وہی کمر تھی۔

آپ! امانہ ہر ماہ ہمارا خط چھاننا لازمی نہیں مگر اتنے مان کے ساتھ جو افسانہ بھیجا تھا اس کے متعلق بھی کچھ درج نہ تھا۔

کیا خطوط کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں ہم شامل نہیں ہو سکتے؟

"تجدید و فنا" اور "جنت کے پتے" ٹاپ آف دی لسٹ رہے

اس ماہ کے شمارے کی جان "مست" اور "دل کی بات" تھیں۔ فرار اور رفاقتوں کے بندھن ہمارے معاشرے کا کردار گمراہیاں جج ہیں۔

مہر! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا اور آپ اپنے افسانے کے متعلق نہ جان سکیں۔

نازیہ اسلم نے بھادل پور سے لکھا ہے

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں تو جناب آرزو تو اب ہوئی ختم کہ 9 سال سے شعاع کو خط لکھ رہے ہیں۔ 9 سال میں صرف 3 خط شائع ہوئے۔ شکوہ تو خیر نہیں ہے پر آرزو بھی نہیں ہے۔ اب صرف انتظار ہے کہ یہ خط ردی کی ٹوکری میں جانا ہے کہ شعیار میں۔ آ

پیاری نازیہ! آپ نے یہ تو لکھا کہ نو سال میں صرف تین خط شائع ہوئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ 9 سال میں آپ نے کتنے خط لکھے جو شائع نہیں ہوئے۔ پیاری بہن خطوط کا یہ سلسلہ ہم نے اپنی قاری بہنوں کے لیے شروع کیا ہے۔ اس میں آپ لوگوں کے خطوط ہی شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک دو خطوط شامل نہ ہو سکے ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ قارئین ہمیں متواتر خط لکھتی رہیں اور ہم شامل نہ کریں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جویریہ شریف لاہور سے شریک محفل ہیں

شعاع ہر بار ہی لاجواب ہوتا ہے۔ لیکن اس بار تو کمال ہی کر دیا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری تھی۔ سب سے پہلے ستارہ شام پڑھا۔ کہانی میں مسسینس برقرار ہے لیکن پلیر اس کے صفحات بڑھا دیں۔ باقی نمروہ احمد میری موٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ انہوں نے جتنا لکھا لاجواب لکھا۔ پلیز نمروہ احمد کا انٹرویو ان کی تصویر کے ساتھ شائع کر دیں۔

پیاری جویریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ نمروہ احمد کے انٹرویو کی فرمائش پوری کر سکتے ہیں لیکن تصویر کی اشاعت ممکن نہیں کیونکہ نمروہ احمد اس کی اجازت نہیں دیں گی۔

اقراء عبد الرشید نعیمہ عبد الغفور اور صوفیہ ناز نے کراچی سے شرکت کی ہے لکھا ہے

مالی

مُصنف: میکسیم گورکی

تبصر: آمنہ زریں

خو خول نے کہا تھا "بعض اوقات آگے بڑھنے کے لیے ہمیں خود اپنے خلاف جاننا پڑتا ہے۔ اپنے مقصد کے لیے جان دینا آسان ہے، لیکن کچھ اس سے بھی زیادہ قربانی دینی ہوتی ہے اس چیز کی جو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو اور ایسی قربانی دے کر ہم اس صداقت کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں جس کے لیے ہم لڑ رہے ہیں۔"

سامنے آنے والے ہر نئے کردار کو اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔ نوجوانی کی امنگوں کو جو ذاتی خوشی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے سلا دینا۔ ماں باپ، آسائش سے دست برداری اختیار کرنا۔ صحت، خوراک، قید، سفر کی صعوبتوں سے گزرنا۔ یہ سب ہی مرحلے ماوروطن اور اس کے بہتر مستقبل کی خاطر جدوجہد کرنے والے ہر انقلابی کو پیش آئے۔

سوفیا، نکولائی کی بہن۔ نو عمری سے تحریک میں شامل ہے اور بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو جانے کے بعد بھی اپنی توانائی اور جوش کو عظیم مقصد کے مصروف میں لاری ہے۔ وہ ایک نڈر خاتون ہے جو بھیجیں بدلنے، چھپنے اور اپنے جیل سے بھاگے ہوئے ساتھیوں کو چھپانے میں ماہر ہے۔ ماں اور سوفیا، رہین کے گاؤں میں پرچے پہنچانے کے لیے عازم سفر ہوئیں۔ رہین جو کسانوں میں بیداری مہم چلانے کا زوردار علمبردار ہے۔ سپاویل نے اس کے کہنے پر کسانوں کے لیے خصوصی پرچے تیار کروائے۔

بھیجیں بدلے ہوئے ماں اور سوفیا گاؤں پہنچ گئیں۔

ذاتی اغراض کی حد بندی میں زندگی کو گزار دینا۔ ہمیں زندگی کے بلند آہنگ سے کوسوں دوری پر پھینک دیتا ہے۔ وہ غرض ضرورت سے لے کر ہوس تک کا مرحلہ طے کر لے۔ یا پھر وہ شہرت کا بخار ہو۔ معیار زندگی بلند کرتے جانے کا مرض ہو۔ یا پھر اقتدار کی غلام گردشوں کو کیے گئے سجدے۔ خود سے شروع ہو کر خود پسندی تک رہ جانے والی سطحیت، ہمیں ہماری تخلیق کے اعلیٰ مقصد سے کبھی بھی ہاتھ ملانے نہیں دیتی۔

خواب دیکھنا امید کی بدولت ہے اور تعبیر پانے کے لیے جدوجہد عملی ثبوت۔ تعبیر کسی بھی کیوں نہ نکل آئے (جیسے 47ء کے خواب کی) لیکن کچھ حاصل کرنے کی لگن میں جتنا زندگی کو نئے پنکھ عطا کیے جاتے ہیں اور وہ آرزوؤں کے بلند آسمان میں پرواز کا لطف اٹھاتی ہے۔

جو ہر حال۔ ریت میں دیے ہوئے سر کی نسبت ایک بلند درجے کی زندگی کھلانے کا حق رکھتی ہے۔ تو چلے! ماں کی طرف جن کا نام "پلا گیا فلورنا" ہے۔ اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ کردار حقیقی ہیں۔ پاویل، ماں اور دیگر بھی۔ واقعات بھی حقائق پر مبنی ہیں۔

"پاویل و لاسوف اور اس کے ساتھیوں کو اپنی جماعت کا منشور بنانے اور جھنڈا لہرانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور محض پولیس ہی نہیں، باقاعدہ فوج مزدوروں کے اس جلوس کے استقبال کو موجود تھی۔ شہری ساتھیوں کو پاویل کا یہ پیغام پہلے ہی مل چکا تھا کہ گرفتاری کی صورت میں ماں کو شہر منتقل کر دیا جائے۔ سو، نکولائی ابوالزوج ماں کو اسے گھر لے آیا۔ جہاں وہ اپنے بیٹے کے شروع کئے گئے کام میں حصہ لینے کے لیے پر جوش تھی۔

"اگر ہمارے بچے ہمارے جگر کے ٹکڑے اپنے متعلق سوچے بغیر اپنی جانیں، اپنی آرزوئیں اور اپنی آزادی قربان کر سکتے ہیں تو مجھ سے ایک ماں سے کیا توقع نہیں کی جاسکتی؟" وہ چلا پڑی۔

چونکہ بے حد خوب صورت پیرائے میں بیان کی محنت تھی لہذا رسالے کی رونق بڑھا گئی۔ نایاب جیلانی جی! ہم آپ کے بھائی کے لیے بہت دعاؤں کرتے ہیں۔ تجدید و فائز اس دفعہ پہلے جیسی روائی نہیں تھی۔ رعنا بیگم جویریہ سے کچھ بھی جھوٹ بول دیتی ہیں اور وہ فوراً اس بات پر یقین کر کے چلی جاتی ہے جبکہ وہ جانتی بھی ہے کہ رعنا اس کی دشمن ہیں۔ جویریہ جیسی بڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی کا یہ رویہ عمل کردار نگاری کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ باقی کہانی کی بہت بے حد مہارت سے بنی گئی ہے۔ "رنگ حبیب" بے حد منفرد سا نام اور ان کا افسانہ اس سے بھی منفرد اور جدید سوچ کی عکاسی کرتا ہوا تھا۔

صوفیہ امجد کا ناولٹ بھی بے حد اچھا لگا۔ افسانوں میں فرار "ناپ آف دی لسٹ" تھا۔ اگرچہ اس موضوع پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس افسانے میں ایک نیا خیال پیش کیا گیا۔ عنیقہ محمد بیگ کی تحریروں کا معیار کم ہو گیا ہے لیکن اگر "رائٹر" سے قطع نظر دیکھا جائے تو پھر افسانہ ٹھیک تھا۔ باقی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ مجھے آٹھ نو ماہ ہو گئے ہیں افسانہ بھیجے ہوئے۔ پلیز اب تو بتا دیں کہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

فرخ! معذرت کے ساتھ آپ کے افسانوں میں براہ راست نصیحت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات پر لکھے گئے یہ افسانے سنڈے میگزینز کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ شعاع کے لیے آپ باقاعدہ کہانی ترتیب دے کر لکھیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔



ماہنامہ خواتین و انجسٹ اور ادارہ خواتین و انجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ہر جوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی لی دی جھٹیل۔ ڈراما، ڈرامائی تخیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

ہم آپ کا شعاع ہر ماہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی کہانیاں بڑی اچھی ہوتی ہیں۔ ہم پہلی بار کسی کو خط لکھ رہے ہیں اور ہم ایک نئی کہانی لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہانی بہت امیزنگ ہے جس کو قارئین میں پڑھ کر بہت متاثر ہوں گے، ہم میٹرک کی اسٹوڈنٹس ہیں اور ہمیں کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا بہت شوق ہے اور ہم پچھلے تین سال سے کہانیاں آپ کے شعاع رسالے سے پڑھ رہے ہیں۔ اپنے پیارے شہر کے نام ایک شعر پیش کرتی ہیں۔

اس کراچی میں جہاں طاقت ہے مال و زر کا نام ایک صاحب نے قفس رکھا ہے اپنے گھر کا نام اقراء نعیمہ اور صوفیہ! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو شعاع بہت پسند ہے اور آپ کہانی لکھنا چاہتی ہیں۔ یہ وضاحت نہیں کی کہ آپ تینوں مل کر ایک کہانی لکھیں گی یا الگ الگ کہانی لکھیں گی ہر حال آپ کا خط اور شعر پڑھنے کے بعد ہمارا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ کہانی لکھنے کے بجائے کہانیاں پڑھنے پر توجہ دیں۔ اچھی تحریریں پڑھیں پھر لکھیں۔

رحیمینہ تنویر نے جہلم سے لکھا ہے

میں اپنی کہانی آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے اس کا طریقہ نہیں بتا کہ کسے بھیجوں۔

رحیمینہ! آپ کہانی لکھ کر ایک لفافے میں ڈالیں لفافے پر ایڈریس لکھیں۔

ماہنامہ شعاع 37 - اردو بازار - کراچی اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھیجوا دیں۔

کہانی پر اپنا نام پتا لکھنا نہ بھولیں۔

فرخ فاطمہ اشرف نے حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ سے لکھا ہے

نمو احمد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ نایاب جیلانی اب اپنے مخصوص انداز فکر اور انداز بیان سے نمودار ہوتی ہیں مگر ان کی تحریروں میں دلچسپی کا عنصر کم نہیں ہوا۔ کہانی کا موضوع نیا نہیں تھا مگر

بیداری مہم کا مقصد صرف مزدوروں کو ان کی حالت زار کا اور اک فراہم کرنا نہیں تھا، بلکہ کمزوروں کو ان کی طاقت سے آگاہ کرنا اور اعتماد دلانا تھا کہ وہ اپنی حالت بدلنے پر قادر ہیں۔

ماں کی محبت بھری روح، سچائی اور معصومیت نے مل کر اسے باطنی روشنی عطا کی تھی۔ وہ جس کسی سے بھی ملتی۔ اس کا صحیح عکس پہچان لیتی اور اوپر پڑے ہوئے تکلف اور ضبط کے پردوں کے باوجود، تہہ میں چھپے دل کے جذباتوں تک رسائی حاصل کر لیتی۔ اسی لیے سب ہی کو دار اسے ماں ہی کہہ کر پکارتے اور اس کی معیت میں خوشی محسوس کرتے۔

ماں، کرداروں کا، صورت حال کا بالکل فطری انداز میں تجزیہ کرتی جو حقیقت سے قریب ہوتا اور نادل بھی چونکہ حقیقی واقعات اور کرداروں پر مشتمل ہے، اسی لیے فطری حسن لیے ہوئے ماں آج تک جادواں ہے۔

”وہ (سوفیا) ہمیشہ محنت کے تقدس کا ذکر کرتی لیکن اپنے پھوپھوں سے ماں پر کام کا بوجھ بڑھا دیتی۔ وہ آزادی کے متعلق بڑی زوردار باتیں کرتی لیکن ماں ہمیشہ یہ دیکھتی کہ وہ اپنے ضدی بن اور مسلسل بحث سے لوگوں کو سخت تکلیف پہنچایا کرتی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک مجموعہ اخلاقیات تھی۔“

”خونناک سے خونناک چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے بھی اس کے (گولائی) ہونٹوں پر یاس انگیز مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ مگر ساتھ ہی آنکھوں میں سخت اور سرد چمک بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ جب اس کی آنکھوں کی اس چمک کو دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ شخص کبھی کسی کو معاف نہیں کرے گا۔“

قلم کی جزئیات جو کمرے میں موجود چیزوں کے علاوہ انسانی تاثرات اور دل میں اٹھنے والے مختلف خیالوں کو لفظ اوڑھا دیتی ہیں، کی بدولت ہم قیافہ شناسی اور مشاہدے کی اہمیت سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں کہ کس طرح ایک خاموش جائزہ ہمیں بہت کچھ جان لینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

”ماں بڑھتا نہیں جانتی۔۔۔ سیکھنے کی تھوڑی بہت کوشش کے ساتھ ساتھ گولائی اسے تصویروں والی کتابیں لا کر دیتا ہے۔۔۔ ماں تصویروں میں آباد ایک نئے جہان کو دیکھ کر مبسوت رہ جاتی ہے۔ خوش ہوتی ہے اور اخذ کرتی ہے۔“

”یہ چیزیں خوب صورت نہیں ہیں کیا گولائی ایوانوچ؟ ہر طرف کتنی خوب صورتی بھری پڑی ہے۔ ہمارے پاس سے گزر جاتی ہے اور ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ہم پر تو سارے دروازے بند ہیں۔ ایسی چیزوں پر نظری نہیں جاتی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے۔ ان کے پاس نہ تو وقت ہے نہ خواہش، اگر یہ جان گئے ہوتے کہ زمین کتنی مالدار ہے اور کتنی عجیب و غریب چیزیں یہاں ہیں تو نہ جانے لوگوں کو کتنی مسرت حاصل ہوتی۔ سب چیزیں ہر شخص کے لیے اور ہر چیز سب کے لیے ہے۔“

جائے اندھلتے ہوئے ماں سوچتی کہ یہ لوگ کس قدر جوش و خروش سے محنت کشوں کی زندگی اور ان کے مقصد کے متعلق باتیں کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ انہیں صحیح راستہ دکھانے اور پست ہمتی سے نکالنے کے طریقوں کو اور کس طرح بہتر بنایا جائے۔

لیکن اکثر دیشتر اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو اکساتے اور اپنی گرم جوشی کو نمایاں کرتے ہیں، جیسے ان میں سے ہر شخص اپنے ساتھیوں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ دوسروں کے مقابلے میں حقیقت اس کو زیادہ عزیز اور اہم ہے۔ اس طرح تند و تیز بحث ٹھہر جاتی اور محسوس ہوتا کہ ہر شخص دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اونچا اچھلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں ایک پریشان کن افسردگی چھا جاتی۔“

”مناشانے سلائی سکول میں استانی کی نوکری کی۔۔۔ اور ماں نے لیس قیہ پہنچانے کے بہانے پرچوں کی ترسیل کا کام سنبھالا۔ وہ سفر کرتی۔۔۔ لوگوں سے ملتی اور خوش رہتی۔“

اس نے یہ بھی دیکھا کہ دھرتی پر کسی چیز کی کمی نہیں

ہے، لیکن زیادہ تر لوگ اس سے محروم ہیں اور افراط کی دنیا میں نیم فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شہر کے کلیساؤں میں چاندی سونا بھرا ہوا ہے، جن کی خدا کو کوئی ضرورت نہیں، لیکن گرجوں کے دروازوں پر فقیر سردی سے کانپ رہے ہیں اور معمولی سی بھیک کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔“

روح، جسم سے برتر مقام رکھتی ہے۔ مگر صورت نہیں رکھتی۔ اس کے مقام سے بے خبری، ہمیں، اکثر ہمارے مقام سے گرا دیتی ہے! دیکھئے! گولائی نے کیسی پیاری بات کی۔

”انسان کی ضرورتوں کی کوئی اتھاہ نہیں اور اس کی قوت لا انتہا ہے، لیکن ابھی دنیا اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے مالا مال کرنے میں ست رفتاری سے کام لے رہی ہے، کیونکہ ابھی جو شخص خود مختار ہونا چاہتا ہے، وہ علم کے بجائے روپیہ حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔“

”مجبور، جس کی خوش مزاجی موت سے چند لمحے پہلے تک بھی ماند نہیں پڑی جو حالات کی سختی، قید و بند کی صعوبتوں کا بہادری سے مقابلہ کرتا رہا، مگر صحت کی ابتر صورت حال نے اسے موت کی دہلیز پر پہنچا ہی دیا۔“

”ایک اچھے انسان کے لیے زندہ رہنا مشکل، لیکن مرجانا آسان ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میں کس طرح مروں گی؟“ اس نے سوچا۔

بگور کی تدفین ایک بڑے ہنگامے کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔“

”اگلی بار ماں کو دوبارہ گاؤں بھیجا گیا۔ اب کی بار ماں اکیلی تھی۔ سفر دور دراز کا اور خطرہ پہلے سے زیادہ۔“

وہاں پہنچتے ہی ماں کو دھچکا لگانے والا منظر تیار تھا۔ کسان رہین، پولیس کے نرسے میں، ہاتھ پاؤں بندھائے ہوئے، تشدد کا نشانہ بن رہا تھا، مگر چپ نہیں تھا۔

وہ سوٹ کیس یا کسی اور چیز کے بارے میں مرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے آنسو ٹھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

جیسے تیسے۔۔۔ ماں نے اپنی باطنی فراست سے کام لیتے ہوئے ایک کسان کے گھر رات ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔ وہاں کسانوں سے بات کرتے ہوئے جب اس نے ان لوگوں کا ذکر کیا، جو اسے دل و جان سے عزیز تھے تو اس نے اپنے الفاظ میں اپنی اس محبت کی ساری توانائی اور شدت سمودی، جو زندگی کے گونا گوں مصائب کی وجہ سے عمر کے اس پختہ دور میں اس کے دل میں پھلی پھولی تھی۔

قوت کا اجتماع اپنے اندر عظیم طاقت رکھتا ہے اور عوام کو اسی لیے طاقت کے اس شعور سے محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ بیداری مہم ہمیشہ لوگوں کو ان کے کچھ ہونے اور کر سکنے کا یقین دلانے کی مہم رہی ہے۔

گاؤں کے کامیاب سفر سے واپسی پر ماں روحانی طور پر خود کو توانا محسوس کر رہی تھی۔

شہر پہنچنے پر ماں نے ایک نئی مہم سر ہوتے ہوئے دیکھی۔ رہین کو جیل سے فرار کروانے کا منصوبہ تیار کیا گیا جو کہ کامیاب ہو گیا۔ امید و بیم کے درمیان پادیل کو بھی فرار ہونے کی پیش کش کی گئی جو حسب توقع اس نے رد کر دی۔

مقدمے کی سماعت، دراصل پادیل کے لیے اپنے نظریات کے پرچار اور کھلم کھلا اعلان کا اہم اور نادر موقع تھی۔

مقدمہ کی سماعت کا دن آن پہنچا اور ماں اپنے ڈوبتے ابھرتے دل کو تھامے پیشی پر پہنچ گئی۔

یاس و ناامیدی سے وہ اتنی مغلوب ہو چکی تھی کہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اسے توقع تھی کہ اس کے بیٹے اور اس پر الزام لگانے والوں کا غیر جانب داری اور ایمانداری کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ لوگ اس کے تمام خیالات اور کارگزاریوں کو گہری نظر سے دیکھیں گے اور جب انہیں سچائی نظر آجائے گی تو وہ لوگ واضح الفاظ میں اعلان کریں گے کہ یہ شخص بالکل سچ کہتا ہے۔“

وہی۔۔۔ ماں کی انہی سادگی! پادیل اور اس کے تمام ساتھیوں کو باری باری موقع



صلاحیت

حبہ علی نے کئی ڈراموں میں جاندار اداکاری کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، تاہم اس کے باوجود بھی حبہ وہ نام نہیں بنا سکیں جو اب تک بن جانا چاہیے تھا۔ حبہ خاصی باصلاحیت ہیں اور وہ فن اداکاری کا مستند نام قرار پاسکتی تھیں، اگر وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف اداکاری کے لیے وقف کرتیں تو یہ خیال ہے ان ہدایت کاروں کا کہ جنہوں نے اب تک حبہ کو کاسٹ کیا ہے۔

چند سال پہلے حبہ کو ایک ٹیلی فلم کے لیے کاسٹ کیا گیا۔ رول بہت اچھا تھا، سو حبہ کو بے حد پسند آیا۔ حبہ نے اسکرپٹ لے لیا اور شوٹنگ کے لیے تاربخیں

کہ چند ہی ساعتوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔! ”پولیس والے نے چھوٹے ہی ماں کو چور قرار دے دیا۔“

”جیل سے کتیا۔“ مارا گیا۔ گھونسے۔ تھپڑ۔

لیکن ماں نے اپنا کام وہیں کر دیا۔ جلدی جلدی پرچے لوگوں کے ہاتھوں میں تھمائے، باقی کو ہوا میں بکھیر دیا اور گالیوں کی بوچھاڑ میں بھی اپنی بات لوگوں سے کہہ دی۔

کسی نے اس کے سینے پر مارا اور وہ بچ پر گر پڑی، لیکن تکلیف پر قابو پا کر اس نے رہی سہی قوت سے چلا کر کہا۔

”لوگو! متحد ہو کر ایک مضبوط قوت بن جاؤ۔“

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل پر خوف کا تندو ہواں چھا گیا، لیکن جرات اور بے جگری کا شعلہ ایک بار پھر آب و تاب سے چمکا اور اس نے دھومیں کو نکال باہر کیا۔

”خون کا ساگر بھی صداقت کو ڈبو نہیں سکتا۔“ آخری منظر دراصل علامتی طور پر اس بات کا مظہر ہے کہ ماں اپنی کوشش میں کامیاب رہی اور اس کے پیغام کی بازگشت وسیع پیمانے پر پھلتی گئی۔ الفاظ کی قوت، جذبات کی حرارت اور مقصد سے وابستگی کے لطف کو محسوس کرنے کے لیے ”ماں سے“ ضرور ملے گا جن سے ہم نے جانا کہ سچائی کے راستے کو اختیار کرنے کے لیے عمر کی قید نہیں اور روح کی سچائی میں جاوداں زندگی کا راز پنہاں ہے۔

اجتماع کو قوت اور قوت کو اعتماد عطا کرنا کہ وہ کچھ کرنے کے قابل ہے، قوموں کی خوش قسمتی کا لمحہ ہوتا ہے۔

کیا ہم بھی یہ لمحہ محسوس کر پائیں گے؟ لیکن اس انتظار سے پہلے خود سے ایک سوال کیوں نہ کر لیں؟

کیا ہم ایک قوم ہی ہیں؟؟؟

ملا۔ سب نے جرات اور بہادری کے کچھ نہ کچھ لفظ کہے مگر پادیل نے راہ نما ہونے کی حیثیت سے سنجیدگی سے اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا۔

”وہ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ ہم زار کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری نظر میں مطلق العنان حکمرانی وہ واحد زنجیر نہیں ہے جس نے ہمارے ملک کو جکڑ رکھا ہے۔ یہ تو سب سے پہلی اور سب سے نزدیک کی زنجیر ہے جس سے عوام کو نجات دلانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔“

ہم انقلابی ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک کچھ لوگ صرف حکمرانی کرتے ہیں اور دوسرے صرف محنت کرتے ہیں۔ ہم اس سماج کے خلاف ہیں جس کے مفاد کو بچانے کا کہیں حکم دیا گیا ہے۔ تمہارے آقا اتنے طاقت ور نہیں جتنا کہ ان کا اپنا خیال ہے۔

عام لوگوں تک اپنے توانائی بخش الفاظ کی منتقلی کے بعد پادیل ساتھیوں سمیت مطمئن اور خوش نظر آیا۔ حتیٰ کہ جلاوطنی کی سزا (پہلے سے طے شدہ) سنا دی گئی۔ سائبیریا۔ جہاں نوجوان ذہنوں کو صعوبتوں سے بھری زندگی سے لڑنے اور گھماکل ہونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔

راتوں رات پادیل کی تقریر کاغذ پر منتقل کر دی گئی اور ماں رو میلا کے پاس ٹاپ کے لیے پہنچی۔

آج کے انقلاب تیز رفتار ابلاغ سے رونما ہوتے ہیں (مصر، تونس) اور ایک وہ زمانہ کہ ہاتھ سے لکھے پرچے خفیہ چھپائی سے خفیہ تقسیم۔

غراور کامیابی کے احساس سے دو چار ماں نے ہی اپنے بیٹے کی تقریر کی کاپیاں تقسیم کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

جبکہ وہ مسلسل کام کرنے کی وجہ سے پولیس کی نظروں میں آچکی تھی۔ گاڑی پکڑنے سے پہلے اسٹیشن پر ماں پکڑی گئی۔

آخری منظر کی سادگی اور معنویت بے مثل ہے۔

دے دیں۔ ہدایت کار نے مزید آرٹسٹ، لوکیشن اور دیگر انتظامات مکمل کر لیے۔ شوٹنگ سے دو دن قبل حبہ نے ہدایت کار کو فون کر کے معلوم کیا کہ کیا پہننا ہے۔ ریکارڈنگ والے دن سب لوگ پہنچ گئے، تاہم حبہ نہ آئیں۔ ہدایت کار نے فون کیا تو فون بند ملا۔ وہ سمجھے کہ کسی اور شوٹ پر ہوں گی، سو تھوڑی دیر بعد پھر کال کی۔ فون ہنوز بند تھا۔ یہاں تک کہ سارا دن گزر گیا، حبہ کا فون بند ہی ملا۔ رات ایک بجے اسٹنٹ سپر کا کال آئی۔ نجیف آواز میں کہنے لگیں۔

”جیسے شدید بخار ہے، میں کل شوٹ پر نہیں آسکوں گی۔“

اسٹنٹ نے کہا۔ ”آپ یہ بات صبح بتا دیتیں۔ ہم کال کرتے رہے، مگر آپ کا فون مستقل بند تھا۔“

اس پر حبہ نے شان بے نیازی سے فرمایا۔ ”ہاں! میں تو بے ہوش تھی۔ گھر والوں نے فون بند کر دیا تھا۔“ یہ کہہ کر حبہ نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔

ہدایت کار صاحب نے اگلے دن دوسری اداکارہ لے کر شوٹنگ کر لی۔ بعد میں انہیں دوسرے لوگوں سے پتا چلا کہ حبہ اکثر ایسے ”ڈرامے“ کرتی رہتی ہیں۔ (ان ڈراموں کا اسکرپٹ کون لکھتا ہے) ابھی حال ہی میں حبہ نے یہ ڈراما پھر دہرایا ہے۔ تاہم اس مرتبہ وہ شدید بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئی تھیں۔ (ہاں! ایک ہی اسکرپٹ پر کام کر کر کے اب تو سمجھ گئی ہوں گی نا۔)

تباہ۔

فلم ساز فیاض خان کو فلم انڈسٹری سے جڑے تھیں

یوں دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے پانچ سال بعد بیگم کی خواہش پر علی خان اپنے جنم بھوی کراچی واپس آ گئے ہیں۔ (یعنی لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

تاثیر یہ ہے کہ سارے کراچی کو لیاری کے بھتہ خوروں نے پر غمال بنا رکھا ہے مگر رازوانوں کا کہنا ہے کہ اصل بت تو من کے کالے ”سیاسی بازی گروں“ کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔
(ناور شاہ عادل۔ ایکسپریس نیوز)

صبح سے رات تک راگ لیاری کلیان سنانے کے لیے چھوٹے اسکرین پر اینکوز کے درمیان مقابلہ جاری ہے۔

(ایکسپریس نیوز)
بھارت میں صرف 50 گھروں میں ٹواٹلٹ کی سہولت موجود ہے جبکہ اس کے مقابلے میں 60 فیصد کے پاس موبائل فون دستیاب ہے۔

(ٹائم میگزین)
امریکا کی مدح میں خوں ریزی ہے۔
الحاد غلام سازی اور خوں ریزی۔

(اسلامک پارٹی نار تھ امریکا کے سربراہ مصطفیٰ)
کراچی میں چار پارٹیاں بھتہ وصول فرماتی ہیں اور یہ شہر قبضہ کی جنگ ہے۔

(چیف جسٹس)
امریکہ 160 کھرب ڈالر افغانستان اور عراق کے آتش کدوں میں پھونک چکا ہے۔ اور اپنی خوئے شراٹکیزی کے باعث 160 کھرب ڈالر گے بھاری قرضے تلے آچکا ہے تو میں اسے قدرت کی ایک سزا ہی خیال کرتا ہوں۔

(نقش خیال۔ عرفان صدیقی)
✽ ✽

”خدا کے لیے“ تھوڑا مسکرائیں۔
عالمگیر نے شعیب سے کہا۔ ”تم ٹینشن مت لو۔ میں انہیں ہنساتا ہوں۔ تم بس یہ مجھ پر تھوڑو۔“
عالمگیر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور مختلف طریقوں سے شکل بگاڑ کر اور بل بل کر انہیں ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر کار تھوڑی دیر میں بنجمن سسٹرز کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی گئی۔
عالمگیر کہتے ہیں کہ ”میں آج بھی جب وہ وقت یاد کرتا ہوں تو ہنس پڑتا ہوں۔“

(عالمگیری! آج بنیادی ضروریات سے محرومی کے احساس تلے دبے مظلوم و بے بس عوام بھی ہنسا مسکراتا بھول گئے ہیں۔ آپ کے پاس انہیں بھی ہنسانے کا کوئی طریقہ ہے کیا؟)

لوٹ کے بدھو

کہتے ہیں کہ مشرقی معاشرے میں مرد کو گھر کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا اسے جسم میں ”سر“ کی جگہ سمجھا گیا ہے۔ تاہم جب کسی سیانے سے دریافت کیا گیا کہ ”اگر شوہر ”سر“ ہے تو بیوی کیا ہے؟“ اس پر اس نے کہا کہ ”بیوی وہ گروں ہے جس کے زور پر وہ ”سر“ حرکت کرتا ہے۔“

ایک نجی ٹی وی سے نشر ہونے والے پروگرام ”نورستان“ کے میزبان علی خان صرف کمپیئرنگ ہی نہیں کرتے انہوں نے کئی بھارتی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ علی خان نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ وہ کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ تاہم پانچ سال کی عمر میں بھارت چلے گئے، پھر تعلیمی مراحل سے لے کر اب تک کی زندگی وہیں گزاری۔
(گویا گنگا لٹی بہہ گئی۔)

2004ء میں آنجہانی گلوکار جگجیوت سنگھ کے ساتھ ایک شو کرنے کراچی آئے تو ان کی ملاقات ”چاندنی“ سے ہوئی۔ وہ انہیں بے حد پسند آئیں اور

”آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی“
بعض لوگوں سے ان کی زندگی کے حالات و واقعات ان کی ہنسی چھین لیتے ہیں مگر جناب! کچھ لوگ عادتاً ہی ہنسنے مسکرانے سے دور ہوتے ہیں جیسے اپنی بنجمن سسٹرز۔

پی ٹی وی کے مقبول پروگرام ”سلور جوبلی“ سے شہرت پانے والی بنجمن سسٹرز کو آج کم لوگ ہی جانتے ہیں۔ عام زندگی کا تو بتائیں مگر گانا گاتے وقت یہ بہنیں ہلنے چلنے حتیٰ کہ مسکرانے تک سے گریز کرتی تھیں۔ خاص طور پر بیٹا اور نرسل۔ مقبول عام ملی نغمہ ”خیال رکھنا“ نرسل اور بیٹا کا وینائے موسیقی میں پہلا قدم تھا۔ یہ نغمہ معروف گلوکار عالمگیر نے گایا تھا اور ان دونوں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ تیسری بہن شبنم اس نغمے میں شامل نہیں تھیں۔ یہ نغمہ معروف ڈائریکٹر شعیب منصور نے تیار کیا تھا۔

”خیال رکھنا“ کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ اس نغمے میں شعیب منصور نے عالمگیر اور بنجمن سسٹرز کی ویڈیوز الگ الگ ریکارڈ کی تھیں۔ عالمگیری اپنی ریکارڈنگ کراچے تھے۔ بنجمن سسٹرز کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بالکل سپاٹ چہروں کے ساتھ گا رہی تھیں۔ شعیب انہیں تھوڑا ہنسنے مسکرانے کو کہہ رہے تھے مگر وہ سنجیدہ ہی تھیں۔ شعیب جھنجھلا گئے۔ (شعیب کو کہنا چاہیے تھا کہ میں ”بول“ رہا ہوں)



سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چلا ہے۔ معروف اداکارہ انجمن کی بطور ہیروئن پہلی فلم کے فلم سازی یہ فیاض خان تھے۔ ان کے دل میں فلمی صنعت کی زیوں حالی کا برنادر ہے۔ فیاض خان کا کہنا ہے کہ ”فلم انڈسٹری کو تباہ کرنے میں سید نور کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک صائمہ کی خاطر انہوں نے پوری انڈسٹری کو داؤ پر لگا دیا۔ یہی سید نور تھے جنہوں نے انڈسٹری کو کئی بڑے بڑے آرٹسٹوں کا تحفہ دیا لیکن جب سے انہوں نے اپنی فلموں میں صائمہ کو ہیروئن لیا شروع کیا ہے انہیں کوئی اور اداکارہ نظر ہی نہیں آتی۔“ (اے بے! یہ گلبہ نور خسانہ نور کی طرف سے آنا چاہیے تھا۔)

فیاض خان کا دعویٰ ہے کہ خود صائمہ بھی ان کے خیال سے متفق ہیں۔ (وجہ! آپ نے تو گھر میں ہی پھوٹ ڈلوادی۔) اس بیان سے قطع نظر فیاض خان کے صائمہ اور سید نور سے نہایت دوستانہ مراسم ہیں۔ فیاض خان نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ”میں ان دونوں کی شادی کے گواہوں میں بھی شامل تھا۔“ (اچھا!!!! تو وہ آپ ہیں بنجمنیں رخسانہ جی برسوں سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویسے فلمی صنعت کی تباہی میں اس طرح تو آپ کا بھی حصہ ہوا ناں جی!)

ہنسی
مرزا غالب نے کہا تھا۔

ہی ہو جاتا ہے۔ دنیے آپ جلدی ہی مجھے اسکرین پہ دیکھیں گی۔“

”اواکاری خدا او صلاحیت ہے یا سیکھنی پڑتی ہے؟“

”خدا او صلاحیت تو ہوتی ہے مگر سیکھنی بھی پڑتی ہے۔ ہر اچھی چیز کے لیے پالش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا ڈائریکٹر مل جائے تو بندہ پالش ہو ہی جاتا ہے۔“

”اس فیلڈ میں کس کو اپنا استاد مانتے ہو؟“

”میں اس فیلڈ میں آیا تو جس جس نے مجھ سے کام لیا ان سب سے میں نے سیکھا۔ قیصر خان نظامانی اور فضیلہ قیصر سے بہت کچھ سیکھا سید عاطف حسین بہت اچھے انسان ہیں ان سے بہت سیکھا۔ میں تو ہر ایک سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔ کیونکہ میری کہیں کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔“

”تم کیسے دریافت ہوئے؟“

”میں نے اپنے آپ کو دریافت کروایا ہے۔ بہت محنت کی ہے بہت جدوجہد کی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ جس کو ڈائریکٹر نے دیکھا اور آفر دے دی۔ بڑی مشکل سے اپنی پہچان بنائی ہے۔“

”گھر والوں نے ساتھ دیا؟“

”گھر والوں نے ایک حد تک تو ساتھ دیا۔ پھر یہی کہا کہ اتنا ذلیل ہونے سے بہتر ہے کہ کوئی ڈھنگ کا کام کر لو۔ ان کے نزدیک یہ ڈھنگ کا کام نہیں تھا۔ گھر والوں کی وجہ سے میں نے بینک میں جاب کر لی اور اس کام میں بھی چپکے چپکے لگا رہا۔ آخر اللہ نے کامیابی دے دی۔“

”اب تو زندگی بدل گئی ہے نا۔“

”جی اللہ کا شکر ہے کہ اب زندگی کافی بدل گئی ہے۔ اب گھر والے بھی خوش ہیں اور میں بھی۔ اب مجھے کافی کام ملنے لگا ہے۔ میں نے بینک کی جاب چھوڑ دی

ہے اور اب یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔“

”فضیلہ قیصر کے سیریل ”خواب آنکھیں“ خواہش چرے“ میں تمہارا ایک بہت ہی مختلف رول تھا کیا رسپانس ملا تھا؟“

”میں نے اس سیریل میں نگہیٹو رول کیا تھا اور اس رول کو کر کے مجھے احساس ہوا ہے کہ نیکی اور بدی کی لوگوں کو کتنی پہچان ہے اور لوگ کس طرح اس کو لیتے ہیں۔“

”مزید کیا ارادے ہیں؟“

”اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مزید ایسے رول کرنے چاہیں یا نہیں تو اداکار کو تو ہر طرح کے کردار کرنے چاہئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس لیے مجھے جو بھی اچھا کردار ملے گا۔ خواہ وہ نگہیٹو ہو یا پوزیٹو۔ میں ضرور قبول کروں گا۔“

”کون سی بات بعد میں تمہارے لیے پچھتاوے کا باعث بنتی ہے؟“

”میں ایک صاف گوانسان ہوں جو بات ہوتی ہے منہ پر کہہ دیتا ہوں۔ یہ نہیں سوچتا کہ سامنے والے کا دل برا ہو گا۔ مجھے اپنے غصے پر بھی کنٹرول نہیں ہے۔ بے شک بعد میں سوری کر لیتا ہوں مگر ایک دفعہ بولنے سے باز نہیں آتا اور بلاوجہ غصہ نہیں آتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“

”کون سے سیریل نے تمہیں پہچان دی؟“

”اے طائر لاہوتی، بہو رانی اور خواب آنکھیں خواہش چرے“ ایسے سیریلز ہیں جو بہت زیادہ پسند کیے گئے۔“

”چلو اجازت دو۔ نئی سیریل پہ نئی باتیں ہوں گی۔“

اظفر رحمان

”کیسے ہو۔۔۔؟“

”ارے آپ! آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی۔ بہت برسوں بعد آپ نے یاد کیا۔“

”میں تو یاد کر لیتی ہوں تم بھول جاتے ہو۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟“

”ابھی حال ہی میں ”میرے چارہ گر“ ختم ہوا ہے جس کی رائٹر آپ کے ہی ادارے کی تھیں۔ کلا جادو آن ایر ہے اور بھی دو تین ڈرامے انڈر پروڈکشن بھی ہیں اور آن ایر بھی ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سے مصروف رکھا ہوا ہے۔“

”تم نے بچپن لندن میں گزارا۔ ایڈورٹائزنگ میں لی ایس سی کی ڈگری حاصل کی، کچھ کام آرہی ہے یہ تعلیم؟“

”کیوں نہیں، تعلیم تو تعلیم ہے کہیں بھی کام آسکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس مضمون میں ڈگری حاصل کی ہو اسی میں جاب بھی کی جائے اور میں شوہر میں ہوں تو ایک لحاظ سے تو میڈیا سے تعلق ہے نامیرا“

”سارا دن کی کیا روٹین ہے تمہاری؟“

”روٹین کچھ یوں ہے کہ صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھتا ہوں اور نماز پڑھ کر سو جاتا ہوں پھر ایک آدھ گھنٹے کے بعد اٹھ کر ایک سرساز کے لیے جم جاتا ہوں واپس آ کر ناشتا کرتا ہوں شوٹ پہ چلا جاتا ہوں اور شوٹ سے واپس آنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں۔ کبھی جلدی فارغ ہو جاتا ہوں تو کبھی آدھی رات بھی ہو جاتی ہے۔“

”کیا اپنے آپ کو ڈراموں اور کمرشلز کے لیے محدود کر لیتا ہے کوئی فلم وغیرہ نہیں کرتی؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ مجھے تو خود بھی فلمیں دیکھنے اور فلم میں کام کرنے کا شوق ہے۔ مگر فی الحال اپنے آپ کو فلم کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اداکاری میں مزید پختگی آجائے تو پھر فلم میں کام کروں گا۔ ویسے مجھے سید نور صاحب نے آفر دی تھی۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔“

”آپ چار بھائی ہیں کسی اور کو بھی شوق ہوا اس فیلڈ میں آنے کا؟“

”میرے چھوٹے بھائی کا بہت دل چاہتا ہے اس فیلڈ میں آنے کا اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے مگر امی نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ تم اس فیلڈ میں نہیں آؤ

گے۔ کیوں منع کیا، کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”ایک آرٹسٹوں کے کردار عموماً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کچھ درائی لانا چاہتے ہو؟“

”میں تو ہر طرح کے کردار کرنا چاہتا ہوں اور کر بھی رہا ہوں۔ اگر کام میں درائی نہ ہو تو شاید میں کردار کو قبول بھی نہ کروں۔“

”ڈرامے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں؟“

”بالکل کرتے ہیں۔ وہی کہانیاں ٹیلی پے بنتی ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔“

”میرے چارہ گر“ تو آپ نے دیکھا ہی ہو گا۔ اس میں جو کچھ دکھایا گیا کیا وہ حقیقت نہیں ہے؟ جائیداد کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں یہی تو ہو رہا ہوتا ہے۔ حقداروں کے حق پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔“

”یعنی جو آج کل ڈرامے ہو رہے ہیں۔ وہ تمہارے خیال میں حقیقت کے قریب اور معیاری ہوتے ہیں؟“

”جی بالکل۔ حقیقت سے بہت قریب اور کافی حد تک معیاری بھی اب کافی اسپروڈمنٹ ہو گئی ہے ڈراموں میں۔ اب موضوعات بھی اچھے اور بولڈ ہوتے ہیں اور ڈائریکشن بھی کافی معیاری ہو گئی ہے۔“

”چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہو؟“

”عموماً گھر پر رہتا ہوں پسند کرتا ہوں۔ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے خاص طور پر امی ابو کے روم میں سکون ملتا ہے ان کے ساتھ وقت گزار کر گپ شپ مار کر اور فرمائش کر کے کچھ نہ کچھ ضرور پکوانا ہوں۔“

”آج کل ملک کے جو حالات ہیں اس کو دیکھ کر کبھی باہر سمٹل ہونے کا سوچا؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے لیکن اپنے ملک کو چھوڑ کر کہیں اور سمٹل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جس ملک نے مجھے عزت دولت اور شہرت دی اس ملک کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کبھی نہیں۔“

ہفت تصویر

عدالت علویہ

اصیغ بن نبالہ جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے سالار تھے بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے ایک فریادی کی ایسی دادرسی فرمائی کہ جو میں نے آج تک ایسا عجیب انصاف نہ دیکھا اور نہ میرے کانوں نے سنا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک دن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھا۔ آپ مسجد کوفہ میں داخل ہوئے وہاں دیکھا کہ ایک نوجوان نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر پڑی تو آگے بڑھ کر آپ کے قدم بوس ہوا۔ آپ نے اس سے گریہ و بکا کا سبب پوچھا۔ تو اس نے کہا۔

”کہ میں مسجد میں اس لیے آکر رو رہا ہوں کہ جب آپ مسجد میں تشریف لائیں تو میں قاضی شریح نے میرے دائرہ مقدمہ پر جو فیصلہ صادر کیا ہے۔ اس کے خلاف آپ کی خدمت میں اپیل پیش کروں کہ میری دادرسی فرمائی جائے۔“

حضرت نے فرمایا کہ ”تیرا کیا معاملہ ہے؟ اس کی تفصیل بیان کر۔“

اس نے عرض کیا۔

”یا امیر المومنین! میرا باپ کچھ لوگوں کے ساتھ سفر کو گیا۔ جب وہ لوگ سفر سے واپس آئے تو میرا باپ ان کے ساتھ واپس نہ لوٹا۔ جب میں نے ان سے پوچھا تو سب نے یہی جواب دیا کہ وہ سفر کے دوران فوت ہو گیا۔ پھر جب میں نے ان سے اپنے باپ کے مال کے

بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس نے کوئی مال پیچھے نہیں چھوڑا حالانکہ مجھے اس بات کا پورا علم ہے کہ میرے باپ کے پاس کافی سے زیادہ مال تھا۔ ان کے انکار کے بعد میں نے اپنی حق رسی کے لیے قاضی شریح کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کر دیا۔ انہوں نے ان لوگوں سے میرے باپ کے مال کے متعلق پوچھا۔ تو انہوں نے قاضی کو بھی وہی جواب دیا۔ اس کے بعد قاضی شریح نے ان کے اس بیان کی ان سے قسم لی۔ جو انہوں نے کھالی اور قاضی نے انہیں رہا کر دیا۔ مگر ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اپنے حق کے لیے اپیل کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔“

اس نوجوان کا بیان سن کر آپ نے فرمایا کہ۔

”میں اس مقدمہ کا وہ فیصلہ کروں گا جو آج سے پہلے سوائے حضرت وادو علیہ السلام کے کسی نے نہیں کیا ہوگا۔“ پھر قنبر سے فرمایا کہ چند آدمی پولیس کے میرے پاس بلا کر لے آؤ۔ جب وہ آگئے تو ان کو حکم دیا۔

اس کے باپ کے ساتھ جو سفر پر گئے تھے اس نوجوان سے پتا پوچھ کر ان کو میرے پاس لے آؤ جب وہ آگئے تو آپ نے ان پر ایک گہری نظر ڈال کر فرمایا کہ۔

”یہاں تمہیں یہ گمان ہے کہ میں تمہاری حرکتوں سے واقف نہیں ہوں اگر تم ایسا خیال کرتے ہو تو

سمجھو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پھر شرط (پولیس) والوں سے کہا کہ ان کو مسجد کے ستونوں سے الگ الگ باندھ دو۔ جب اس حکم پر عمل ہو گیا۔ تو جو لوگ مسجد میں جمع تھے۔ ان سے فرمایا جب میں نعرہ بکسیر بلند کروں تو تم لوگ بھی زور سے نعرہ لگانا۔

ساتھ ہی اپنے کاتب کو بلا کر فرمایا کہ یہ ملزمان جو جو بیان دیتے جائیں انہیں تحریر کرتے جاؤ۔ اس کے بعد حکم دیا ان ملزمان سے ایک ملزم کو میرے پیش کرو۔ جب وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ۔

”تم کس روز گھر سے باہر سفر کے لیے گئے تھے؟“

اس نے جواب دیا کہ فلاں روز۔

پھر آپ نے پوچھا۔

”تم کل کتنے آدمی تھے جب سفر پر روانہ ہوئے؟“

تمہارے سفر کا سال، مہینہ اور دن کیا تھے۔ تم گھر سے دن کے وقت نکلے تھے یا رات کو؟ اس نوجوان کا باپ کس منزل پر جا کر بیمار ہوا اس کی بیماری کیا تھی۔ وہ کتنے دن بیمار رہا اور بیماری کے دوران اسے کیا دوا دیتے رہے۔ اس کی تیمارداری کون کرتا رہا۔ وہ کس دن مر۔ اس کو غسل کس نے دیا اور کفن کس نے پہنایا۔ پھر کس نے اس کو قبر میں اتارا۔“

وہ آپ کے سوالات کے جواب کچھ نہ کچھ دیتا رہا۔ پھر جب سوال ختم گئے تو حضرت علی نے نعرہ بکسیر بلند کیا۔ جس پر تمام حاضرین مسجد نے نعرہ بکسیر بلند کیا۔ جب یہ نعرہ ان باقی ملزمان نے سنا تو وہ شک و شبہ میں پڑ گئے بلکہ ان میں سے بعض کو یقین ہو گیا کہ ان کے ساتھی نے اقبال جرم کر کے ان کے ساتھ غداری کی ہے اور صحیح حالات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ سوالات مذکورہ بالا کے پوچھنے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اس کو قید خانہ میں لے جا کر بند کرو۔

وہ چلا گیا تو آپ نے پولیس کے آدمیوں کو حکم دیا کہ

دوسرے آدمی کو لے آؤ۔ جب اس کو لایا گیا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ۔

”کیا تم مجھے بتاتے ہو کہ میں حقیقت واقعہ سے بے خبر ہوں اگر ایسا ہو تو میں بہت غافل اور نادان ہوں۔ اب بتانا کہ اس نوجوان کے باپ کی موت کی کیا وجہ ہوئی۔“

اس نے جواب دیا۔

”یا امیر المومنین! میں بھی ان لوگوں میں ہوں جو اس کے باپ کے ساتھ سفر پر گئے تھے ان میں ہمیں صرف میں ہی واحد شخص تھا۔ جو اس کے باپ کے قتل پر رضامند نہ تھا بلکہ مجھے ایسا کرنے سے نفرت بھی تھی۔“

گویا اس نے یہ اقرار کر لیا کہ اس نوجوان کے باپ کو قتل کیا گیا ہے پھر باقی ملزموں نے بھی ایک دوسرے کے بعد اس جرم کا اعتراف کر لیا۔ آخر میں آپ نے پہلے آدمی کو بلا کر اس کے ساتھیوں کا اقرار نامہ جو کاتب تحریر کرنا تھا اس کو دکھایا۔ اور اس نے بھی اس نوجوان کے باپ کے قتل کا اقبال جرم کر لیا۔ اس کارروائی کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس نوجوان کے باپ کا مال جس کے طمع میں اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے لڑکے کو واپس کر دیا اور اس کے قتل کی دیت بھی ان سب سے وصول کر کے مقتول کے بیٹے کو دلوادی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

آسیہ سلیم قریشی کے 3 دکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ خلیسی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو دیکھ آئی	450/- روپے
تموڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول نگہانے کے لئے نئی کتاب ڈاک خرچ -45/- روپے

مکھانے کا پتہ:

کتاب گھر ان ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

گلاس پانی میں گڑ ڈال کر خوب جوش دے لیں۔ شیرہ ٹھنڈا ہو جائے تو شلجم کے ٹکڑے ڈال کر آٹھ دن کے لیے چھوڑ دیں۔ اس دوران چیک کرتے رہیں۔ آٹھویں روز اچار استعمال کیا جاسکتا ہے۔

افغانی گوشت

اجزا :

گوشت	1 کلو
لسن اور ک پیٹ	2 کھانے کے چمچے
پیاز	1 پاؤ
ٹماٹر	1 پاؤ
آلو	1 پاؤ
مٹر	آدھی پیالی
گاجر	آدھی پیالی
ثابت و حنیا	2 کھانے کے چمچے
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہری مرچ	2 عدد
ہرا دھنیا	چند پتے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

بغیر بڑی کے گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیں۔ تیل گرم کر کے لسن اور ک پیٹ کا پیسٹ، سرخ مرچ اور ثابت و حنیا کوٹ کر ڈالیں اور گوشت کی بوٹیاں ڈال کر اس قدر پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے اور پانی نہ رہے۔ مٹر گاجر اور آلو ابال کر پیاز اور ٹماٹر کے ساتھ چوکور ٹکڑے کر کے پہلے انہیں الگ تیل میں اس طرح تل لیں کہ ٹماٹر بالکل گل نہ جائیں اور دیگر اشیا نرم پڑ جائیں۔ گوشت گلنے کے بعد یہ تلی ہوئی چیزیں گوشت میں ڈال دیں۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا اور کالی مرچ (ثابت بھی ڈال سکتی ہیں اور پیسی ہوئی بھی) ڈال کر ہلکی آنچ پر روغن آنے تک دم پر رہیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ دسترخوان پر سجائیں اور خوب دیا جائیں۔

حسب ذائقہ

ترکیب :

کیرنوں کو چھیل کر باریک کاٹ لیں اور اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں، پھر گھٹلیاں نکال کر باریک پیس لیں۔ ساتھ میں پودینہ بھی پیس لیں۔ بانی مسالوں کو صاف کر کے موٹا موٹا کوٹ لیں اور پیسے ہوئے آمیزے میں ملا کر چولہے پر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو چینی ملا کر مکس کریں اور اتار لیں۔ کسی بڑے برتن میں نکال کر محفوظ کر لیں۔ (مٹی کی ہانڈی میں رکھیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔) مزے دار چٹنی تیار ہے۔ احتیاط سے رکھیں تو پندرہ دن تک استعمال کی جا سکتی ہے۔

شلجم کا اچار

اجزا :

شلجم	1 کلو
اورنگ	آدھی چھٹانک
لسن	آدھی چھٹانک
کلو بجی	آدھی چھٹانک
مٹر	3 پاؤ
رائی	آدھی چھٹانک
سرخ پیسی مرچ	4 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

شلجم کو چھیل کر آٹھ ٹکڑے کر لیں اور اتنا ابال لیں کہ وہ گل جائیں مگر نرم ہو کر ٹوٹیں نہیں۔ خشک کرنے کے لیے کسی کپڑے پر پھیلا دیں۔ لسن کے علاوہ تمام مسالوں کو کوٹ کر شلجم کے ٹکڑوں پر مل دیں۔ ٹکڑوں کو مسالے سمیت مرتان میں ڈال دیں اور ساتھ ہی لسن کے ثابت جوے بھی ڈال دیں۔ مرتان کا منہ بند کر کے تین دن کے لیے دھوپ میں رکھ دیں۔ دن میں دو تین مرتبہ مرتان ہلا میں۔ دو



موم کے پیکان

خالدہ جیلانی

کر کے ایک بار پھر گرائنڈ کریں۔ جگ میں نکالنے کے بعد دار چینی کا ٹکڑا ڈال کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں پھر ریف کی کیوبز ڈال کر پیش کریں۔

کیری کی چٹنی

اجزا :

کیریاں	آدھا کلو
لسن	8 جوے
کلو بجی	2 کھانے کے چمچے
ثابت سرخ مرچ	10 عدد
پودینہ	آدھی گٹھی
زیرہ	1 کھانے کا چمچ
چینی	2 کھانے کے چمچے

کیری کا شربت

اجزا :

کچے آم	1 کلو
کالا نمک	1 چائے کا چمچ
چینی	3 پاؤ
دار چینی	1 چھوٹا ٹکڑا

ترکیب :

کچے آم یعنی نہ وہ کیری ہوں نہ بالکل پک چکے ہوں دھو کر ثابت ابال لیں۔ ٹھنڈے ہونے پر صاف ہاتھوں سے اس کے چھلکے اور گھٹلیاں نکال کر گودا خوب مسل لیں۔ گرائنڈر میں چینی اور کالا نمک کے ساتھ خوب باریک گرائنڈ کر لیں۔ چار گلاس بانی شامل

تھوڑا سا کالا نمک، ایک گلاس عرق ملا کر منہ دھو لیں۔ چھان کر لیں۔ آرام آجائے گا۔
☆ خربوزے کا چھلکا اور بیسن برابر مقدار میں لے کر باریک پس لیں۔ تھوڑی سی دہی میں ملا کر چرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے چرے کے داغ، وجبے، کیل اور مہاسے ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ خربوزے کے چھلے ہوئے بیج چائے کا ایک چمچ لے کر دو عدد بادام کے ساتھ باریک پس لیں۔ چند قطرے لیموں کا رس اور پانچ چمچ بالائی والا دودھ شامل کر کے خوب اچھی طرح ملا لیں۔ چرے پر لگالیں۔ بیس منٹ تک لگا رہنے دیں، پھر ٹھنڈے پانی میں روئی بھگو کر اس سے چہرہ صاف کر لیں۔ یہ جلد کے لیے بہترین ماسک ہے۔

☆ تقریباً "سو گرام خربوزے کا گودا لے کر اس میں چائے کا ایک چمچ شہد اور کھانے کے دو چمچے خشک دودھ شامل کر لیں۔ اچھی طرح ملا کر چرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد نیم گرم پانی سے منہ دھولیں۔ یہ ماسک خشک جلد کے لیے اکیسر ہے۔ یہ جلد کو نمی فراہم کر کے اسے تروتازہ کرتا ہے۔ اگر آپ کی جلد چکنی یا نارمل ہے تو اس ماسک میں خشک دودھ شامل نہ کریں۔

☆ اگر آپ کے چرے پر داغ، وجبے ہیں یا جلد دھوپ سے سنو لا گئی ہے تو خربوزے کا تھوڑا سا گودا مسل کر چرے پر لگالیں۔ بلکہ ہاتھوں سے چند منٹ تک ملیں، پھر خشک ہونے دیں۔ بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ یہ عمل نہایت سادہ ہے۔ آپ روزانہ بھی کر سکتی ہیں۔ چند ہی دنوں میں جلد پھول کی طرح کھل اٹھے گی۔

☆ خربوزے کا گودا اور کھیرا، ہم وزن لے لیں۔ ایلوور کا عرق اور سبز چائے کی پتیاں تھوڑی مقدار میں شامل کر کے اچھی طرح پس لیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر ملیں اور پانچ منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ جلد صاف ستھری اور نرم ملائم ہو جائے گی۔



ادارہ خوبصورتی

خوبصورت اور تروتازہ جلد چرے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ بلکہ جلد چمکتی دھکتی ہو تو چرے کے نقوش پر توجہ کم ہی جاتی ہے۔ جلد کی دیکھ بھال مصنوعی اجزاء پر مشتمل کیموں کے بجائے اگر قدرتی اجزاء سے کی جائے تو اس کے نتائج خاصے حیران کن ہوتے ہیں۔ قدرت نے تمام موسمی پھلوں کو ایسے خواص عطا کیے ہیں جو انسانی جلد کو موسم کے مضر اثرات سے حیرت انگیز طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔

خربوزہ موسم گرما کا خاص تحفہ ہے۔ یہ جسم کو مضبوط کر کے گرمی کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس میں کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس، نشاستہ، وٹامنز اور لی موجود ہوتے ہیں۔ گردے کی تکلیف اور قبض میں خربوزہ کھانا بے حد مفید ہے۔
☆ گردے کا درد ہو تو بارہ گرام خربوزے کا چھلکا،